



سین لائبریری

DR. ZAKIR HUSAIN

JAMIA MILLIA ISL
JAMIA NAGA

NEW DEL

Please examine the book be
it out. You will be resp
damages to the book disco
returning it.



Ra. Le
210.
168 JF

DUE DATE

Rece

Cl. No. 810-5

Acc. No. 82465

16876

Late Fine Ordinary books 25p. per day, Text Book
Re 1 per day, Over night book Re 1 per day.

- 9 MAR 19

~~23 OCT 1944~~

آج کا نام



ابوالکلام نمبر

اگست ۱۹۵۸ء
شراون - بھاوون شک سمیت

ایک روپیہ



ابوالکلام نمبر کے لئے



وزیر اعظم کا پیغام

82465

اس سال کے شروع میں مولانا ابوالکلام آزاد کی وفات سے ہندوستان میں ہی

نہیں بلکہ بہت سے دوسرے ملکوں میں بھی لوگوں کے دل دو مانع پر شدید اثر ہوا ہے۔ اس

کی تھوڑی سی جھلک اس دن دہلی میں نظر آئی جب کہ دہلی کے لوگ لاکھوں کی تعداد میں مولانا کو اپنا آخری نذرانہ عقیدت پیش کرنے کے لئے جمع ہوئے تھے۔

ہم جب بعض چیزوں کے عادی ہو جاتے ہیں تو یہ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ وہ ہمیشہ رہیں گی۔ اسی طرح اپنے ساتھیوں کے بارے میں بھی ہمیں کچھ

ایسا ہی گمان ہو جاتا ہے لیکن جب کوئی ایسا شخص اچانک اس دنیا سے اٹھ جاتا ہے تو ہم محسوس کرتے ہیں کہ اس کی زندگی اور اس کی موت ہمارے لئے کیا

معنی رکھتی ہے۔ مولانا آزاد ان لوگوں میں سے تھے جن کی شخصیت کی نشوونما قومی تحریک کے ساتھ ساتھ نصف صدی سے زیادہ مدت میں ہوئی۔ انہوں نے

قومی تحریک کے مختلف دور دیکھے اور ان میں حصہ لیا۔ وہ اس کی جدوجہد اس کی کامیابیوں اور ناکامیوں اور اس کے منہائے مقصد کی تکمیل میں شریک

رہے۔ وہ اس تحریک کا ایک اہم جزو تھے اور انہوں نے بڑی حد تک اس کی تشکیل کی۔ پھر بھی وہ ایک جید عالم اور انفرادیت پسند رہے۔ بلکیوں بھنا

چاہیے کہ وہ ہندوستانی عوام کے انہوہ کنٹر میں یکروہنا حیثیت کے مالک رہے۔ اس طویل مدت میں انہوں نے قومی تحریک کی جو رہنمائی کی صرف اسی کی وجہ

سے انہیں ہماری قومی تاریخ میں ایک بلند اور پائندہ مقام حاصل رہے گا۔

اس کے علاوہ ان کی ذات غیر معمولی عظمت اور حیرت افراذانت کی حامل تھی جس پر کبھی جذبات یا تعصب کا غلبہ نہیں ہونے پاتا تھا۔ سب

سے بڑھ کر بات یہ ہے کہ ان کی شخصیت ایک ایسا آئینہ تھی جس میں ہندوستان کی اس گونا گوں تہذیب کا عکس پایا جاتا تھا جسے بہت سے بے پردہ

وہ عاروں نے متاثر اور مالا مال کیا ہے۔

بعض اعتبار سے ان کی طرز فکر بنیادی طور پر جدید تھی اور بعض دوسری باتوں میں ان کا ماضی سے بڑا گہرا رشتہ تھا۔ اور وہ اس دور کے

شہور کا ایک عکس تھے جسے روشن خیالی کا ذور کہا جاتا ہے مجموعی طور پر وہ ایک ایسے غیر معمولی فرد تھے جنہوں نے اس مقصد کو جس کے لئے وہ عمر بھر کوشاں

رہے ایک امتیازی شان بخشی اور وہ بھی کچھ اس ڈھنگ سے جس کی کوئی ہمسر نہیں کر سکتا۔ پرانا نظام بدلتا ہے اور ہم اسے واپس نہیں لے سکتے

لیکن ہم اس سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ اسی طرح ہم مولانا آزاد کی یادوں میں تازہ کرنے ہوئے ان کی زندگی اور ان کی تعلیمات سے ایک بڑا

سبق سیکھ سکتے ہیں۔

جواہر لال نہرو
آرٹھ و سماجی منظر نامہ
۱۹۵۸ء

۵۷۵

نئی دہلی
۵ جون ۱۹۵۸ء

محمد کا مقبول عوام معنوی رہنما

آج کل دہلی

(سال نامہ)
ابوالکلام نمبر

مجلس ادارت

محمد مجیب
محمد علی دہلوی لکھنؤ
گوبی ناتھ من
خواجہ احمد فاروقی
زمانہ دہلی
ایس ایم سن رائڈ امرتسر
بی ایس ایس لاہور
جی نکتہ دہلی
پال کنڈر عرش ایڈیٹر شری
(دعوت رسول)

اسٹنٹ ایڈیٹر منظر شاہ

سرور ۱۔ مولانا ابوالکلام آزاد ج کی روحانی تصویر
ڈاکٹر ناتھ ناتھ ساری مرحوم کے ذخیرہ تصاویر سے۔ یہ شکر یہ ہم ذہن انصاری

اگست ۱۹۵۸ء

جلد ۱۴ نمبر ۱
مشران جہادوں شک سہ ۱۸۸
ہندوستان میں ۱۔ چھوٹے
پاکستان میں ۱۔ چھوٹے
وشنگٹن یا ایک شمار
ہندوستان میں ۱۔ چھوٹے
پاکستان میں ۱۔ چھوٹے

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ

پال کنڈر عرش ملیانی ایڈیٹر "آج کل" اردو اولڈ سیکرٹریٹ دہلی
مرتبہ و شائع کردہ
ڈاکٹر پبلیکیشنز ڈویژن دہلی انڈیا پریس کونسل حکومت ہند
پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ دہلی



تقریب

۲	ادارہ	تعارف
۳	ادارہ	ملاحظات
۴	ڈاکٹر سید محمود - غوثی غلام محمد	انجمن عقیدت
۵	حافظ محمد ابراہیم - مسرانا آصف علی	قیامیہ اقبال ابوالکلام آزاد
۶	امدی القادری	مزدورس گمشدہ
۷	فضا بن فیضی	قلمی تاریخ برذات مولانا آزاد
۸	ذہنی تنگدلی	ابوالکلام آزاد - ایک ہمہ گیر شخصیت
۹	ڈاکٹر ذاکر حسین	جہاد فتنہ شخصیت
۱۰	ہمایوں کبیر	قلمی تاریخ بایں وفات آزاد
۱۱	منظور علی تنہا فاروقی جہنزی	مولانا آزاد کی صوفی عظمت
۱۲	نیاز فیتوری	ماہ آزاد
۱۳	جیل مندری	مولانا آزاد کے نام کچھ خط اور ان کے جواب
۱۴	محمد گل خاں	مولانا ابوالکلام آزاد
۱۵	خواجہ غلام السیدی	قلمی تاریخ وفات مولانا آزاد
۱۶	سرکار حسین رضوی خیر گھنوی	ابوالکلام بر حثیت انشا پرہاز
۱۷	ظفر حسین خاں	مولانا ابوالکلام آزاد (قلم)
۱۸	بہمن سعیدی	مذکورہ
۱۹	محمد مجیب	مولانا آزاد و غبارِ خطر کے آئینے میں
۲۰	گوبی ناتھ من گھنوی	مولانا آزاد و غبارِ خطر میں
۲۱	عبدالرزاق علی آبادی	مولانا آزاد کا ایک خط
۲۲	پیشی اعظمی	آہ! مولانا ابوالکلام آزاد
۲۳	غلام زہری ہر	مولانا ابوالکلام آزاد - ایک نامور روحانی شخصیت
۲۴	رومی اللہ آبادی	قلمی تاریخ وفات امام اہلسنہ
۲۵	سید احمد اکبر آبادی	ترجمان القدر
۲۶	روشن صدیقی	امام اہلسنہ کی یاد میں
۲۷	حافظ علی بہادر خاں	مولانا آزاد کے فکر و نظریہ چھ جلدیں
۲۸	سہیم کرمانی	خبر حیات
۲۹	محمد یونس خاندی	امام اہلسنہ مولانا آزاد - سفر اور مقصد سفر
۳۰	خواجہ احمد فاروقی	مرد آزاد
۳۱	احمد صاحبی	تیرے بعد
۳۲	ریاض الرحمن شردانی	مولانا آزاد کی شخصیت
۳۳	حمید سلطان	مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت
۳۴	غلام احمد فرقت کاکردی	ذہنیات
۳۵		ذہنیات آزاد میں طنز و مزاح

تعارف

مولانا آزاد مرحوم کے سوانح رفیق کار، مشہور قومی رہنما، ممبر پارلیمنٹ
پرائم منسٹر ریاست جموں و کشمیر۔
وزیر آبپاشی و بجلی، حکومت ہند
مشہور قومی لیسنڈر اور دہلی کارپوریشن کے میئر
استاذ ادبیات عربی و اردو نظام کالج، حیدرآباد
علامہ اقبال انجمن شاعر۔ (مؤلفہ جمن۔ یونی)
جنوبی ہند کے بہت مشرق شاعر
صاحب فکر و نظر، مشہور ماہر تعلیم، بہار کے گورنر
وزیر مسائنسی تحقیقات و امور ثقافت حکومت جہ مولانا آزاد سے آپ کا قریبی تعلق رہا
بھونو راجہ، کے ایک پرہیز شاعر
مشہور انشائیہ دان، مدیر لٹریچر کونسل
کالمی فن اور مجلس شاعر۔ چند کالج دہلی،
مولانا آزاد مرحوم کے ممتاز حضور علمی و ادب کے شیدائی۔ نظمیں پر بھی آپ کی نگری نظر ہے۔
سیکرٹری وزارت تعلیم حکومت ہند ممتاز ماہر تعلیم۔
علمی ناسی لکھنؤ۔
فلسفی اور معنی، بنگلہ دہلی ۱۹۸۶-۱۹۸۵، جہانگیر لکھنؤ۔
زبانِ دہلی اور بچہ کا شاعر۔ فکر و فن میں ممتاز
وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ (دہلی) ماہر تعلیم اور تالیف دان، رکن ادارہ
شعبہ امور عامہ۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ (دہلی)
بہت مشرق ادیب و شاعر۔ دہلی پبلک ریلیشن کمیٹی کے چیئرمین۔ رکن ادارہ
مشہور صحافی، عربی زبان و ادب کے عالم۔ مولانا آزاد کے دیرینہ رفیق
دارالمصنفین، علم گزشتہ، مشرق اور خوش گفتار شاعر۔
ممتاز صحافی اور بہترین ادیب، مولانا آزاد کے قدیم دوست۔ ماہر قابلیت
حلیم انزکالج، جی ٹی کالج، کانپور
پرنسپل کلکتہ مدرسہ (کلکتہ) عربی اور فارسی کے فاضل، اسلامی علوم کے ماہر اور معنی
صاحب فکرم، بچہ کا شاعر۔ پروڈیوسر (اردو) آل انڈیا ریڈیو۔
ایڈیٹر ڈور جدید (دہلی) بہت مشرق صحافی۔ جدوجہد آزادی کے مخلص کارکن۔
کوچہ میرحاشی۔ دہلی۔ خوش مذاق اور فن گفتار شاعر
ابوالکلام اکادمی، عرب ناؤس، مولوی گنج لکھنؤ، مولانا آزاد کے پرانے ارادت مند اور ادیب
ریڈر (اردو) دہلی یونیورسٹی۔ صاحب فکر ادیب اور نقاد۔ رکن ادارہ
خوش فکر شاعر۔ ایڈیٹر "شاعر" فقرا ادب، ممبئی
حبیب منزل علی محمد۔ مولانا آزاد کے حبیب حبیب الرحمن شروانی مرحوم کے پوتے، نوجوان ادیب
مشہور ادیب۔ انجمن ترقی اردو دہلی کی جنرل سیکرٹری
مشہور مزاح نگار۔ مسلم اینگلو عربک ڈسٹرکٹ سکول۔ دہلی

۱۹۵۵ء

ڈاکٹر سید محمود
جناب بخش غلام محمد
جناب حافظ محمد ابراہیم
مستزاد آصف علی
جناب ہادی، نقاد
جناب نعمت ابن فیضی
حضرت ذائق بنگلہ دہلی
ڈاکٹر ذاکر میس
پروفیسر ہالیوں کبیر
جناب منظور علی قناری
مولانا نیاز فقیر
علامہ جمیل منہری
مولانا محمد اعلیٰ خاں
جناب خواجہ غلام السیدی
جناب سید سرور حسین رضوی غیر
جناب ظفر حسین خاں
جناب بسمل سیدی لکھنؤ
پروفیسر محمد مجیب
جناب محمد شیخ الرحمن
جناب گوپی ناتھ امن لکھنؤ
مولانا عبد الرزاق علی آبادی
جناب عینی اعلیٰ
مولانا غلام رسول ہر
جناب روحی آبادی
مولانا سید احمد اکبر آبادی
جناب روضہ صدیقی
جناب حافظ علی بہادر خاں
جناب شمیم کمرانی
جناب محمد یونس خلدی
ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی
جناب اعجاز صدیقی
جناب ریاض الرحمن شروانی
ممتاز حمید سلطان
جناب غلام احمد فرقت

آج کل دہلی دایہ کلام کبیر

Accession number
82465.
Date 12.10.1955
A.P.

ملاحظات

ہمارے ملک میں بڑے بڑے دریا ہیں اور یہ قدرت کا بہت بڑا عطیہ ہیں بشرطیکہ انہیں قابو میں کر کے ان کے پانی سے کام لیا جائے۔ چنانچہ ملک بھر میں جگہ جگہ ان دریاؤں پر بڑے بڑے بند بنائے جا رہے ہیں تاکہ ان کے پانی سے زمینوں کو گھزار بنایا جاسکے اور چلی پیدا کر کے کارخانوں کا جال بچھا دیا جائے۔ ان میں سے ایک بہت بڑا بند بھاکڑا بند ہے جہاں دریائے ستلج کو روک کر ایک بیرج بنایا گیا ہے۔ پانی کا یہ ذخیرہ ۶۶۴ مربع میل جمیل کی شکل میں ہے جو دنیا کی سب سے بڑی مصنوعی جمیل ہے جس سے ہر سال نکالی جائیگی۔ یہ کام بڑی تیزی سے ہو رہا ہے۔ چنانچہ یکم جولائی کو وزیر داخلہ پیٹنٹ گودوند لہر پٹنٹ کے ماتحت ستلج بیرج کے سرینڈیڈر کا افتتاح ہوا۔ اس فیڈلک مجموعی لمبائی ۶۹ میل ہوئی، جس سے پنجاب میں دس لاکھ ایکڑ اراضی اور دراجستان میں سات لاکھ ایکڑ اراضی کو سیراب کرنے میں مدد ملے گی۔

اباطلام نمبر ناظرین کے ہاتھوں میں ہے، اس شمارے کی ترتیب و تدوین میں بڑی محنت کی گئی ہے۔ ہماری کوشش یہی رہی ہے کہ یہ نمبر اس عظیم شخصیت کے شایان شان ہو۔ ہمیں بڑی خوشی ہے کہ نامور دانشور ادبوں اور مولانا آزاد کے رفیقوں نے ہماری بڑی ہمت افزائی کی اور مولانا کی شخصیت اور زندگی کے بارے میں قابل قدر مضامین شایع فرمائے۔ مولانا جس ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے اس کے تمام تر پہلوؤں کا ایک شمارے میں احاطہ نہیں کیا جاسکتا۔ پھر بھی زیر نظر مضامین مولانا کی زندگی، ان کی علمی، ادبی اور سیاسی خدمات اور افکار و خیالات کے بہت کچھ آئینہ دار ہیں۔ امید ہے کہ ناظرین اس نمبر کے بارے میں اپنی رائے سے ادھر کو مطلع فرمائیں گے۔

اس سال ہم نے سال نامہ کے علاوہ تین خصوصی نمبر نکالے۔ جن میں موضوعات مضامین ہی شامل کئے گئے اور دیگر مضامین جمع ہونے لگے۔ چنانچہ ہمارے پاس منظور شدہ مضامین کا ایک بڑا ذخیرہ جمع ہو گیا ہے جس میں مزید اضافہ کی گئی ہے۔ اس سے معنون نگار حضرات ابھی کچھ دنوں مضامین بھیجے کی زحمت نہ فرمائیں۔

بڑی بڑی طاقتوں کی باہمی کشمکش اور ایٹم و ہائیڈروجن بموں کی تیاری نے دنیا میں خوف و ہراس کی فضا پیدا کر دی ہے، اور ہر لمحہ ڈر لگا رہتا ہے کہ کہیں کوئی معمولی سا حادثہ عام گیر جنگ کا پہلا نہ بنی جاسکے۔ ایک طرف یہ صورت حال ہے اور دوسری طرف برقی قربات نے نسل انسانی کو زبردست خطرے میں ڈال دیا ہے۔ آج بھی ان کے جو مضر اثرات فضائے بسیط پر پڑ رہے ہیں وہ کچھ کم نہیں۔ اور آئندہ کے خطرات کا اندازہ متحدہ اقوام کی پندرہ قومی - سائنٹفک کمیٹی کی رپورٹ سے ہو سکتا ہے جس کے بعض اقتباسات غیر سرکاری طور پر شائع کر دئے گئے ہیں۔ اس میں بتلایا گیا ہے کہ اگر ایٹمی دھماکے ۱۹۵۸ء کے بعد جاری رہے تو ان کی وجہ سے ہر سال کوئی سو اسی لاکھ انسان ہلکے امراض میں مبتلا ہوتے رہیں گے اور انسان اراض کا اثر آئندہ نسلوں پر بھی پڑے گا۔ یہی نہیں بلکہ سہ ہزار دھماکوں کے اثرات آئندہ نسلوں پر پڑنے لگیں گے۔ اس رپورٹ سے ایٹمی دھماکوں کو روکنے کی ضرورت بالکل واضح ہو گئی ہے اور عام انسانی آبادی کی تعداد اور تحفظ کا تعاضا یہی ہے کہ ان تجربات کو فوراً بند کر دیا جائے۔ روس نے ان خود ایٹمی دھماکے روک دئے ہیں۔ امریکہ اور برطانیہ کا ارادہ ہے کہ پہلے اس امتناع کی پابندی کا انتظام کیا جائے۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے جنیوا میں مغربی اور کمیونسٹ ملکوں کے سائنس دانوں کی گفتگو شروع ہو گئی ہے کہ ایٹمی دھماکوں پر پابندی کی نگرانی کے ذرائع تلاش کئے جائیں۔ اگر یہیت صاف ہے تو ذرائع کی تلاش اور سمجھوتے کی صورت کچھ مشکل نہیں۔

بینا کی خانہ جنگی اور عراق کے حالیہ انقلاب کی وجہ مغربی ایشیا میں متحدہ حال اجتماعی ٹانگ ہو گئی ہے۔ اگرچہ اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل نے بینا کی باریں داخل طور پر شروع کر دی ہیں لیکن اس کا معاملہ اس اندیشی کے ساتھ ہے اور اسے وہیں دگوں کو سلجھانا ہے مگر صدر شومو نے قومی اطلاع کو غور سے کی اور امریکی فوجیں لبنان میں پہنچ گئی ہیں۔ دوسری طرف شاہ حسین کی درخواست پر برطانوی فوجیں اردن میں اتار دی گئیں۔ روس نے اس طرح فوجیں بھیجے کہ جارجا نہ کا لٹائی ہو رہی ہو مداخلت قرار دیا ہے اور اس کے خلاف احتجاج کیا ہے۔ ایٹمی مرحلہ علاقوں میں قومی تشکیلات شروع کر دی ہیں۔ ان حالات سے ظاہر ہے کہ عرب قومیت کا سیلاب بڑھتا جا رہا ہے تو اس میں صرف مداخلت نہ مغربی ایشیا کو میلان کا زار بنائے گی بلکہ عالمی سطح پر پڑ جائے گا۔

اظہار عقیدت

ڈاکٹر سید محمود ایم پی

معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ آپ ماہ نامہ آج کل کا انا دغیر نکال رہے ہیں۔
حقیقت یہ ہے کہ مولانا مرحوم کی ذات با صفات اور شخصیت بابرکت کا تذکرہ اب ہندی
قومی اور ملی زندگی کا اعلیٰ نامہ اور ہمیشہ رہے گا۔ اس سے بڑا پہلو اور بعد نگاہ
ہم کو ملے پائیں گے، روشنی حاصل کریں گے اور یقیناً آئندہ کی ہماری ہر نسل کو اس
سے سبق ملے گا، یہ کہنا مبالغہ نہیں کہ مولانا مرحوم ہمارے احساس و تائید میں ہمیشہ زندہ
رہیں گے اور تاقیامت بخدا ہمیشہ ہوتے رہیں گے اور ملکی آئندہ رہیں گے۔ ان
میں ان کی زندگی کے نقوش ہمیشہ ابھرتے رہیں گے۔ مولانا ہم سے جدا ہو چکے ہیں
اور ہم اس عرصہ حیات کی تھوڑی بہت تلافی بس اب اسی طرح کر سکتے ہیں کہ ان نقوش
کو مستعار تھے ہیں اور ہر پہلو و ہر حال خواہیں۔

مولانا کی موت سے پورے ملک و قوم نے جو کچھ کہہ دیا اُس کے احساس کی چہین
کے ساتھ فانی رنگ و صدمہ کی شدت نے شعور کو نڈھال کر دیا ہے ورنہ ان کی ذات
سے جو کچھ شہرت رہا اور باؤں سال تک جو ان سے نیاز خصوصی حاصل رہا۔ اس
کی ایک الگ فائسلی ترتیب کرنے کے لئے اگر فرصت لمحات مل بھی جائیں، کئی کتابوں
کے بچے چور سے کرنے کی ہمت بھی ہو جائے تو بھی مستعدی دل و دماغ کہاں سے
لاؤں گا؟ اس تمام عرصہ میں ان سے خلوت و جلوت میں جو ملاقاتیں رہیں اور
ان سے جو برکات و فوائد مجھے حاصل ہوئے ان کو کچھیرا ہی دل جانتا ہے۔ اپنی
واقفیت اور اپنے تجربے کی بنا پر بلا خوف و تردید یہ کہنے کی برأت کر سکتا ہوں کہ مولانا
مرحوم سبب فاضل، جلیل، ذہین، طیار اور اسلامی علوم پر گہری نظر رکھنے والا اس
وقت اسلامی دنیا میں کوئی دوسرا نہ تھا۔ اُنیسویں صدی اور بیسویں صدی نے

اسلامی دنیا میں دو بڑے مجاہد اور فاضل پیدا کئے، یعنی جمال الدین افغانی اور
مفتی عبدہ مولانا مرحوم ان دونوں کے چوڑے تھے۔ اس سے زیادہ ان کے متعلق
میں کیا کہوں۔

اب ان کے گزرنے کے بعد مجھے تنہائی کے لمحات ہیں شدت سے احساس
ہوتا ہے کہ احمد نگر جیل میں مولانا جو یہ شعر
کم لظم نصیم افروں ز شہد است
گوئی شہر پیشتر از باغ وجود م

گنگتیا کرتے تھے وہ حقیقتاً شہر نہیں بلکہ اپنی زندگی اپنی ہستی اور اپنی ہی بات کو
نہر لب دہراتے تھے۔ آنے والی تاریخ کا ایک لمحہ بھی اس سے منکر نہ ہو سکے گا۔
کہ مولانا ایک ایسے انسانی پیکر تھے جس میں ایک سمت علم و فکر کی ایک وسیع
دنیا آباد تھی تو دوسری سمت اخلاق و انسانیت کی وہ بلندیاں موجود تھیں جہاں وہ
تنہا تھے اور ان کا کوئی حریف نہ تھا۔

مجھے مولانا سے پہلی بار ۱۹۱۹ء کے انہی مہینوں میں علامہ عبداللہ عادی
جو عربی ادب کے فاضل اجل تھے کے ساتھ کھٹکویں ملاقات ہوئی تھی۔ میری عمر
اُس وقت سولہ سترہ سال کی تھی اور مولانا غالباً اُس وقت ۱۸ سال کے تھے۔ قبول
صدقت نہیں بلکہ نہایت حسین شکل تھی اور بچہ شاک کی ترائش خواش و ہر انداز سے
پیشی نقاست سے وہ بالکل انگریز کی کسی ذات کی جیسے جاگتے تھا بڑا سستہ مسلم
ہو رہے تھے۔ مجھے یاد ہے سب سے زیادہ ان کے طرز گفتگو نے مجھے متاثر کیا تھا
جو خطیبانہ مگر تیز و تھکا۔ معلوم ہوتا تھا کہ معلومات کا دنیا بھر رہا ہے۔ علامہ عادی
اور ان کے مددیان حماسہ انتہائی و غیرہ کے متعلق گفتگو ہوئی رہی ان کے حافظہ کا

کمال یہ تھا کہ پچیس سال بعد جب مسٹر فرنگی میں امداد فرمایا اور
حضرتوں کا آماجگاہ بنا تو انھوں نے اس پہلی ملاقات کے درمیان کی ساری گفتگو کا
موضوع اور تمام تفصیلات مجھ سے دہرائیں، کمال حیرت کہ صرف وہی ملاقات
نہیں بلکہ بعد کے بھی دوسرے ملاقات اور لمحات کی یادیں جو میرے ذہن سے
یکسر گھر چکی تھیں اُن کی ہمیشہ اس طرح یاد رہیں کہ جیسے سب کچھ کل کی بات ہو۔ اب
جیسے شہنشاہ کی بات کہ وہ مسلم ایجوکیشن کا فرنس کے سلسلے میں علی گڑھ آئے تو دیگر
حضرات کے ہمراہ میرے کمرے پر تشریف لائے۔ اس صحبت کی باتیں میں بھول
گیا تھا۔ لیکن ان کے حافظے نے وہ سب محفوظ رکھا تھا۔

فرن خطابت کے اس آچار کے بارے میں بہت کچھ دہرایا جا چکا ہے
لیکن میرے ذہن میں ہمیشہ وہی موقع اچھے اُبھرتے ہیں جہاں میں نے
انھیں اپنے الفاظ سے مجھ کے ذہن و حواس کو اتنی آسانی سے موڑتے دیکھا
کہ شاید کسی جادوگر سے بھی ممکن نہ ہوتا۔ دسمبر ۱۹۱۹ء میں جب کہ جنگ بلقانی کی
گرہا گری تھی۔ نکلے میں مسلم یونیورسٹی فاؤنڈیشن کمیٹی کا اجلاس ہوا۔ سوال پیش تھا
کہ مسلم یونیورسٹی گورنمنٹ کی شرائط پر منظور کی جائے کہ نہیں۔ اس وقت اہل
کی دھوم تھی اور جب مولانا آزاد قیصر بارے کی بارہ دہری میں آئے تو جلسہ میں
پردہ ڈھکی اور ہر طرف سے مولانا کی تقریر کے سلف تقاضا ہوا مگر جو لوگ حکومت
کے اشد سے پریونیورسٹی منظور کر لینا چاہتے تھے اُن کی خواہش نہ تھی کہ مولانا
آزاد تقریر کریں لیکن مولانا کو اسٹیج پر جگہ دینی ہی پڑی اور اُن کی تقریر نے اُن کی آن میں
ہوا کا ڈنڈہ بدل دیا۔ اور یہی واسطے پاس ہوئی کہ اُن شرائط پر یونیورسٹی منظور نہ
کی جائے۔ مولانا حق بات کہتے ہیں اس قدر۔ بے باک انداز تھے کہ انھوں نے کبھی
وقت و جگہ کی بندش تسلیم نہ کی۔ جنگ بلقان کے متعلق ایک پبلک جلسہ تھا جس کی
صدارت ذاب حامد علی خان صاحب مرحوم دلی رام پر فرما رہے تھے۔ جلسہ کا مقصد
تو لوگوں کے سلف چندہ جمع کرنا تھا۔ مولانا آزاد بھیجے ہی جلسہ میں تشریف لائے مجھے اہل
گرمیوں کے کمرے چلا اٹھا۔ انھوں نے اس موقع پر انگریزوں کے خلاف سخت تقریر کی
میں اسے ذاب صاحب دم بخود جلسہ کی صدارت کرتے دیکھے۔

میرے اور مولانا کے ذاتی تعلقات غلطی ہی سے بدلتے ہی بدلتے رہتے
ہو گئے اور میں جب کبھی کھڑکھاتا تو انھیں کے بیان قیام کرتا تھا۔ اُن کی عیند اور
خود غارت فطرت کو بار بار توجہ دیکھنے اور محسوس کرنے کا موقع ملتا رہا۔ انھوں
نے کبھی اپنی خود مادی کو محسوس نہیں کیا۔ ایسے مواقع بھی اُن کی زندگی میں آئے کہ انہیں

آج کل دہلی دارالکلام نہیں

مذمت آزمائشوں سے گزرتا پڑا لیکن دست سوالی کسی کسی کے سامنے نہ پھیلا یا اور
اپنے عزیز ترین دوستوں کو بھی خیر نہ ہونے دی۔ جب وہ دہلی میں تھے تو اُن کو
گورنمنٹ سے نظربندی الاؤنس بہت کم ملتا تھا اور وہ بھی سارے کا سارا
کتابوں کی خریداری میں ختم ہو جاتا۔ تکلیف و مصرت کی زندگی تھی پر کبھی زبان پر اُن
نہ آئے دی۔ اس زمانہ میں ڈاکٹر انصاری نے بہت مذمت و مباحث اور احوال
کے ساتھ کچھ مدد کرنی چاہی لیکن انھوں نے قبول نہ کیا۔ لفظ وضع وادی کی جتنی
جانتی تصویر تھی۔ ضبط کا یہ عالم تھا کہ شاذ و نادر ہی کبھی انھیں غصہ آیا ہو۔ ہر مسئلہ
پر بے حد شدت سے دل سے سوچنے کے عادی تھے۔ اُن کی سب سے بڑی خوبی یہ
تھی کہ وہ کبھی اپنی بُرائی کرنے والوں کو بھی بُرا نہ کہتے تھے اگر ایسے شخص کی کوئی اُن
کے سامنے بُرائی کرتا تو وہ اُس کی کوئی اچھائی بیان کو سنے یا تہنیت کر دیتے تھے۔
صابر اس درجہ تھے کہ کسی حال میں بھی اور کسی موقع پر بھی انھوں نے اپنے سخت
سے سخت متذنبین کا بھی کبھی جواب نہ دیا۔ تقسیم سے پہلے بنگلہ حضرت دلی گورنمنٹ
نے اُن کی کیا کچھ تنقید کی مگر اُس نیک دل نے نہ اُس وقت کی پبلک
اسٹیج سے اور نہ تنہائی میں اُن کی شکایت کی اور نہ وہ اُن کے بارے میں کبھی
کوئی غامض لفظ زبان پر لائے اور نہ بعد میں جب دو قومی نظریے کی ہلاکت کا
پورا پورا احساس ہو چکا تھا۔ انھوں نے کبھی طعنے یا شکوے کر کے بدلہ چکانے
کی سوچی بلکہ شکر میں لکھتے کہ مسلم کن انشی کے اسٹیج پر جب وہ تشریف لائے
تو لوگ بہت سہمے تھے کہ مولانا آزاد اب مسلم لیگ کو بُرا بھلا کہیں گے۔ اُس کے
دیندوں کی پولیس کھولیں گے اور اُن کی پالیسی کی دھجیاں اڑائیں گے۔ مگر اُن کی
زبان سے جو پہلا فقرہ نکلا وہ یہ تھا کہ میں کسی کو ملامت کرنے نہیں آیا ہوں
جو ہونا تھا سو ہو گیا۔ اب ہم کو آئندہ کی فکر کرنی ہے۔ کون تھا جو اس بلند اخلاق
اور حسن کردار سے متاثر ہوئے بغیر نہ جاتا۔ مسلمانوں کی گذشتہ مصرت و ممانعت
کا جب آپس میں کبھی ذکر آیا تو خاموش رہ گئے یا اگر کچھ کہا تو صرف یہ کہا کہ اچھے
بیچنے کا دماغ کس کو دکھاؤں؟

مگر میں مولانا کی شخصیت اور تمام زندگی کو ایک جگہ میں بیان کرنے پر
مبور ہوں تو یہی کہوں گا کہ وہ انسان کے دلپ میں فرشتہ تھے اور اُن کی زندگی
ایک فرشتہ کی زندگی تھی۔

اس عظیم شخصیت کے سلف اتنے الفاظ تو کیا کئی کئی سیریں ہی کافی ہوں گی لیکن
فی الوقت میں اتنا کافی ہے کہ اُن کی سیاسی، ادبی، مذہبی خدمات ہمیشہ محفوظ رہتی

انگلش سٹوڈنٹ

پر غیبت رہیں گی۔

ہرگز نہ یہ کہ دشمن زندہ شدہ شوقِ شہادت است بر جہنمہ عالم دوام ما۔۔

بلوچ غلام محمد پر اہم منظر ریاست جٹوں و کشمیر

امام اہل ہند مولانا ابوالکلام آزاد کی زندگی اور ان کی تعلیمات ہماری عظیم قومی شناختی اور ادائیگی میراث ہے۔ اس سلسلے مولانا کی یاد تازہ کرنا ایک اہم قومی اور ادبی فریضہ ہے اس سلسلے میں آج کل کا اہم الکلام ہنزہ ایک جہانگ قدم ہے جسے کہ سارے مولانا کی زندگی اور فکر و عمل کے مختلف پہلوؤں اور چٹھے ہوئے گوشوں کو اجاگر کر کے کشمیر کاموں کی تشنگی کو دور کر سکے گا۔

مولانا کو کشمیر سے خاص شغف اور لگاؤ تھا۔ یہ دشتِ اطلال و محبت صرف ان کے ذوقِ جبل کا ہی رہیں منت نہ تھا۔ دوستی اور یگانگت کا یہ علاقہ سیاسی عقائد و اعمال سے زیادہ تر متعلق تھا۔ سیاسی میدان میں مولانا نے متحدہ قومیت بھائی چارہ، تعمیر اور امن کی راہ اختیار کی تھی۔ کشمیری حوام کا بھی یہی محبوب منزل مقصود رہا ہے۔ ہاشم گان ریاست اس دشوار گزار کشمیر کے قومی علاج کے راستے پر کڑی سے کڑی آزمائش اور امتحان ہیں اسی طرح ایک زبردست حرم فریتر و نول تہمین اور پورے اعتقاد کے ساتھ ایک سبیر پلائی ہوئی دیوار کی مانند ڈٹے رہے۔ جس طرح مولانا نے اپنی ساری زندگی میں زمانے کی ہولناکی پیرہہ و ستیوں پر زخمی کسی کی رومی اور ستم بازیوں کے درمیان انسانیت کی سرحدیں اور سرحدوں کے لئے فرزند پرستی، تعصب، جہالت، حرص و آز کی، باطل قوتوں سے زبردست قوتِ ارادی، حکم ایمان اور بے پناہ جوش و خروش کے ساتھ راتے رہے۔ ان ہی اصولوں اور آدشوں کی کیسانیت اور یگانگی کی کرشمہ سازی ہے کہ آج کشمیر ہند کے رشتہ اشتراک میں ایسے بندھن کے قوت سے ٹوٹ نہ پائے گا اور کشمیری حوام جن کے دوسرے جہتوں میں رہنے والے اپنے بھائیوں کے شاد و خندانہ تعمیر، امن اور فلاح عامہ کے لئے سرزمین ہند پر ایک تاریخی اور ادائیگی جنگ لڑ رہے ہیں۔ آج اگرچہ مولانا ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں۔ لیکن ان کی تعلیمات اور اصول ہیں پڑت نہرو کی قیادت ہیں ایک ایسا سوشلسٹ سماج تعمیر کرنے پر اُتار رہے ہیں۔ جس میں بلا امتیاز مذہب و ملت، رنگ و نسل ہند میں رہنے والے سبھی لوگوں کو ترقی کرنے اور آگے بڑھنے کے یکساں مواقع اور سہولیات کی ضمانت دی گئی ہے۔

آج کل دہلی (ابوالکلام ہنزہ)

افترض مولانا میدان سیاست کے شہسوار اور ہماری جدید تاریخ کے ایک ہیرو ہیں نہ تھے۔ آپ ایک ہی زندگی اور ایک ہی وقت میں ایک دولتمند قومی رہنما بھی تھے، زبردست فلسفی بھی تھے، اجادہ بیان خطیب بھی تھے۔ صاحبِ طرز ادیب بھی تھے، عہدِ عالم دین بھی تھے، اور سب سے پہلے مذہب اور ماہر تعلیم بھی تھے۔ تعددِ کاتاہ مولانا کی ایک ہی زندگی میں بیک وقت کئی زندگیوں جمع ہو گئی تھیں۔ منفرد اور بلی ہوئی حیثیتوں کی یہ جامع زندگی ان تمام خرمیوں اور اچھا چٹوں کا ایک حسین اور دل نواز امتزاج تھی۔ جو ہماری قومی سماجی اور ثقافتی زندگی کا حاصل ہے۔ اس حیثیت سے مولانا کی زندگی ہمارا ایک قابلِ تکرار و تکرار ہے۔ وہ ورثہ جسے ہم بیسے سے لگا کر اپنی اور اپنی نئی پود کی زندگیوں کو خوش آئند اور تازہ جاک مستحق کی لازوال خوشیوں اور مسرتوں سے مالا مال کر سکتے ہیں۔

میں اس پیغام کی وساطت سے ہند کے قومی۔ ہنماؤں، ادیبوں، شاعروں اور حوام کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ ہم ہندوستان کی برہمنی پیشانی۔ کشمیر میں مولانا کی زندگی اور تعلیمات کی نورانی مشعل کو اسی طرح فروزاں رکھیں گے جس طرح اب تک روشن رکھے ہوئے ہیں۔ کامیابی کے لئے دعائیں

حافظ محمد ابراہیم وزیر آبیاری و بجلی

مولانا مرحوم کی نسبت میرا کچھ عرض کرنا چھوٹا منہ بڑی بات ہے۔ مولانا کے پاس سب سے بڑی چیز ملیت تھی۔ اس کی نسبت مجھ جیسا جاہل کہہ ہی کیا سکتا ہے پھر بھی آتنا غرور عرض کرنے کی جرأت کرتا ہوں کہ ان جیسا اس زمانے میں کوئی اور نہیں تھا۔ اور زمانہ بختوں اب ایسا کوئی اور پیدا نہیں کر سکے گا۔ نہ سلیم دنیا کو کب تک انتظار کرنا ہوگا۔

دنیا میں بے مثال عالم ہونے کے علاوہ مولانا محبِ وطن اور بہت بڑے درجہ کے محبِ وطن تھے۔ کانگریس اور ملک کی خدمات جو مولانا نے انجام دیں ہندوستان کی تاریخ کا ایک زریں باب ہوں گی جس کو پڑھ کر ہماری آئندہ نسلیں قز و مساباات کے ساتھ مرحوم کو یاد کریں گی اور ان کی سیرتوں میں اس یاد سے ایک عطا اور بلند جوصلگی پیدا ہوگی۔ یادِ حیدر و وفات مولانا ہمارے درمیان زندہ ہیں۔ مولانا ابوالکلام زندہ باد

اگست ۱۹۷۷ء

مسٹر ادونا آصف علی میٹروپولیٹن کارپوریشن

مولانا آزاد کی عظمت کا چند نغموں میں احاطہ نہیں کیا جاسکتا۔ ان کی گونا گوں اہم و محکم شخصیت علامہ اودھام دھول ہی کے لئے سرچشمہ رہیں تھی۔ جس کسی کو انہیں قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا اس کے لئے یہ ایک بے حد پر تجربہ بنی ہوئی بات تھی۔

مولانا آزاد ہندوستان کی آزادی کے شاید سب سے زیادہ فصیح بیان و کمال تھے ایکس جی وگوں نے ہندوستانی قومیت کی ترقی میں رکاوٹیں ڈالیں، ان کے لئے بھی مولانا کے دل میں انتہائی مبہر و نگر کے سوا کچھ نہ تھا۔ مولانا آزاد ہماری تاریخ میں ہندوستان کی اس نشاۃ ثانیہ کے لہجوں میں شمار کئے جاسکتے تھے جو قومی خدمات کے لئے گویا ایک موسم بہار تھا اور جس نے ملک والوں کو بیدار اور بڑبڑاتا رہا کیا۔

ان کی تحریریں میں نہ صرف ہمہ گیریت ہے جس نے انہیں ادب عالیہ بنایا ہے بلکہ ان میں دالہانہ ادبی کیفیت بھی پائی جاتی ہے۔ یہ تحریریں کئی نسلوں تک امداد کی تاریخ کو متاثر کرتی رہیں گی۔ ہمارے زمانے کا مورخ اگر مولانا آزاد کی زندگی کا بظور مطالعہ کرے گا تو اس کا کام آسان ہو جائے گا۔

گاندھی، نہرو اور آزاد یہ تین شخصیتیں ہندوستانیوں کی دوسلوں کے خیال و عمل پر پوری طرح چھائی رہی ہیں۔ ان تینوں شخصیتوں کی قوت تاخیر اس بات میں منعقد کر کے غلط و گمراہی کے تین عجیب و غریب رجحانات کا ہم آہنگ امتزاج تھا۔ مولانا آزاد کی وفات سے جو خلا پیدا ہو گیا ہے وہ پُر نہیں ہو سکتا۔ لیکن اگر ہم ان کی عظمت اور ذہانت کے ورثے کو برقرار رکھ سکے تو وہ بہرہ مند نسلوں کو متاثر کرتے رہیں گے۔

تاریخ انتقال ابوالکلام آزاد ادا دی

ادی القادری

ہوئے جو حضرت آزاد زلیست سے آزاد
وہ جس کو فکر ہو تاریخ سال رحلت کی
یہاں ہے قعر حکومت میں نالرو وفسر یاد
انہیں یہ چاہیئے رکھیں یہ شعر ادا دی یاد

وزیر دانش و دانش ور دادیپ ہشیر

۱۹۸۳
مجاہد وطن آزاد، ابوالکلام آزاد
۲۷۵ + ۱۹۸۳ = ۱۹۵۸

دلورید بڑ دل اور شہرت احساس
کوئی بناؤ تو کیا بات ہے کہ کرنے لگی
بیان کر نہیں سکتا ہے نطق انسانی
زبان کلک ہمسار اشک انشائی
یہ کون اٹھ کے گیا ہے کہ بزم ابد میں
ہوئی ہے رنج و غم و دور کی فسرانی

ملی ہے خوب یہ تاریخ سال فصلی بھی

ابوالکلام خطیب دادیپ لاشانی

۱۳ ت ۱۶

وہ مجھے سب ابوالکلام کہیں
عقل کرتی تھی جس سے اشتہال
ایسے اچھے خطیب سے رخصت
ہند کے اس لبیب سے رخصت
دوستوں کے قلوب جانتے ہیں
ہے قیامت جیب سے رخصت

کوئی پوچھے اگر سب، جری

کچھ ادا دی "ادیپ سے رخصت"

۱۳ ۷ ۷۷

لے اہلاد سے عقلموں نے روش حاصل کی ہے

آج کل دہلی (ابوالکلام بزر)

اگست ۱۹۷۷ء

گرہ کشائے زمانہ تھا تیرا ناخن ہوش
ہمیں ملتا تھا بڑا عہدِ آفریں تجھ کو
تری نگاہ سے اسرارِ شوق لب چھپتے
عطا ہوئی تھی نگاہِ کرشمہ میں تجھ کو
ہوئے منزلِ جاناں لبِ آبی راس تجھے
قرار دل نہ سکا ایک پل کہیں تجھ کو
بلند تر تھی نرے ذوق و کیف کی دنیا
کہ جام نہ رہی تھا جامِ انجیں تجھ کو
پتھر تھا کئی صدیوں کا شخصیت تیری
بھلا کے گی نہ یہ خاکِ غبریں تجھ کو

نہرہ سکا قفس رنگ و بو میں قیہ رک تو
ازل سے فطرتِ آزادے کے آیا تھا
اُتر گئی جو رگِ گل میں بن کے خون کی بوند
وہ موجِ نکبت بربادے کے آیا تھا
کسے خبر تھی تو ہنسی ہوئی نگاہوں میں
فسادِ دلِ ناشادے کے آیا تھا
غسلِ سراپا ہر دم میں جنوں تیرا
خلط کہ تو لبِ نسوایا دے کے آیا تھا
ترے لبوں پر دم واپس تھا کس کا نام
تو دل میں کس کی حیس یادے کے آیا تھا

ذائقہ بنگلوری

قطرہ تاریخِ بردفات امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم

عالم جیتا، فقیہ المثل، دانائے علوم
زینِ سرائے ششدری نقلِ مکاں فرمودے
سرفروشِ ملک و ملت، شہسوارِ حریت
بستِ رختِ زیتِ راوِ آخرت پیو دے
روزِ شنبہ بود بست و دد میں از فرودی
طاہرِ جانش پر پرداز را یکشود ہائے
زادِ پوشش بود مکہ شصت و نہ سالہ حیات
در کتابِ خاکِ دہلی احسنِ اسود ہائے

صبا نر جیش، مکر گفت ذائقہ عیسوی

مشرقتاں از امام الہند خالی بود ہائے

آج کل دہلی دا ابوالکلام ہنر

اس کے گمستہ میری گستاخی سمجھے جو پرمترت کی بھرا دگی اور جب میں ان کے بلانے پر ان سے ملے گیا تو میں مشرم سے گڑ جاتا تھا اور وہ محبت سے اُٹھتے جاتے تھے اور میرے اوپر شفقت کی ایسی بارش متقی کر میں اس کو کبھی بھلا نہیں سکوں گا۔ مولانا بہت سی جھٹیلیں رکھنے والے آدمی تھے۔ وہ بہت بڑے عالم تھے مذہب کے، بہت بڑے عالم تھے ادب کے، ادب پر لڑ پیر پر بڑی نظر رکھتے تھے۔ بڑا اچھا مذاق رکھتے تھے۔ کہاؤں پر عاشق تھے اور کوئی سیاست دان یہ نہ سمجھے کہ انہوں نے سیاست کی خاطر اپنے علم کو کبھی بھی چھوڑا ہوا آخر لے تک اس کے ساتھ وفادار رہے۔ ان وہ یہ جانتے تھے کہ علم ایک بار بھی ہی سکتا ہے، علم ایک ایسا بوجھ ہو سکتا ہے جو آدمی کو دبا دے اور اس کو ناکارہ کر دے۔ وہ علم کے ساتھ اپنی سماجی ذمہ داریوں کو بھی سمجھتے تھے۔ وہ اپنے وطن کے فرائض کو بھی جانتے تھے۔ انہوں نے آخر وقت تک علم کو نہیں چھوڑا اور علم کی لگی اُلا کے دل میں لگی رہی۔ کتابوں کی تلاش، چیزوں پر غور و فکر، ان کو سوچنا، ان کو سمجھنا، ان کے جوڑ ملانا، چاہے وہ تاریخی مسائل ہوں، چاہے وہ ادبی مسائل ہوں، چاہے وہ علمی مسائل ہوں، ان کا یہ شغل آخر تک باقی رہا۔ ابھی آخری مرتبہ سمیر میں جب میں ان سے ملا تو وہ دو کتابیں دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کتابوں کے دیکھنے کے لئے پٹینے لے کے کاراوردہ ظاہر کیا کہ گوانڈی کے سفر میں پٹینے اڈوں گا اور وہ دو کتابیں دیکھوں گا۔ انہوں نے

دانشور تھی جی، بیاض اور دھنواں! آپ جانتے ہیں کہ ہم آج کیوں یہاں
 ہیں۔ پہلے تک آپ کے سامنے جو کچھ کھایا وہ مولانا کے ساعتوں کی
 قدرت کا اہتمام تھا۔ میں مولانا کے ساعتی ہونے کا فخر نہیں رکھتا ہوں۔ میں
 کے ایک حقیقہ چیلے ہونے کا فخر رکھتا ہوں۔ آدمی چھوٹا، سیاہیلا، اپنی زندگی
 بنانے کے لئے کہیں نہ کہیں سے روشنی اور گرمی لیتا ہے۔ میں جب ایک
 ایسا ہی تھا اپنی زندگی کے مٹی کے وسیعے کو تسکینا چاہتا تھا۔ اور لوگوں کی طرح
 سنے بھی رونے کی باتیں بنائی تھیں۔ اور اپنی زندگی کے تیل میں ان کو ڈالنا تھا
 رخصت ہونا پھرنا تھا کہ ان کو کہاں سے جلاؤں۔ اس زندگی کی پہلی بقیہ اس
 بچے کی پہلی بقیہ میں نے مولانا کے وسیعے سے جلائی تھی۔ ایک طالب علم کی
 جہت سے میں ان کا 'اسلام' پڑھتا تھا اور جب میں اپنے ساتھیوں
 رابطہ کر اس کو پڑھتا تھا اور اعلیٰ سناتا تھا اس وقت اس بقیہ میں
 نہ لگی تھی۔ یوں اور جگہ سے بھی میں نے انگ۔ لیکن آج میں اقرار کرتا ہوں
 پہلی انگ انھیں سے لی تھی۔ میں ان سے دور دور ہوتا تھا اس لئے کہ میں
 باہر سے آؤں نہیں ہوں۔ ہر وقت ان کے ساتھ کامیوٹ عہد کو نہیں تھا
 کبھی ان سے ملتا تھا اور جب ملتا تھا تو ان سے روشنی اور گرمی پاتا تھا۔
 سال بھر کھڑے تھا کہ ایک بات میں مجھے ان سے کچھ رنج تھا اور میں ان
 کو کچھا۔ اس وقت آپ کے سامنے اقرار کرتا ہوں کہ میں نے اپنی کم ظرفی
 وجہ سے اس کچھا وٹ کو ان پر ظاہر بھی کیا مگر اس کو بھارتیہ، بھارتیہ

اس کا موقع ان کو نہیں ملا۔ علامت کی وجہ سے زندہ کانگریس میں گئے اور نہ اسلئے
 چلے گئے۔ ایک کیلکی یہ لگن، آخری وقت تک رہی۔ مگر کوئی یہ نہ سمجھے کہ
 وہ ایسے عالم تھے کہ علم کے بہانے سے اپنے تمام سماجی فرائض سے الگ ہو
 جاتے اور سماجی فرائض کا خیال نہ کرتے۔ انہوں نے اپنی مثال سے یہ بتا دیا
 کہ وہ اپنی ساری زندگی ایک عہدہ کی طرح اپنی قوم کی آزادی کے لئے اس
 کی آزادی حاصل کرنے کے لئے اور آزادی حاصل ہونے کے بعد آزادی کو
 اچھی بنیاد پر قائم کرنے کے لئے صرف کر سکتے ہیں۔ انہوں نے یہ ثابت
 کر دیا کہ علم ایک گورکھ دھند نہیں ہے کہ جس سے لوگوں کو دھوکے دئے
 جائیں بلکہ وہ ایک روشنی ہے جس سے آدمی دوسروں کو روشنی دکھا سکتا
 ہے۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ اس عالم، اس فکر، اس مرد عہد کے فکر و حق
 کہنے پتے کی بات کہنے، ناگوار سچی بات کہنے کی مثالیں قائم کی ہیں۔ سچ بات کا
 کہنا سب سے بڑا جہاد ہے۔ سچ بات کہنے میں بڑی ناگواریاں ہیں۔ لوگ
 ناخوش ہوتے ہیں اور مولانا سے لوگ کیا ناخوش نہیں ہوئے۔ یہاں
 مسلمان جانی ہوں گے۔ ہم سوچیں کہ ہم نے مولانا کا کس کس طرح دل نہیں
 دکھایا۔ ہم نے مولانا کو کیا کہہ نہیں کہا۔ کوئی سبب لفظ ہے جو ہم نے ان
 کے لئے استعمال نہیں کیا لیکن اس وقار کے پتے نے کسی ایک لفظ ہمسایہ
 کسی کے متعلق؟ کوئی ہے یہاں جو یہ شہادت دے سکتا ہے کہ اس نے
 کبھی کسی کی بابت کوئی ایسا کلمہ سنا کہ انہوں نے شکایت کی ہو یا برا مانا ہو۔
 سبب پنکھ گزرجاتا تھا اور اس کی وہ بالکل پیدا نہیں کرتے تھے۔ وہ
 کلمہ حق مزدور کہتے تھے۔ مشورہ لیجئے مجمع مشورہ دیتے تھے۔ جیسا کہ ابھی
 کہا گیا کہ وہ کم آمیز تھے۔ کچھ عرصے سے زیادہ کم آمیز ہو گئے تھے۔ لوگوں
 سے کم ملتے تھے۔ لیکن وہ سب کے ساتھی تھے۔ وہ اس گھر سے میں بیٹھ
 کر ہمارے سب کے ساتھی تھے۔ اور اس طرح ساتھی کہ ہمیں محسوس ہوتا تھا
 کہ وہ ہمارے ساتھی ہیں۔ اس لئے کہ جب وہ بات کہنے کی ضرورت ہوتی تھی
 جو ہم چاہتے ہیں کہ کہی جائے اور جو ہم سمجھتے ہیں کہ ہم نہیں کہہ رہے ہیں اور
 ہمارے طرف سے نہیں کی جا رہی ہے۔ وہ اس کو کہتے تھے اور ہمیں لیتے
 تھا کہ وہ اس کو کہہ سکتے ہیں اور ایک مرد عہد کے واسطے یہ بہت بڑا مرتبہ
 ہے۔ ان سب میں ہمارے واسطے بہت بڑی جہتیں ہیں۔ ان سب میں
 ہمارے واسطے بہت بڑے سبق ہیں اور جیسا کہ میں نے کہا چو نکہ میں ایک

طالب علم کی طرح سبق لینے کے لئے ہی ان کے پاس گیا تھا۔ آج بھی یہ سمجھتا
 ہوں کہ وہ سبق جاری ہے۔ اگرچہ وہ ہم میں نہیں رہے۔ جیسا کہ
 راشٹر پتی جی نے کہا کہ وہ کلم جس سے موتی برستے تھے، وہ کلم جس سے بھلیاں
 بھی گرتی تھیں، وہ زبان جس سے پھول برستے تھے اور جس سے چنگاریاں
 بھی برستیں تھیں، جو باطل کو حلاقی بھی مٹی اور سچ کو روشنی بھی کرتی تھی۔
 وہ زبان بند ہے وہ کلم ٹوٹ گیا ہے لیکن وہ مثال باقی ہے اور ہمیں چاہیے
 کہ ہم اس مثال سے گرمی بھی لیں اور روشنی بھی لیں اور اپنی زندگی کو ایسا
 بنائیں جیسا کہ وہ چاہتے تھے کہ ہم بنائیں اور جس کی مثال وہ ہمارے
 لئے چھوڑ گئے۔ ہمارے سامنے ایک بہت بڑا کام ہے۔ اس قوم کے بدلنے
 کا کام کوئی نہیں ہے۔

بستی بسنا کھیل نہیں لیتے بستی ہے

کوئی یہ نہ سمجھے کہ بستی کے اوپر سرسوں جم سکتے ہیں۔ اس میں معلوم
 کتے اور الکلام کھپ جائیں گے، کتنی لٹلیں کھپ جائیں گی اور یہ کام کبھی ختم
 نہ ہونے والا کام ہے۔

اس لئے ہمیں اپنے سامنے اس راستے کو رکھنا چاہیے۔ ان مثالوں کو
 زندہ رکھنا چاہیے۔ وہ اس طرح زندہ رہ سکتی ہیں کہ ہم وہ کریں جو وہ
 کرتے رہے اور کوئی یہ نہ سمجھے کہ ہم وہ نہیں کر سکتے ہیں جو وہ کرتے تھے۔ کسی
 کی جگہ پر نہیں کی جاسکتی۔ بہت بڑے بڑے لوگ گزرتے گئے جیسا کہ کسی نے
 ابھی حال میں کہا تھا کہ بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ آسمان پر بہت سے
 ستارے ایک ساتھ آجاتے ہیں۔ ہمارے قومی آسمان پر بھی بہت سے
 ستارے ایک ساتھ آگئے تھے۔ وہ ایک ایک کر کے ڈھلے جاتے ہیں۔
 لیکن اس کی پروا نہیں کرنی چاہیے۔ اس لئے کہ پروا کر کے کچھ ہو نہیں
 سکتا۔ ان کا جانا ضروری ہے، برحق ہے۔ کوئی ان کو واپس نہیں لا سکتا
 ہمارا فرض یہ ہے کہ ہم اپنی زندگی میں کسی ترکیب سے ان کاموں کو پورا
 کرنے کی کوشش کریں۔ جو کام ایک آدمی کرتا تھا وہ ایک ہزار آدمی مل کر
 کریں۔ لیکن اپنی زندگی کا رخ وہی رکھیں۔ سچائی کی طرف رکھیں، حوصلہ کی
 طرف رکھیں، علم کی طرف رکھیں، ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کریں
 اور جائیں کہ ہمارے اوپر جو فرائض ہیں وہ پوری طرح ادا کئے جانے کے لئے
 روزانہ مطالبہ کرتے ہیں۔ یہ فرائض کبھی ختم نہیں ہوتے۔

ہمارے پاس جو چھوٹی وفاداریاں ہیں اتنی وفاداریاں ہیں وہ زیادہ قوی ہیں۔ ہم چھوٹے چھوٹے گروہوں سے زیادہ وابستہ ہیں اور بڑے گروہ کو پوری طرح نہیں سمجھتے ہیں۔ ہم کو چاہیے کہ اپنی چھوٹی وفاداریوں کو اس بڑی وفاداری کا تابع کریں۔ کوئی مزدورت نہیں ہے کہ چھوٹی وفاداریاں توڑ دے یا بیش۔ کسی کو یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ سکھ نہ رہے، مسلمان نہ رہے، ہندو نہ رہے یا پارسی نہ رہے لیکن اس کو پہلے اپنے دلیں کا پھر تمام انسانیت کا خاتمہ بننا چاہیے۔ تب وہ سچا مسلمان ہے، تب وہ سچا ہندو ہے، تب وہ سچا عیسائی ہے، تب وہ سچا پارسی ہے، تب وہ سچا سکھ ہے۔ یہ سب مولانا کی زندگی سے جیسا روشنی طور پر ہمیں ملتا ہے اور یہ سب جس طرح ہمارے واسطے آج کی زندگی میں اور ہماری قومی زندگی میں ضروری ہے اس کے اعتبار سے ہم سمجھتے ہیں کہ آج کا دن ہمارے لئے اس قدر اہم ہے کہ اس دن سے ہم اس روح کو، مذہب کی سچی روح کو اپنی قومی زندگی میں کاربند کریں۔

میرے خیال میں مولانا نے جو ایک سب سے بڑی خدمت کی وہ یہ ہے کہ ہر مذہب کے آدمی کو انہوں نے یہ بتایا کہ مذہب کی دو حیثیتیں ہوتی ہیں۔ ایک مذہب کی حیثیت ہوتی ہے جو تعزین پیدا کرتی ہے، ایک مذہب کی حیثیت ہوتی ہے جو لوگوں کو الگ الگ کرتی ہے۔ جو لوگوں میں نفرت پیدا کرتی ہے۔ وہ مذہب جو ملتا مذہب ہے انہوں نے یہ بتلایا کہ مذہب کی روح ظالمہ والی روح ہے، مذہب کی روح ایک دوسرے کو پسپا کرنے والی روح ہے، مذہب کی روح خدمت کی روح ہے۔ مذہب کی روح دوسروں کے لئے اپنے کو شعلہ کی روح ہے، مذہب کی روح وحدت کو ماننے کی روح ہے، ساری زندگی کی وحدت کو ماننے کی روح ہے۔ اور ایک ایسا سبق ہے جو تمام مذہبی جماعتوں اور تمام آدمیوں کو سیکھنا چاہیے جو چھوٹی چھوٹی ٹکڑیاں بنانا چاہتے ہیں۔ زبان کے اوپر بڑے بڑے اور بڑے بڑے ذات پات کے اوپر یا کسی مذہب کے اوپر ٹکڑیاں بنا کر ہماری زندگی کی وحدت کو مٹانا چاہتے ہیں۔ ہمارے ملک میں اس وقت جو مذہب سے بڑا مرض ہے وہ یہ ہے کہ

بہار و خزاں

اور امید و بیم

اس میں تو شک نہیں کہ جس قدر کوشش سے غور کیجئے گا۔ جذبات انسانی کی تغیر و تبدل۔ یہ کے آخری ذخیرہ میں وہ چیزیں امید و حیرت نظر آئیں گی۔ جو کچھ کہتا ہے یا آئندہ کی امید ہے یا رفتہ بہر صورت۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ امید و یاس کی تقسیم کو صرف افراد و اشخاص میں محدود نہ کیجئے بلکہ اس میں دراصل قوموں اور ملکوں کی تاریخ پوشیدہ ہے۔ بارش و چمن میں بہار و خزاں دو موسم ہیں جو یکے بعد دیگرے آتے ہیں۔ اور اپنی اپنی آمد کے ساتھ وہ مختلف آثار چھوڑ جاتے ہیں۔ اسی طرح امید و حیرت کو دو مختلف موسم تصور کیجئے جو قوموں اور ملکوں پر بھی آتے ہیں اور وہ نامرادی و کامرانی کی تقسیم ہے جو اپنے اپنے وقتوں پر قوموں میں ہو جاتی ہے۔ بعض قومیں ہیں جن کے حصے میں امید کی بہار آئی ہے اور بعض قومیں جواب صرف یاس و حیرت کے خزاں ہی کے لئے رہ گئی ہیں موسم بہار زندگی و نشاط کا موسم ہوتا ہے اور انسان کی رگوں کے اندر دوڑنے والے خون سے بھرے کہ زخموں کی شافعی اور ہلیروں تک ہر چیز میں خوش حیات اور دلورہ انبساط پیدا ہو جاتا ہے۔ یہی حال ان قوموں کا ہوتا ہے جو اپنے دور امید سے غرق ہوتی ہیں۔ تمام دنیا ان کے لئے ایک بہشتِ امید بن جاتی ہے اور اس کی ہر امانت کے کانوں کے لئے ایک ترانہٴ امید کا لام دیتا ہے۔ وہ اپنے اندر کیجئے ہیں تو دل کا ہر کونہ امیدوں اور دلوں کا آئینہٴ نظر آتا ہے اور باہر نظر ڈالنے میں تو دنیا کا کوئی حصہ جو اس امید کی سکر اسٹ سے خالی نہیں ہوتا اس ظلم ناہست و نیست میں انسان سے باہر نہ غم کا وجود ہے نہ خوشی کا۔ زندگی کی تمام کامیابیاں اور مسرتیں دراصل دل کی حیرت کا میوے ہیں جب تک آپ کے دل کے طاق غم میں امید کا چراغ روشن ہے۔ اس وقت تک دنیا بھی ہمیشہ و مسرت کی روشنی سے خالی نہیں۔ لیکن اگر باوجود نامرادی کا کوئی جھونکا وہاں تک پہنچ گیا تو پھر کافقائے نصف انہار پر درختاں کیوں نہ ہو مگر تعین کیجئے کہ دنیا کا یہ تمام نظام متورم آپ کے لئے ظلمت مرائے تاریک ہے۔

(’الہلال‘ ۹-۱۰ اپریل ۱۹۱۳ء)

عہد آفریں شخصیت

کی سیاست سے الگ ہونے کی کوشش ہندوؤں کی بڑھتی ہوئی قومی بیداری کے
یہ مقابل تھی۔ جو اب سیاست میں زیادہ سے زیادہ حصہ لینے لگے تھے۔ سرسید
کی ہندوؤں سے دوستی اور قدردانیت کے باوجود ان کی سیاست نے بالآخر
ایک پٹیا کھایا۔ ان کی پالیسی جو کہ سیاست کے خلاف تھی ان کے جانشینوں کے
ہاتھ میں ہندوؤں کے خلاف آراء کاربن کر رہ گئی۔

جس وقت مولانا آزاد ہندوستانی سیاست کے میدان میں داخل ہوئے
تو ہندوستانی مسلمانوں کی منظور شدہ پالیسی یہی تھی۔ اس وقت نیم سیاسی
شعور رکھنے والے مسلمانوں کی بڑی اکثریت کے سامنے سرسید کی پالیسی کے
علاوہ کوئی اور راستہ نہ تھا۔ یعنی برطانیہ سے تعاون اور ہندوؤں سے
علیحدگی۔ جب مولانا آزاد نے واضح طور پر اس بات کی دعوت دی کہ قومی تحریک
سے پر را پورا اتحاد اور تعاون کیا جائے اور برطانوی شہنشاہیت کی طاقتوں کی
پر زور مخالفت کی جائے تو پہلے پہل کوئی ٹڑا نہ تھا اور پھر سرکار مسلم سیاستدانوں
کے بعض طبقے ناراض بھی ہوئے۔ اس وقت اہل الرائے مسلمانوں کی اکثریت کو
مولانا آزاد کا یہ موقف ایک سراسر سیاسی بدعت دکھائی پڑا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا
کہ اہللال "ہندوستانی مسلمانوں کے اُبھرتے ہوئے جذبے کے اظہار کا
ذریعہ بن گیا۔

مولانا آزاد چالیس سال سے زیادہ عرصے تک قومیت، ترقی، آزادی
اور جمہوریت کے تقاضوں کے حامی رہے۔ یہ بات بعض لوگوں کو کچھ عجیب سی
ملوم ہوتی ہے۔ مولانا آزاد مذہبی علماء کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور ان
کی پرورش اور تربیت ان کی خاندانی روایات کے مطابق ہوئی تھی۔ چوں کہ

کوئی چالیس سال ہوئے جب مولانا ابوالکلام آزاد پہلی بار ہندوستان
میں علم ادب اور سیاست کے میدان میں داخل ہوئے تھے، یہی آج تک ان کے
ہم وطن جن میں ان کے طابع اور تہذیبوں شامل ہیں، اس بات کا فیصلہ نہ کر
سکے کہ مولانا آزاد ایک ادیب کی حیثیت سے زیادہ نمایاں تھے یا یہ حیثیت
سیاست دان۔ مولانا آزاد اسی عظیم الشان شباب کی منزل میں ہی تھے کہ انھوں نے
'اہلال' اور 'البلد' میں آتش نوا مضامین لکھ کر شمالی ہند کی ادبی دنیا میں
ایک ہنگامہ برپا کر دیا تھا۔ محض ادبی کاوشوں کے اعتبار سے بھی اردو زبان
عادب کی تاریخ میں یہ مضامین اپنی مثال آپ ہیں۔ خطابت، فصاحت و بلاغت
ذہانت و فطانت، تیکھے طنز اور اعلیٰ و ارفع حقیقت کا ایسا امتزاج مشکل
سہمی ملتا ہے۔ 'اہلال' کے ادیبوں میں معنوں نگاری کے جو نمونے پیش کئے
گئے، انھوں نے اردو نثر میں ایک نئے اسلوب نگارش کی بنیاد ڈالی۔

مگر اس وقت کے فوجیوں کے دماغ جس چیز سے متاثر ہوئے وہ
مولانا آزاد کے مضامین کی صرف ادبی فریقیت یا شاعرانہ محسوس نہیں تھا۔ برطانوی
اقتدار کے خلاف ۱۸۵۷ء کی ہندوستان کی جدوجہد کے ناکام ہو جانے کے بعد سے
ہندوستانی مسلمان پالیسی اور عدم اعتماد کی فضا میں زندگی بسر کر رہے تھے۔
سرسید احمد نے مسلمانوں کی گرتی ہوئی حالت سدھارنے کے لئے اس طریقے پر
کوشش کی کہ فتنہ کی حمایت حاصل کی جائے اور مسلمانوں کو عملی سیاست سے
دور رکھا جائے۔ سیاست سے گریز بالآخر سیاست کی مخالفت بن کر رہ گیا۔
ایسی منفی پالیسی بذات خود بڑی پالیسی تھی۔ پھر اس وقت کے حالات کی وجہ
سے یہ پالیسی ملک اور قوم کے لئے زہرہ منت خطرے کا باعث ہو گئی۔ مسلمانوں

مولانا آزاد مذہبیات کے زبردست عالم اور اسلامی حدیث و فقہ کے ماہر تھے۔ اسی لئے بعض لوگ مسلح اور قوم پرست کی حیثیت سے ان کے رول کو پرکھتے۔ غیر حقیقی سمجھتے تھے۔ لیکن یہ کوئی عجیب و غریب بات نہ تھی۔ یہ بات انہیں لوگوں کے عقوبت خیز ہے جو اسلام کی روایات کو قبول گئے ہیں اور صرف انہیں عقائد پر نظر رکھتے ہیں جو ان کو انگریزوں نے ہندوستانی مسلمانوں سے وابستہ کر دئے ہیں۔ اسلام نے جس میں جمہوریت، آزادی اور حقیقت پر زور دیا گیا ہے جو بال مولانا آزاد کو اس وقت کی سیاسی غلامی، جاگیردارانہ طبقاتی درجہ بندی اور ذہنی ظلمت پسندی کے خلاف بغاوت پر ابھارا۔ چنانچہ وہ ملک و قوم کو سیاسی غلامی، جاگیرداری، عرش و سرسندی اور توہم پرستی سے نجات دلانے کے لئے کھڑے ہو گئے۔ یہ پہلی آزادی کا جذبہ ہی تھا جو مولانا آزاد کو عزالت نشینی کی خانقاہ سے نکال کر سیاست کے میدان کا رزمی بنائے گا۔

لیکن سیاسی سرگرمیاں مولانا آزاد کی علمی حیثیت پر کبھی مادی نہیں ہو سکیں۔ لوگ عالم کو زندگی کی مستقل قدروں سے تعلق ہوتا ہے جبکہ سیاست والی عام طور سے دینی باتوں پر توجہ کرتے ہیں۔ مولانا آزاد ڈیڑھ سو سال کی سیاسی چال باز سے زیادہ ایک بڑے دیرینے تھے۔ ان میں دو خصوصیات تھیں جو ان کے تمام سیاسی اعمال کا راز امتیاز ہیں۔ یعنی ان کی سنجیدگی اور عوامی قارئین اور ان کی سلیبی ہٹی قوت فیصلہ اگرچہ وہ ایک شاعر کی طرح بے حد حساس واقع ہونے لگے لیکن انہوں نے کبھی سیاسی فیصلوں میں اپنے جذبات کو مادی نہیں ہونے دیا۔ کسی شخص کے بارے میں ان کی پسینا ناپندان کے فیصلوں میں کبھی آڑے نہیں آئی۔ انہوں نے ہر معاملے کو حقیقت پسندی کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کی اور یہ بات ان کے دوست دشمن دونوں کے لئے تعجب خیز رہی ہے۔ اس مزاجی قرائن اور سنجیدگی کی وجہ سے ان کا مشاہدہ بہت صاف تھا۔ جب تک کوئی شخص معقولیت پسند رہتا ہے اور ہر بات کو دلائل کی روشنی میں پرکھتا ہے۔ اس وقت تک اس سے غلطی سرزد نہیں ہو سکتی۔ سیاست میں اور دوسری جگہ بھی غلطیاں اسی وقت ہوتی ہیں جبکہ قرائن پر تعصب غالب آ جاتا ہے اور اس کی وجہ سے ہم ذریعہ نظر معاملے کے مختلف پہلوؤں کو پرکھ نہیں پاتے۔ مولانا آزاد کی سنجیدگی اور سلیبی ہٹی قوت فیصلہ کی وجہ سے ان کے سیاسی فیصلوں کو ایک طرح کی فزوقاتی حقیقت حاصل ہو گئی تھی جس سے دوست و مرہب تھے اور مخالف بدعوا اس۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی ترجیح مباحثوں میں ہی آگے بڑھ کر عقربا طیش میں کوئی نقطہ نہیں نکلا اور نہ

انہوں نے کبھی کسی پر الزام و حوالہ یہاں تک کر انہوں نے ان لوگوں کے خلاف بھی کسی غم و غصہ کا اظہار نہیں کیا۔ جنہوں نے ان کی بے عزتی کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ مولانا ہر قسم کے طوفانی حوادث اور اختلافات کے درمیان دروازہ نہیں کھراٹھے۔ اس ضبط و نظم کی وجہ سے وہ ایک بے پیراہہ شخصیت کے مالک ہو گئے تھے۔ مولانا کی اہمیت اور ادارے کی مقبولیت نے ان کے بدترہیب دشمنوں سے بھی خراج عقیدتیں حاصل کیا۔

یہ جو کہ مولانا آزاد کی شخصیت بیک وقت ایسی درخشش بھی تھی اور کم آمیز بھی، اس لئے ان کے بارے میں طرح طرح کی کہانیاں مشہور ہو جانا لازمی بات ہے۔ مثلاً یہ کہا جاتا ہے کہ مولانا نے جامعہ ازہر میں تعلیم حاصل کی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی تعلیم زیادہ تر گھر پر ہوئی۔ البتہ اپنی تعلیم ختم کرنے کے بعد وہ بعض نیک ستار کی حیثیت سے جامعہ ازہر گئے تھے۔ ایک دوسری کہانی یہ ہے کہ مولانا نے چین میں ہی ایک عالم کی حیثیت سے بے پناہ شہرت حاصل کر لی تھی۔ ایک مرتبہ اس زمانے کے ایک مشہور عالم سے کسی موضوع پر ان کی طویل خط و کتابت ہوئی۔ چھ ماہ بعد لے کر خواہش ظاہر کی کہ بالمشافہ گفتگو کے بعض مسائل طے کرنے چاہئیں چنانچہ جب فوجان مولانا اس بزرگ عالم کے پاس پہنچے تو انہوں نے ان کا غیر مقدم کیا اور تپا ک پوچھا کہ آپ کے پاس کیوں تشریف نہیں لائے آپ کو کچھ بھیج دیا اور ایک اور کہانی یہ بھی مشہور ہے کہ کسی جگہ مولانا کو خصوصی ممان کی حیثیت سے مدعو کیا گیا تھا مگر جب مولانا وہاں پہنچے تو انہیں اطلاع دیا جانے نہیں دیا گیا کیونکہ کسی کو یہ ہمتسار نہیں آ سکتا تھا کہ بے ریش لڑکا وہی مشہور عالم ہے جس کا سب لوگ انتظار کر رہے ہیں۔

قدرت اکثر مختلف لوگوں کو مختلف قسم کے انعامات سے نوازی ہے کسی کو جہانی طاقت عطا ہو جاتی ہے تو کسی کو ذہنی قوت۔ قدرت بعض لوگوں کو دھن دولت دیتی ہے تو بعض کو شہرت و عظمت عطا کرتی ہے، ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا ہے کہ سادے انعامات ایک شخص کو ملیں۔ مولانا آزاد ان چھ خوش قسمت انسانوں میں سے تھے جنہیں قدرت نے پورے طور پر وہ تمام چیزیں عطا کی تھیں جو ان کی ہر انسانیت کو رزق کرتا ہے۔ لیکن ان کے یہاں ایک تضاد بھی پایا جاتا تھا۔ چھ انسان و مانع مجھے سے قاصر ہے۔ وہ یہ کہ ان تمام انعامات کے ساتھ انہیں مآس فطرت بھی عطا ہوئی تھی اور ان کے دل میں انسانی کے دکھ درد کے لئے ہمدردی بھی تھی۔ چنانچہ اپنی ذاتی کامیابیوں کے ہوتے ہوئے بھی وہ اپنے چاروں طرف

اس قدر غلیظوں فضولیات اور نفرت کو دیکھ کر بے چینی رہتے تھے۔
مولانا آزاد جیسے شخص کے لئے مدد دہانے کی طرح ایک طرف کی تبتانی موسس
کرنے لگا۔ یہ امر تھا جو کوئی بھی کہہ سکتا تھا اس نے موسس کیا کہ مولانا مدد دہانے کی طرح
تھسا ہیں۔ مولانا آزاد جیسے غلیظ تھے اور ان کی شخصیت میں بے پناہ کشش
تھی۔ پھر بھی ان کی دنیا الگ تھلک تھی جس میں بہت کم لوگوں کا گزر سکتا تھا
وہ اپنے خیالات کی دنیا میں رہتے تھے اور اپنی طرح خدا داد کے بل بوتے پر دنیا کے

دکھ درد کو برداشت کرتے تھے۔ وہ انسانی دکھ درد کو بہت زیادہ محسوس کرتے
تھے، مگر اس کے ساتھ ساتھ ان میں قوتِ برداشت بھی تھی اور انسان کی بنیادی
اچھائی پر انہیں پورا اعتماد تھا جس کی وجہ سے وہ ہر طرح کی تکالیف میں اپنے آپ
کو سنبھالنے رہے۔ بنیادی طور پر وہ حکمت پسند تھے اور ان کا عقیدہ تھا کہ
ہر معاملے میں بالآخر غلطی اُپنی پر راہ ہوتا ہے۔ یہی ان کا ایمان تھا اور یہی
اس نسل کے لوگوں کے لئے ان کی وصیت۔

منظور علی متا فاروقی مجبوری

قطرہ تاریخ بایں وفات آزاد

۱۹۵۸ء

ہزار حیف لکھا ایک دھڑکتی ایسی یاد	برفت سوئے جہاں بھلے بٹے گل آزاد
دلالت پسیر آزاد رفت رو بہ کبر	چرخند کہ حیف جدا شد ز خانہ خانہ آزاد
دیرینہ رہبر مجلس بہ وقت نامسود	برفت و گرد و حل دوستاں ز غم ناشاد
زعیم عالی ہمت، نیک رائے، خوش تدبیر	کشادہ قلب و منظر، دور بین و دور افتاد
ادیب، نکتہ رس، دانا، علم و صاحب فن	کہ بود جنبش جنبش پیام علم و دانش
ہزار عقیدہ، شعلہ، زناغی تدبیر	بہ صد خلوص یہ فکر بسا گرفت و کشاد
ہمیں کہ قوم و وطن راز چھپے افراگ	یہ نسبت کہ او آزاد بود، کرد آزاد
بہ قول فیصل خود مطمئن بہ استقلال	بہ عزم کوہ گراں بار، ہر چہ بادا یاد
کچھ نہ بود بہ ایوان، مجال پرگشتن	ذباں بہ گفت و گو شش آمدہ، بجار شاد
وہاں زمان کہ بایں خلعت احتیاجش بود	ضیائے شمع ہدایت، دیرین رفت بہ باد
نشا، بادل غمگین، چہ چہم آشک شاد	میر تلاش جو بہستان فکر نہاد

برائے سال وفات ۱۹۵۸ء

۱۹۵۸ء

اگست ۱۹۵۸ء

۲۱

آغا گل دہلی (ابوالکلام بصر)

مولانا آزاد کی صحافتی عظمت

مولانا کی تمام ذہنی خصوصیات اور جامعیت فعل و کمال سے بہت کرمیں ان کی صحافتی عظمت و خصوصیت پر اظہار خیال بہت دشوار ہے۔ مولانا کے صحافتی بانی کا ذکر کرنا اور ان تمام عظیمائے فطرت کو نظر انداز کر دینا جو قدرت نے ان کے ذہن و دماغ میں ودیعت کئے تھے ممکن نہیں کیونکہ مولانا کی صحافت مہر حاضر کی اصطلاحی اور ٹیکنیکل صحافت سے بہت مختلف تھی۔ اتنی مختلف کہ اگر ہم اسے دوائے صحافت کسی اور چیز سے تعبیر کریں تو غالباً یہ تعبیر غلط نہ ہوگی۔

مولانا اپنی فطری افتاد، اپنے فکر و تصور، اپنے رجحانات و میلانات اور ذہنی اکتسابات کے تنوع کے لحاظ سے اس قدر غیر معمولی انسان تھے کہ بیک وقت نہ ہم ان کے جملہ فضائل و خصائص کا احصاء کر سکتے ہیں۔ نہ ان کے دماغ کو مختلف خانوں میں تقسیم کر کے ان کی ادبی، علمی، مذہبی و صحافتی خصوصیات کے درمیان کوئی حد فاصل قائم کر سکتے ہیں۔

لاڈلے جاسے سے ایک بار کسی نے پوچھا کہ صحافی بننے کے لیے ایک انسان کو کیا کیا کرنا چاہیے؟ انھوں نے جواب دیا: سب کچھ اور کچھ نہیں۔ یعنی صحافی دراصل وہ ہے جو دنیا کی تمام باتوں کو جانے، لیکن مابہر کسی کا نہ ہو۔ لیکن مولانا کی یہ عجیب و غریب خصوصیت کہ وہ بہت کچھ جانتے تھے اور جو کچھ جانتے تھے مابہر انہیں جیت سے جانتے تھے ایسی خصوصیت تھی جس کی نظیر دنیا کے صحافت میں نہیں مل سکتی ہے۔

مولانا کے فطری و کمال کا تنوع، ان کے مطالعہ کی وسعت ان کا پاکیزہ جمالیاتی ذوق اور ایک خاص قسم کا عالم نہ رکھ رکھاؤ۔ ان سب کا اتنا دلکش

امتزاج ان کے اندر پایا جاتا تھا کہ ہم ان میں سے کسی ایک کو دوسرے سے جدا کر ہی نہیں سکتے۔ گویا وہ ایک ایسا مکمل تھے جس کا کوئی جزو اس سے علیحدہ نہیں کیا جاسکتا۔

ہمارے سامنے اگر مختلف رنگ کے پھول علیحدہ علیحدہ رکھ دیجئے جائیں تو ہم ان کے رنگ نکھت پر علیحدہ علیحدہ اظہار خیال کر سکتے ہیں۔ لیکن اگر ان سب کا گلدستہ بن کر سامنے لایا جائے تو ہم اسے علیحدہ ہی کی حیثیت سے دیکھیں گے اور امتیاز رنگ و نکھت کا کوئی سوال ہمارے سامنے نہ ہوگا۔ بالکل ہی حال مولانا کے ذہنی اکتسابات کے تعدد و تنوع کا تھا کہ ہم ان کو ایک دوسرے سے علیحدہ کر ہی نہیں سکتے۔ خواہ وہ شعر و ادب سے متعلق ہوں۔ خواہ مذہب و حکمت سے وابستہ ہوں۔ خواہ صحافت و سیاست سے!

یہ بات کم لوگوں کو معلوم ہوگی کہ مولانا کی جو خصوصیات دنیا پر ظاہر ہو سکیں وہ ان سے بہت کم تھیں جو چھپی ہوئی رہ گئیں۔ حالاں کہ وہ بہت زیادہ ذہنی و گراں قدر تھیں۔ ہم نے مولانا کو اتنا ہی جانا جتنا وہ چاہتے تھے کہ ہم جانیں اور ان کی ہستی کے بہت سے امکانات دنیا پر ظاہر نہ ہو سکے۔

وہ امکانات کیا تھے ان کی تیرہ ویراحت آسان نہیں، تاہم جس حد تک میرے ذاتی ربط و علائقہ کا تعلق ہے میں کہہ سکتا ہوں کہ اگر ان کی زندگی ایک خاص سانچے میں ڈھل کر وہ نہ ہو جاتی جو ہمارے سامنے آئی تو وہ خدا جہانے کیا کیا ہو سکتے تھے۔ وہ اگر ہر شاعری کی طرف توجہ کرتے تو مثنوی و بدیع آزماں ہوتے۔ اگر وہ محض دینی و مذہبی اصلاح اپنا شعار بنا لیجئے تو اس عہد کے ابنِ نبیہ ہوتے۔ اگر محض علوم حکمیہ کے لئے اپنے آپ کو وقف کر

دینے والے اور ابن رشد اور ابن قیم سے کم درجے کے فقیہ و شیعہ نہ ہوتے۔ اگر وہ تارسی شرفادب کی طرف متوجہ ہوتے تو عربی و فطری کی صف میں انہیں جگہ ملتی۔ اگر وہ تصوف و اصلاح اخلاق کی طرف مائل ہوتے تو غزالی اور رومی سے کم نہ ہوتے۔ اور اگر وہ مسلک اعتزال اختیار کرتے تو دوسرے واصل بن عطا ہوتے۔ واصل بن عطا کا ذکر آیا ہے تو اس کے بحر علمی کا بھی ایک لطیفہ سن لیجئے۔ یہ پیدائشی تو تلا تھا جہ عربی میں انش کہتے ہیں۔ مے کا لفظ وہ صحیح ذکر سکتا تھا۔ لیکن اس کی ذہانت اور لسانی مہارت کا یہ عالم تھا کہ جب وہ کسی مجمع میں تقریر کرنے کھڑا ہو جاتا تو وہ کوئی لفظ ایسا استعمال ہی نہ کرتا جس میں رسے پائی جاتی ہے۔ ایک بار اس سے کسی نے پوچھا اگر تم کو یہ کہنا ہو کہ وہ گھوڑے پر سوار ہوا اور اپنا نیزہ تانا تو کیا کہو گے۔ عربی میں اسی مفہوم کو یوں ادا کریں گے۔ ”رکب علی فرسہ و جرد و فرسہ“ اس میں چار جگہ رسے آتی ہے۔ واصل نے کہا کہ میں اسے یوں کہوں گا۔ ”استلوی علی جواد و لا مسجعا علیہ“ غیریہ تو ایک دل چسپ بات تھی جس کا ذکر صفحہ ۱۱۱۱۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ مولانا آنا کو زبان پر اتنا ہی عبور حاصل تھا۔

مولانا عجیب و غریب داعی ملتیں سے کر پیدا ہوئے تھے۔ جن کو ماننے یا خود ان کی خلوت پسند طبیعت نے ابھرنے کا موقع نہ دیا اور آج ہم نہیں صرف اہل اللہ و البلاغ کے رئیس القریہ یا تذکرہ اتر جان القرآن اور فہرست کے مصنف ہونے کی حیثیت سے جانتے ہیں وہ نہ حقیقت یہ ہے کہ وہ اس صدی کے مجدد ہونے کی تمام صلاحیتیں اپنے اندر رکھتے تھے۔

مولانا کے حالات زندگی اور ان کے امیال و محاط سے بحث کرنا ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ وہ نہ یہ حکایت لذیذ و راز پر ہو جاتی۔ لیکن اگر ہم محض ان کی صحافتی زندگی سامنے رکھیں تو بھی اس کی بولمونی اور بولبھبی ایسی نہیں کہ اس سے سرسری گزرا جاسکے۔ کیونکہ یہی ایک ایسا ذریعہ ہے جس سے ہم نے ابوالکلام کو پہچانا اور اگر زمانہ مسافرت کرتا اور ان کے صحافتی مشاغل جاری رہتے تو ہم نہیں کہہ سکتے کہ ان کے اور کون کون سے فرائض کام نہ بروئے کار آتے اور آج کتنا بڑا ذخیرہ علم و ادب کا ہمارے سامنے موجود ہوتا۔

مولانا کی فطری اہلیت و صلاحیت اقدامت کا ایک سرمدراز تھی جس کے بعض گوشے تو ہمارے سامنے آگئے اور اکثر بے نقاب نہ ہو سکے۔ آگے

ایک سبب تو زمانہ کے حالات تھے جنہوں نے ان کو اپنے ذوق کی پوری وسعت سے کام لینے کا موقع نہ دیا اور دوسرا سبب ان کی فطری خلعت پسندی و کم آمیزی تھی۔ وہ نام نہاد اور شہرت سے گریز کرتے تھے اور برہانے متانت و خودداری وہ بے تکلفی میں بھی وہ اپنی شان گرامیگی مات سے نہ جانے دیتے۔

مولانا کے دو صحافت کی تاریخی تقیین دشوار ہے۔ کیونکہ ہم سمجھ نہیں سکتے کہ اس کا آغاز کب سے سمجھا جائے۔ مولانا کی علمی و صحافتی زندگی کے سلسلہ میں رسالہ قرآن، اخبار دیکل اور اللہ کا بھی ذکر کیا جاتا ہے۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ اس کی ابتدا سان الصدق کے اجراء سے ہوتی ہے۔ جسے انہوں نے خود جاری کیا، خود مرتب کیا اور خود ہی بند کر دیا۔ جس کا سبب غالباً یہ تھا کہ جس فضا و ماحول میں رہ کر اسے جاری کیا گیا تھا وہ مولانا کے لطافت و تنگ تھی اور بہت سی ایسی باتیں جنہیں وہ زیادہ کھل کر کہنا چاہتے تھے نہ کہہ سکتے تھے۔ یہ زمانہ مولانا کی بہت کم سنی کا تھا۔ اتنی کم سنی کا کہ اس عمر میں لوگ اپنی تعلیم بھی ختم نہیں کر چکے۔ کسی مظلوم قدم اٹھانے کا کیا ذکر ہے لیکن مولانا کی غیر معمولی ذہانت اور قبل از وقت پختگی ذہن و دماغ نے ان کے مستقبل کو بھی حال میں تبدیل کر دیا تھا اور لوگ اس مستقبل کی درختانی کو دیکھ کر حیران تھے۔

اس کے بعد جب مولانا شبلی کے ارہار پر اللہ کی اداوت اپنے ہاتھ میں لی تو فضا و سربس تھی، ماحول کچھ اور تھا۔ معاشرہ ام کا نہیں خواہ کا تھا اور خواہ بھی جلالت علماء کا، لیکن مولانا نے اپنی انفرادیت کا اعتراف کر اسے بغیر ان کو بھی نہ چھوڑا۔

علامہ رشید رضا اڈیرٹانایک عظیم الشان اجتماع میں جو بڑے بڑے علماء پر مشتمل تھا تقریر کرنے جا رہے ہیں اور فرودت ہے ایک ایسے شخص کی جو عربی و اردو دونوں کا ماہر ہو اور ان کی عربی تقریر پر محل ترجمہ کرتا جاسکے مولانا شبلی کے منصب سے یہ بات فرود تھی کہ وہ خود اس خدمت کو انجام دیں اس لئے وہ اس باب میں بہت متفکر تھے۔ آخر ترجمہ قیس کوئی اور نہ آیا بروئے کار۔ مولانا ابوالکلام نے نکلانہ سامنے آجاتے ہیں اور اس خدمت کو اتنی خوبی و دل کشی سے انجام دیتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے وہ ترجمہ نہیں بلکہ خود تقریر کر رہے ہیں۔

یہ تھا مولانا کی دہانت و قابلیت کا پہلا عینی مظاہر جسے کھلے اسٹیج پر سیکرٹری
 دہلیان فکس و گمال نے دیکھا اور اسی وقت سے وہ حاسد و زلیخہ دو انشیاں
 شروع ہوئیں جنہوں نے مولانا کو نمودہ و اہل نمودہ سے بے زار کر دیا۔ علاوہ
 اس کے وہ یوں بھی اپنی موجودہ خدمت سے خوش نہ تھے۔ کیوں کہ اندوہ
 ایک خاص تعلیمی ادارہ کا آرگن تھا۔ مولویوں کا پرچہ تھا۔ جن کی باہمی زبٹوں
 سے وہ تنگ آ چکے تھے اس لئے انہوں نے اس خدمت سے ہاتھ اٹھا
 لیے۔ تاہم اس وقت ناخوشگوار میں بھی انہوں نے اندوہ کو جس بلندی
 تک پہنچا دیا وہ اندوہ کا دور نہ تریں کہا جاتا ہے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب مولانا کی خطیبانہ شہرت بھی ملک میں عام ہوتی
 جا رہی تھی اور ان کے اندر زیادہ آزادی، زیادہ بلند آہنگی کے ساتھ کام
 کرنے کا دلور تیزی سے ابھر رہا تھا۔ چنانچہ آپ لکھنؤ واپس گئے اور
 وہاں سے اہلال جاری کیا جس کی خصوصیات سے آج ہر شخص واقف ہے۔
 اہلال کے اجراء سے قبل مولانا کی صحافت زیادہ تر علم و مابین ملک
 محدود تھی اور بہت گھٹی گھٹی سی تھی۔ لیکن اس کے بعد جب وہ صحیح طور پر
 میدان صحافت میں آئے تو اس شان سے کہ افقی صحافت پر ایک نیا آفتاب
 طلوع ہو رہا تھا اور اک نئی گرمی ہمارے دلوں میں پیدا ہو رہی تھی۔

مولانا کا رجحان سیاست کی طرف کب اور کیوں کر ہوا اس کی صحیح
 تاریخ متعین کرنا مشکل ہے لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ اس کی ابتدا اسی وقت ہوئی
 جب معمر کے جامعہ اندہر میں انھیں جمال الدین افغانی اور محمد عہدہ کی تحریک
 آزادی کے لڑچکر کے مطالعہ کا موقع ملا۔ اس کے بعد جب وہ ہندوستان
 واپس آئے تو یہ چنگاری اپنے مہینے میں لے کر آئے اور پھر رفتہ رفتہ اس
 کی حدت و تیزی بڑھتی گئی اور آخر کار شعلہ بھولہ بن کر اہلال کی صورت میں
 ہمارے سامنے آئی۔

جس وقت اہلال جاری ہوا ہے اس وقت ہندوستان ذہنی
 اضطراب کے بڑے تازک دور سے گزر رہا تھا اور روس نے زمین کی دوسری
 تومن میں بھی سخت انتشار پیدا کیا۔ ملکیت کہیں دم توڑ چکی تھی اور کہیں
 انجیالا لے رہی تھی۔ استقرائیت و استعاریت اپنے بقا و تحفظ کے لئے
 ناخن و چنگن کی پوری قوت صرف کر رہی تھی۔ ڈاکر سی کی مدنی حکومتوں
 کے چہرے بے نقاب ہوئے جا رہے تھے اور قومی آزادی و خودداری کا

احساس بڑے آزمائشی دور سے گزر رہا تھا۔ برطانوی مستعمرات کا نظریہ
 ختم تو نہ ہوا تھا۔ لیکن اس سورج کو گہن لگنا ضرور شروع ہو گیا تھا اور
 وہ اپنے بقا و تحفظ کے لئے آئینیں پرٹھائے ہوئے ہر انسانیت شکن
 اقدام پر آمادہ تھا۔ ہندوستان میں کانگریس آزادی کا بیج بونچ چکی تھی۔ اس کے
 کچے بیج پکے تھے۔ لیکن انگریز یہ طے کر چکا تھا کہ وہ اس پودے کو کبھی
 بارہودہ نہ ہونے دے گا اور جماعتی تعزیری پیداکر کے ملک کی ذہنیت کو وہ
 متضاد حصوں میں تقسیم کر دینا چاہتا تھا۔ مسلم لیگ وجود میں آچکی تھی لیکن
 مسلمانوں کی ذہنی رفتار ہندوؤں سے مختلف تھی ان کے سامنے ملکی مسائل
 ثانوی حیثیت رکھتے تھے۔ ان کی نگاہیں ترکی، بلقان و وٹارلس پر لگی ہوئی
 تھیں اور مرستی کی تعلیمات نے جو وقار انگریزوں کا مسلمان کے دل میں
 پیدا کر دیا تھا وہ بڑی حد تک اپنی جگہ قائم تھا۔ ہر چند مسلمانوں میں ایک ایسی
 جماعت بھی تھی جو انگریزوں سے مغرب ہو چکی تھی لیکن یہ انحراف و اختلاف
 داخلی نہ تھا، خارجی تھا، فاعلی نہ تھا۔ انفعال تھا۔ وطن سے اس کا تعلق
 نہ تھا بلکہ مذہب و مذہبیت سے تھا۔ ملکی ریاست سے نہیں بلکہ ترکی کے
 انقلاب، بلقان و وٹارلس کی تباہیوں اور مذہبی لامرکزیت کے احساس سے
 تھا۔ اس لئے ٹھیک اسی وقت جب کہ کانگریس اجتماعی تحریک آزادی
 کی بنیاد میں استوار نہ رہی تھی۔ مسلمان پن نفوس کو چھوڑ کر سب کے سب
 بیرون ہند کے مسائل میں الجھے ہوئے تھے۔ جس کا تعلق زیادہ پان اسلام
 کی تحریک سے تھا۔

اس وقت ہندوستان میں مسلمانوں کے دو قابل ذکر اخبار جاری
 تھے۔ ایک زمیندار، دوسرا مسلم گزٹ، زمیندار کی توجہ تمام تر ترکی پر مرکوز
 تھی اور اس کا عظیم ترسیل منہد شہدائے بلقان کے پسماندگان کے لئے چزدہ
 جمع کرنا تھا۔ اندرون ملک کے معاملات اور یہاں کی داخلی سیاست سے
 اسے بہت کم و لی جپی تھی۔

مسلم گزٹ کے اڈیٹر مولانا وحید الدین علی سلیم، مولانا حالی کے عزیزوں
 میں تھے اور قدرنا انھیں سرمد تحریک سے دل چسپی ہونا چاہیے تھی لیکن
 یہ کہنا غلط ہوگا کہ وہ علی گڑھ یا مسلم لیگ کا آرگن تھا تاہم اس میں کام نہیں
 کر وہ مسلمانوں کا جماعتی اخبار تھا اور سیاست میں اس کا نقطہ نظر ملت پرستی
 ہو تو ہو لیکن خالص وطن پرستی یقیناً نہ تھا۔ وہ آزادی کا محرک معاصرین ضرور

لیکن خطوط پر جو مسلم لیگ کے پیش نظر تھے وہ انگریزوں سے خوش نہیں تھا۔ لیکن اسکی برہمی نہ جارحانہ تھی نہ عریضہ بلکہ اس کا انداز ایک ایسے دوست کا ساتھ جو دوست ہے مرنے منائے جانے کی توقع پر۔

یہ تقادہ ماحول۔ یہ تھے وہ حالات، یہ تھی مسلمانوں کی عام ذہنیت جب مودہ آنا آنا دے اہلال جاری کیا اور اس شان کے ساتھ مصافحت کا تمام اگلا پچھلا مقصود ہمارے ذہن سے ہو گیا اور ہم سوچنے لگے کیا یہ اواز ہماری ہی دنیا کے کسی انسان کی ہے۔ کیا یہ زبان ہمارے ہی انیلے جنس میں سے کسی فرد کی زبان ہے۔

ڈاکٹر طہ حسین نے اپنی مشہور کتاب "الفتنۃ الکبریٰ" میں صدر اسلام کی حکومت پر بحث کرتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے کہ وہ ملکیت تو یقیناً نہ تھی کیونکہ شخصی استبداد کا اس میں مطلقاً جوڑ نہ تھا۔ ہم اسے استعراطیت بھی نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ استعراطیت یا جماعت اشراف کی کوئی حکومت دنیا میں ایسی نظر نہیں آتی جس نے سماجی مساوات اور عدل و انصاف کی اتنی سخت پابندی کی ہو جتنی اسلامی حکومت کے ابتدائی دور میں کی گئی۔ ہم اسے ڈیموکریسی یا جمہوریت بھی نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ خلفاء اسلام کا انتخاب جمہور کی رائے سے نہ ہوتا تھا۔ ہم اسے اشتراکیت یا اشتہائیت بھی نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ اس نے شخصی و انفرادی رائے کی آزادی کو نہیں چھینا۔ اس لئے ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ ابتداء میں اسلام کی حکومت خالص عربی اسلامی حکومت تھی جو خود مسلمانوں ہی نے وضع کی اور جس کی نوعیت حکومت کی تمام دوسری حکومتوں سے بالکل علیحدہ تھی۔

میں جس وقت مولانا ابوالکلام کی مصافحت پر غور کرتا ہوں تو میں بھی کچھ ایسا محسوس کرتا ہوں کہ وہ مغربی انداز کی مصافحت تو یقیناً نہ تھی کیونکہ اس میں شاذ و خطابت قطعاً نہیں ہوتی۔ مشرق میں البتہ بعض عربی مسائل و اخبارات کالب و ہر خطیبیاد ہوتا ہے۔ لیکن ان میں وہ تنوع نہیں پایا جاتا جو اہلال میں نظر آتا ہے۔ خود ہندوستان میں البتہ زمیندار ایک بلکہ بانگ۔ اخبار تھا۔ لیکن اس میں اہلال کی سی گہرائی و سنجیدگی اور علمی وزن کا فقدان تھا۔ مسلم گزٹ کے لب و لہجہ میں بے شک ایک قطعیت تھی لیکن اس کا خطاب صرف عوام سے تھا عوام ہی کی زبان میں اور کوئی دوسری خصوصیت اس میں نہیں پائی جاتی تھی۔ اس لئے مولانا آزاد کی مصافحت کے متعلق بھی ڈاکٹر

طہ حسین کی زبان میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ ان کی مصافحت خود ان کی اپنی مصافحت تھی جسے خود انہوں نے ایجاد کیا اور جو انہیں کے ساتھ ختم ہو گئی۔

مولانا نے اہلال بہت سوچ سمجھ کر جاری کیا تھا اور ملک کے حالات کے نہایت خاطر مطالعہ کا نتیجہ تھا۔ وہ یہ فیصلہ تو اہلال کے اجراء سے قبل ہی کر چکے تھے کہ ملک کو آزاد ہونا چاہیے۔ اور فرنگی تسلط کو ختم، لیکن اسی کے ساتھ وہ اس حقیقت سے بھی بے غور نہ تھے کہ اس فیصلہ پر عمل کرنا بچوں کا کھیل نہیں اور یہ وہ راہ ہے جس میں شرط اول قدم آخری رستہ کہ جنہوں پر پائی وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ جب تک ملک میں اجتماعی حیثیت سے ایک عام و

مشترک جذبہ و وطنیت پیدا کر کے مذہب و ملت کے اختلاف کو نہ مٹایا جائے حصول مقصود ممکن نہیں۔ ملک کی آئندہ سیاست کا ہدف نشر ان کے سامنے تھا اس کا تقاضا یہ تھا کہ تعمیر سے پہلے عملی تخریب سے کام لیا جائے۔ کیونکہ مولانا کا نظریہ یہ تھا کہ جب کوئی وطن بچا جاتا ہے تو اس کی اصلاح و مرمت ممکن نہ ہو تو ضرورت اس امر کی ہے کہ پہلے اس کو بچا کر دیا جائے اور پھر از میر و تعمیر کی جائے۔ وہ پرانے غٹے ہونے نقوش ادا کیے خطوط پر تعمیر کے قائل نہ تھے بلکہ وہ ان کو مٹا کر نئی داغ بیل پر مدامت قائم کرنے کے قائل تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ جب ذہن انسانی رسوم و رواج سے اس حد تک داغدار ہو جائے کہ اس کی اصلاح ممکن نہ ہو تو بہتر صورت یہی ہے کہ پہلے اس کے پرانے نقوش کو مٹایا جائے اور ذہن و دماغ کو صفحہ مادہ بنا کر اس پر دوسرے نقوش قائم کئے جائیں۔

یہی وہ اصول کار تھا جس کے پیش نظر انہوں نے سب سے پہلے مسلمانوں کے ذہن سے سید احمد غانی نقوش مٹانے کی کوشش کی کیونکہ وہ جانتے تھے ہندوستان اس وقت تک آزاد نہیں ہو سکتا جب تک یہاں کی تمام آبادی بلا امتیاز ملت و مذہب، بلا امتیاز نسل و رنگ کسی ایک عرض مشترک پر متحد و متفق نہ ہو جائے اور یہ اشتراک ذہن و عمل ممکن نہ تھا جب تک مسلمان ہندوؤں سے کٹ کر اپنے جداگہ مستقبل کی تعمیر کا خیال ترک نہ کریں اور اس ماہ میں سب سے زیادہ پھر وہی ذہنیت تھی جس نے مسلمانوں کو انگریز کے رحم و کرم پر جینا سکھایا اور جو باوجود تلخ تجربات کے اب تک اپنے جذبات نیایش ہی کو معمولی مقصود کا بیج ڈر رہے سمجھتے تھے۔

پھر آپ اہلال کے دور اول کے پرچے اٹھا کر دیکھئے تو آپ کو معلوم

ہوگا کہ مولانا نے کس کس پہلو اور کس کس زاویوں سے اس ذہنیت کو توڑنا چاہا
 ہندو گھس جھٹک اس میں کامیاب ہوئے۔ جیسا کہ میں ابھی ظاہر کر چکا ہوں
 نہ بڑی بڑی بیاہنجائی کا زمانہ تھا۔ محنت ذہنی خلبان کا دور تھا اور مولانا کے سطح
 مکن نہ تھا کہ وہ ان غیر ملکی مسائل کو نظر انداز کر دیتے جس سے براہ راست یا
 واسطہ مسلمانوں کے اذہان متاثر ہو رہے تھے۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ اصل
 نصد کی تبلیغ کے ساتھ ساتھ انھوں نے طرابلس و بلقان کے مسائل پر بھی
 بادل غمگسٹوں کی ترکی کی اندرونی کشمکش اور اس کے نوچنچاں انقلاب پر
 ہی واضح روشنی ڈالی اور جو بے حد کافی پور کا سادہ پیش آیا تو اس پر بھی
 بے قلم کی پوری قوت صرف کر دی۔ چہرے سب کچھ اس لئے نہ تھا کہ وہ مسلمان
 تھے، ورنہ ان مسائل کا تعلق اسلام و اسلامیات سے تھا بلکہ اس سے متعصوب صرف
 ظاہر کرنا تھا کہ جب کسی قوم پر بیرونی قوتیں مسلط ہو جاتی ہیں تو اس قوم کا
 باعزت ہونا ہے اور اسے کھتہ ذہنی و جسمانی دکھ جھیلنا پڑتے ہیں۔

مولانا کے سامنے ہی کانگریس نے اپنا کام شروع کر دیا تھا اور وہ اس کے
 رالم و اوقات سے بے خبر نہ تھے۔ اسی طرح وہ مسلم لیگ اور اس کے غلبہ پسین
 سے بھی واقف تھے اور چاہتے تھے کہ یہ دونوں ادارے کسی طرح ایک ادارہ
 میں تبدیل ہو جائیں اور مسلم لیگ بھی کانگریس کے اصول پر اپنا لاغور عمل ترتیب
 دے۔ چنانچہ اہللال کا اولین وفد اسی سہی و کوشش کا دور تھا کیونکہ
 ان کی انتہائی خواہش یہ تھی کہ وہ کانگریس میں تہہ شریک نہ ہوں۔ بلکہ اپنی ساری
 اہم کو سامنے لے کر شریک ہوں۔ لیکن وہ اس میں خاطر خواہ کامیاب نہ ہو سکے
 اور عہدہ راہنہیں تنہا کانگریس میں شامل ہونا پڑا۔

مولانا، بناء ملک اور بالخصوص مسلمانوں کے ذہن تک جو جس راہوں
 پہنچنا چاہتے تھے ان میں سب سے زیادہ واضح اور روشنی راہ مذہب
 تھی۔ چنانچہ آپ اہللال کا خائن اٹھا کر دیکھتے تو معلوم ہوگا کہ دنیاوی سیاست
 تعلیم کے سلسلہ میں ذہنی و اخلاقی اصلاح کا کوئی پہلو ایسا نہ تھا جس کی تائید
 میں انھوں نے قرآنی دلائل پیش نہ کئے ہوں اور مسلمانوں کی ہدایت کے لئے
 حکام اہل کی محنت سے کام نہ لیا ہو۔

دوسری راہ جو مسلمانوں کے کچھ اور فطری ذوق کے لحاظ سے اچکے
 یادہ قابل قبول ہو سکتی تھی ادب و انشا کی راہ تھی۔ سو اس باب میں بھی
 اہللال کی یہ خصوصیت کہیں فراموش نہیں کی جاسکتی کہ اس نے آنتار بھیرہ

شعر و ادب کا فراہم کر دیا کہ اگر آج تمام مشہور شعراء فارسی کا کلام دنیا سے گھر
 جاتے تو بھی اس کا ایک بڑا مسترا آفتاب آپ اہللال کی مدد سے پیش کر سکتے ہیں
 مولانا کی صاف فطرت کا تعلق کسی ایک پیر سے نہ تھا بلکہ اس کی تشکیل متعدد
 عناصر سے ہوئی تھی جن میں ایک بڑا زبردست عنصر ان کی فیر مہمونی قوت حافظہ تھی
 غالباً شاعر کی بات ہے کہ انھوں نے مجھے کلکتہ سے دہلی جاتے ہوئے
 تارو دیا کہ میں ان سے دہلی میں ہوں۔ وہ حاذق الملک حکیم اجمل خان کچھ جواد
 بمیل میاں کی تقریب شادی میں شرکت کی غرض سے دہلی آ رہے تھے۔ یوں تو
 باہمی مراسلت اور میری نغموں کے ذریعہ سے جو اہللال میں شائع ہوتی رہتی
 تھیں میں مولانا سے فیر متعارف نہ تھا لیکن ذاتی ملاقات کا موقع نصیب نہ
 ہوا تھا۔ جس اس فرصت کو غنیمت سمجھ کر رخ پور سے دہلی پہنچا اور کامل ایک
 ہفتہ تک ان کی معیت کی سعادت مجھے نصیب ہوئی۔ اس دوران میں ادب
 مذہب و سیاست سے متعلق کوئی موضوع ایسا نہ تھا جس پر مولانا سے تبادلہ
 خیال کا موقع مجھے نہ ملا ہو اور میں ان کی قوت حافظہ و استدلال کو دیکھ کر
 دنگ نہ رہ گیا ہوں۔

ایک بار حکماء اسلام کے سلسلہ میں اہل غلیل کا ذکر آگیا تو مولانا نے اس
 کی مشہور کتاب "حق بین یقظان" کی پوری داستان ایک نشست میں اس طرح
 سنائی گویا وہ اس کے حافظ تھے۔ ایک دوسری صحبت میں جو سیاست سے
 شروع ہوئی اور ادب پر ختم ہوئی اس سے زیادہ دل چپ تھی۔ انسانی کے
 فطری احساس آنا دی اور ضمیر انسانی کی بے اختیار پکار کے سلسلے میں، میں نے
 کہا کہ اس کے مظاہر انتہائی متضاد ماحول میں کہیں کہیں سامنے آ جاتے ہیں۔ عرفی
 مدحیہ تصدیق لکھتا ہے اور جب وہ ذہن انسانی کا تجزیہ تعمیر اشعار کے ذریعہ
 سے کرتا ہے تو ایک شعر بے اختیار اس کے قلم سے ایسا بھی نکل جاتا ہے
 جسے عہد حاضر کی اشتراکیت پسندی اور سرمایہ و عمل کے تضاد کی بنیاد کہنا
 چاہیے۔ کہتا ہے۔

بزوبہ باز و پر نفع کا سیان ضعیف

ہر چین ابرو بے وجہر خواہ گان کبیر

حیرت ہے کہ منلیہ دور طو کیت و استبداد میں یہ خیال عرفی کے ذہن میں آئے
 پس شکر مولانا کے چہرہ پر ایک رنگ آگیا اور وہ اس موضوع پر کچھ کہنے ہی
 واسطے تھے کہ ناگہاں ایک صاحب اور آگئے اور مولانا نے گفتگو کا سیاسی

پہلو چل کر اسے ادبی رنگ میں تبدیل کر دیا اور فرمایا کہ اس میں شک نہیں
عرفی کا یہ قصیدہ اس کا شاہکار ہے اور اس کے تمام قصیدہ اشعار اس طرح
مناظر اور کئے گویا کتاب ان کے سامنے کھلی رکھی تھی۔

مولانا کا حافظہ اس میں شک نہیں عجیب و غریب خدا داد و ولایت
تھی اور مولانا کی صحافتی و علمی زندگی کی کامیابی بہت کچھ اسی اعلاہم خداوندی
کی نعمتوں تھی۔ اسی کے ساتھ دوسری خصوصیت جس نے ابلاہل کو سراہا
کمال تک پہنچایا وہ مولانا کا مخصوص اسلوب تحریر تھا۔ بہت کم ایسا دیکھا گیا
ہے کہ ایک شخص تحریر و تقریر دونوں پر یکساں قدرت رکھتا ہو لیکن وہ اس
باب میں ذوالریاستی ہوئے کی حیثیت رکھتے تھے۔

مولانا کے اسلوب تحریر و تقریر کی دو خصوصیتیں ایسی تھیں جو کبھی ان
سے منہک نہیں ہوئیں۔ ایک اس کی بند ادبیت، دوسری اس کی شانِ خطا
کہ جب ہم ابلاہل کو پڑھتے ہیں تو ایسا محسوس کرتے ہیں کہ کوئی شخص کسی بلند
منادہ پر کھڑا ہوا پر جوشِ خطبہ دے رہا ہے اور ایک بے پناہ ذخیرہ الفاظ
کا اس کے پاس ہے جسے وہ موتیوں کی طرح بکھیرتا جا رہا ہے۔ اس میں شک
نہیں مولانا ایک ایسی عجیب و غریب طرزِ تحریر کے موجد و مخترع تھے کہ نہ
اس سے قبل اس کی کوئی مثال دیکھنے میں آئی اور نہ اس کے بعد کوئی شخص
اس کی تقلید کی جرأت کر سکا۔

ابلاہل کے بعد جب مولانا نے ابلاغ جاری کیا تو اس کا نصب العین
بھی وہی تھا جو ابلاہل کا لیکن طریق ابلاغ کچھ مختلف تھا تو وہی تھے لیکن نثر
دوسرا تھا، اندازِ نثر وہی تھا مگر لباس بدل ہوا تھا۔ ابلاہل غنیمتِ علمی کا درس
تھا اور ابلاغ غنیمتِ ذہنی کا ابلاہل برکت و عمل، جوش و ولولہ کا پیام تھا
تھا اور ابلاغ فکر و بصیرت اور روحانی عزم و ثبات کا ابلاہل کا پیام تھا۔
"شیر شو، شیرانہ در محرائے شیران پائے نہ"

اور ابلاغ کا: "جلوہ بر خود کنی و خود را بہ نگاہ دریاپ"
ابلاہل۔ خونِ منصور کی شعلہ آہنگی تھی اور دعوتِ دار و رسن، ابلاغ
بشارتِ روحانی تھی اور پیامِ طاغوتیت شکن۔

ابلاہل۔ عرفی کی زبان میں نویدِ سرخروشی تھا کہ
برہیلہ خونیں ہنس نہ نصایاں
مشو گدائے شبانان کہ شیر می دشنند
اور ابلاغ۔ بیدل کی زبان میں پیام تھا: "خونے پہ جگر جمیع کسں دروں آسکا"

ابلاہل ایک کھلا ہوا چیلنج تھا۔ ایک بے باکانہ اعلان کہ
ناؤک دلائی باغ تو چون شبنم سر
برہیلہ بیک گل شکن۔ آگینہ با
اور ابلاغ نہایت بلیغ درس تھا اس حقیقت کا کہ
دلِ گمشدہ مرا سے نہتِ نکیفیتِ شوق
نشرہ پلا گر از دست رود شیشہ زما

بات وہی ایک تھی لیکن فرق صرف اتنا تھا کہ ابلاہل نے دامنِ گناہ
چاک کیا اور ابلاغ نے اس چاک سے نظارہ پر تو ماہ کی دعوت دی۔
ابلاہل مولانا کی تمام خصوصیات ذہنی کا ایک ایسا رنگین دستہ گل
تھا جو بیک وقت اخبار بھی تھا اور قد اول کامیگزین بھی جس میں سیاسی
مقالات، علمی و تاریخی مضامین، مذہبی و ادبی مباحث، مطاببات، مظلومات
نظر وہ سب کچھ پایا جاتا تھا جس سے ہر ذوق انسانی آسودہ ہو سکتا ہے
اور ہر اپنے ہوا یا خلا پھوٹ گیا جس کا پڑ ہونا ممکن نہیں اور ابلاغ ایک
مذہبی تبلیغی آرگن تھا جس کا خطاب زیادہ تر مسلمانوں سے تھا تاکہ ان کے
ذہن و دماغ سے رسم و روایات کے نقوش کو کر کے ان کو صحیح تعلیم قرآنی سے
آشنا کیا جائے اور وہ سمجھ سکیں کہ اسلام کا حقیقی مقصد و انسانیت پرستی
سوا کچھ نہیں اور جو دماء و مرد حرم ہر جا کیم بطلانِ آستان رسد ملتا ہے۔

اس طرح ہم مولانا کے نمایاں صحافت کو تین ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں
ایک وہ جو عزائم، اخبار وکیل اور لسان الصدق سے تعلق رکھتا ہے۔ دوسرا
دور ابلاہل کا اور تیسرا ابلاغ کا۔ دورِ اول خاص علمی تھا۔ دوسرا سیاسی
اور تیسرا مذہبی و اصلاحی اور ان تینوں زمانوں میں انھوں نے جو کچھ لکھا وہ
ان کی انفرادیت و "انائیت" کا بڑا زبردست مظاہر تھا۔ میں نے "انائیت"
کا لفظ قصداً استعمال کیا ہے کیونکہ ان تحریروں میں جو خود اعتمادی و کیفیت
ایقان پائی جاتی تھی وہ صرف فقط "انائیت" ہی سے ظاہر ہو سکتی ہے جس
میں منطقی چوں و چرا اور استدلالی "ابن و ان" کی کوئی گنجائش نہیں۔

مولانا کے دینی و ملی مقالات کا فاضلہ لب و لہجہ، سیاسی مضامین کا
مجاہدانہ قیادانہ انداز، مذہبی افکار کا حکیمانہ اسلوب اور اسی کے ساتھ ان کی
خطبات بلند آہنگی، سرسبز و رجز خوانی، مرد مجاہد کا سا اذعان و ایقان، انہوں کی
سازن و قرار جس نے ہم کو نیا دلوں کی سیات، نیا جوشِ زندگی بخشا، اب کہاں؟
اک دھوپ تھی کہ ساتھ گئی آفتاب کے

ماہِ آزاد

ہوئے آزاد اے بھارت کے لعلِ شہنشاہ
بہلایا تیرے خونِ دل سے آزادی کا مارغ
اے آزاد اے قومِ سیاست کے دماغ
تجھ کو تربیت میں مبارک آج لکھتے فرارغ

کارواں چائے کدھراپ رہبری کے واسطے

ذہن بچکے پھر رہے ہیں روشنی کے واسطے

ہند کی تاریخ کا تو مستقل اک باب تھا
کچھ دنوں تک سب جیسے دیکھا کئے وہ خواب تھا

سینہ بند دستاں کا شعلہ و شاوَاب تھا
ذہنیت کرسی و زیبِ منبر و عراب تھا

کیوں نہ تجھ کو اک چین، اک بزمِ رندان کہیں

اک ادارہ اک دبستان اک کتب خانہ کہیں

یہاں نقشِ ادب اک نقشِ پائے اعتبار
سرمدِ چشمِ بھیت تیری خاطر کا اعتبار

تیرا آہنگِ خطابت جوشِ قلم در کنار
کچھ سمندر کا جلال اور کچھ پہاڑوں کا وقار

نبھت میں دھک تیرے لبِ گفتار سے

دھڑکنیں دل کی معینِ وقت کی رفتار سے

فلسفے کی روح گھل کر جانِ میخانہ بنی
شوخی و تفسیر پر سے تاریخِ افسانہ بنی

خاموشی محفل میں کیفیت و کم کا بیانہ بنی
سیدہ چاکی گیسوئے الہام کا شانہ بنی

ایک بے تابِ حسیں سے تابہ تھی نہ ہے آج

سوزِ دل تیرا متاعِ متع و پروا ہے آج

مرحبا اے ساتھیِ کثرت و نشاطِ حریت
ذہنِ مستقبل میں تجھ سے انبساطِ حریت

مرحبا اے مجلسِ آراء بساطِ حریت
کس قدر باریک و نازک حقِ مرا بظہرِ حریت

پائے ہمت کو ترے دی اک غلشِ ہر خانہ

چن لے لے گئے بیاباں سے تری رفتاری

آستانوں سے اٹھائی تو نے تہذیبِ سجود سر بلندوں کو سکھائی تو نے تعظیمِ حدود
یکوں نو رخ پر دمِ گم ہوں تیری آیاتِ شہود تو نے خود مقصد پہ تو باں کر دیا حُبِ نمود

روشنی کیونکر پہنچتی ارکہ میں روس میں
شیعہ تو جلتی رہی تا زندگی فانوس میں

وقت کو تو نے دیا اک شوخِ آہنگِ خرام جوش کو سنجیدگی اجزیات کو اک انتظام
ہند کو روحِ عمل اُردو کو اک زورِ کلام راکھ کو چنگاریاں شعلے کو اک رقصِ دوام
سوز کو اک فنی دی ساز کو نغمہ دیا

اب بھی کیا تاریخ پر چھپے گی کہ تو نے کیا دیا
ہو گا جب تیرا کمالِ باغبانی بے نقاب کعبیت سے تاروں کے جب اگلے ٹکڑے اُفتاب
تب دنا اس دل کے ذہنوں کا لگنے کی حساب جس کے خون کو کاہرِ طہرہ تھا تخمِ انقلاب
جس کے چھٹیوں سے ہری کشتِ چین ہے آج بھی
جس کی سُرخی غارِ رومے وطن ہے آج بھی

ماخذ کو بھی سلا سکتے ہیں جمونے خواب کے جاگی طوفانوں کی قسمت دن پھرے گرداب کے
وہکیاں ساحل کو دیں اب جو صلیے سیلاب کے اک جنازہ جا رہا ہے دوش پر احباب کے
یترگی سی ہے دماغ میں مناظر کی طسرح
جس کا چہرہ بھی اترا ہے جواہر کی طسرح

پھر بھی تیری روح زندہ ہے کہ زندہ ہے وفا سن رہے ہیں موت کا ہم ناقصانہ قہقہا
کیوں نہ اس بے رحم کا ہم بھی اڑائیں مضحکا نعرہ آنا دُزدِ باد سے گو بجے نضا
ہے طبیعت پر جو مالِ سی کا ذنگ اڑنے لگے
تس کے نورے موت کے چہرے کا رنگ اڑنے لگے

بے جلوسِ آخری تیرا نکاحوں کا سلام گرم اشکوں کا سلام اور سرد آہوں کا سلام
دہیروں کا، دہردوں کا، شاہراہوں کا سلام عالموں کا، شاعروں کا، کچے کلاہوں کا سلام
آج وہ دن ہے کہ بھارت کا علم سجے گا
منہری سوجھے ہیں اس کا قلم سجے گا



حضرت مولانا ابوالکلام آزادؒ

(علیہ رحمۃ اللہ)

بعد از وفات تربیت مادر زمین مجو

در سینہ مردم عارف قرار یافت (دول)

Seek rest on earth for our dust after we die
In the hands of men of love ours bodies lie

Indo-Iran
Herald

۱۳۱۱

’اہلال‘ کے پیسے صفحہ کا عکس



مولانا آزاد یہ حیثیت ایڈیٹر ’اہلال‘ و ’ابلاغ‘

مولانا آزاد ۱۹۱۲ء میں

AL-BILAL
4000 Bilal Road
3-4 FLOOR WING
CALCUTTA
Telephone 14400
"AL-BILAL"
Proprietor: M. S.

الْبِلَال

ایک نثر وادب رسالہ

جلد اول ۱۳۳۶ھ
Calcutta, Wednesday, June 1, 1916

فہرست

۱۔ ایک نثر وادب رسالہ (مقدمہ) ۱
۲۔ ایک نثر وادب رسالہ (مقدمہ) ۱
۳۔ ایک نثر وادب رسالہ (مقدمہ) ۱
۴۔ ایک نثر وادب رسالہ (مقدمہ) ۱
۵۔ ایک نثر وادب رسالہ (مقدمہ) ۱
۶۔ ایک نثر وادب رسالہ (مقدمہ) ۱
۷۔ ایک نثر وادب رسالہ (مقدمہ) ۱
۸۔ ایک نثر وادب رسالہ (مقدمہ) ۱
۹۔ ایک نثر وادب رسالہ (مقدمہ) ۱
۱۰۔ ایک نثر وادب رسالہ (مقدمہ) ۱

تعارف

ایک نثر وادب رسالہ (مقدمہ) ۱
ایک نثر وادب رسالہ (مقدمہ) ۱
ایک نثر وادب رسالہ (مقدمہ) ۱
ایک نثر وادب رسالہ (مقدمہ) ۱
ایک نثر وادب رسالہ (مقدمہ) ۱
ایک نثر وادب رسالہ (مقدمہ) ۱
ایک نثر وادب رسالہ (مقدمہ) ۱
ایک نثر وادب رسالہ (مقدمہ) ۱
ایک نثر وادب رسالہ (مقدمہ) ۱
ایک نثر وادب رسالہ (مقدمہ) ۱



مولانا آزاد کے نام کچھ خط اور ان کے جواب

۱ اگست ۱۹۴۲ء میں مولانا آزاد کو پوری ورکنگ کیٹی کے ساتھ گرفتار کر کے لاہور واپس لایا گیا۔ مولانا آزاد کو پوری ورکنگ کیٹی کے ساتھ گرفتار کر کے لاہور واپس لایا گیا۔ مولانا آزاد کو پوری ورکنگ کیٹی کے ساتھ گرفتار کر کے لاہور واپس لایا گیا۔

میں اور جی ایم ایف (یعنی مسز ارونا آصف علی) بھی کسی نہ کسی طرح اسٹیشن کے اندر داخل ہو گئے تھے۔ مولانا نہایت خندہ پیشانی سے اپنے ورکنگ کیٹی کے ساتھیوں کا استقبال کر رہے تھے۔ اس لئے کہ وہ جمہوریت صدکائے مسکین کے سب سے پہلے گزرتا رہے تھے اور چونکہ مولانا بھائی کیسیائی ورکنگ کیٹی سے استعفیٰ دے چکے تھے اس لئے وہ گھر ہی پر رہ گئے۔ مولانا نے فرمایا کہ بیٹی یہاں نہیں چائے بھی ملے گی۔ میں نے ہر طرف تلاش کیا کسی کا پتہ نہ چسلا۔ وزیر شریف روم بند تھا۔ اسے میں ایک پریس امپلے یا اور اس نے ہر سمت نکالی جس میں میرا نام نہ تھا۔ ہلکا گاڑی میں رہنے کی اجازت نہ ملی۔ اور ناجی بھی باہر ہی رہیں۔ کہا گیا کہ ریل میں چائے کا انتظام ہے۔ جب سب آگئے تو مولانا حنفی لی گئی اور دیر لگ جاتا تھا کہ کہاں چل دی۔

گواہی ٹینک پر دوائیوں اور دوائیوں کی پریکٹس تھی۔ وہاں مولانا آزاد یا پتہ نہ تھا۔ مولانا آزاد کی کارروائیوں کے لئے دوائے تھے۔ ان لوگوں کی گرفتاری کی خبر رضا کاروں کو نہ تھی۔ وہ سب منتظر تھے ہم (اردو اخباری) اور

وہاں پہنچے۔ مولانا جی نے جھٹلا ہرایا۔ پولیس نے جس میں گورے سپاہی زیادہ تھے مداخلت کی۔ میدان کو چاروں طرف سے خانی قویوں سے گھیر لیا گیا تھا۔ نئے نئے رشتہ کار بھوت، اربابوں اور لوگوں پر کیا ایک گورہ باری ہونے لگی۔ ہم نے اس تہلکہ کو دیکھ کر جلدی جلدی "جھٹلا اور پتہ ہے ہمارا" ختم کیا۔ اور معمولی کو دھڑکے کی دم گھٹا دینے والی اور نہرلی پتہ سے بچانے کی کوشش کی۔ انگریز سپاہیوں نے نئے راہ گیروں کو ہتھوں کا نشانہ بنانا شروع کیا۔ دھیر دھیر ذہنی اور ان کی دھرم تپتی ہوئی اور لوگوں کے ہنچے ٹپٹے۔ یہوش لوگوں کو اسپتال بھیجے گا انتظام ہونے لگا اور لاشوں کے لئے

.....

ایم ٹی فورٹ جیل میں انہما بھی بند تھے۔ خود قیدی کیوں اپنی بے بسی کے عالم میں ہندوستانیوں کے قتل و غارت کے قصے پڑھیں؟
نئے یہ کسوں میں ہے نہ میتاد کیوں میں
گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

اس پس منظر کے بعد مولانا نے اپنا غم غلط کرنے یا یوں سمجھ کر اپنے دلی بوجھ کو ہلکا کرنے کے لئے یہ طریقہ اختیار کیا کہ کچھ لکھنے لگے۔ غلطی تو اب صدیوں جنگ مروج تھی۔ غلط سہاسی نہ تھے۔ یعنی نہ ان میں منطقی خشکی کے ساتھ تاریخی حقائق سے نئے نئے نکلے گئے تھے۔ نہ قربانی کے فلسفے پر لکھتے تھے۔ اور اگر نہ ہوتے بھی تو کس کے لئے ہوتے۔ قلم سے ایک پرچہ بھی باہر نہ جا

سکتا تھا۔ مزید لگ اس طرح گھٹتے کہ غصہ سوسائٹی کے اصولوں کو مانتے۔ قسماً
بہا تباہی کے بتائے ہوئے اصول کے پابند تھے یعنی مقصد کے ساتھ ساتھ ذرائع مقصد
بھی پاکیزہ و مناسب یا جائز ہوں۔ تو جوان لفظ اس اصول کو دانتا تھا اور کہتا تھا
کہ جن اصولوں کو ہمارے نسب پر سے (یعنی ورگنگ کیٹی کے ممبر) نا جائز سمجھتے ہیں،
وہ اگرچہ عام حالات میں نا جائز سمجھے جائیں مگر مقصد کے پاکیزگی، بغیر بھی پاکیزہ
بنادیتی ہے۔ مثلاً کسی شخص کا ہاتھ کاٹنا برا سمجھا جاتا ہے، لیکن اگر اس ہاتھ کی بیوت
سوسائٹی کا مسلسل نقصان پہنچتا ہو تو کیا اس ہاتھ کو کاٹنا نا مناسب سمجھا جائے گا
یا اگرچہ اس شخص کا ہاتھ سڑ رہا ہو تو کیا داؤد لڑکی رائے زانی جائے گی۔ بہر حال
یہ لوگ غصہ کارگزاری کے خلاف تھے۔ اور کوئی خط اس طرح باہر نہ بھیج سکتے تھے۔

دوست ہے، بزرگ ہے، یا کیا ہے !
 حسرت مولانا نے اشعار کی کئی قسمیں کی ہیں جس کا کلام میں، ادبی آمد ہو وہ
 عاشقانہ، عارفانہ یا فاسقانہ ہو گا۔ جس میں آمد ہی آمد ہو وہ ماہرانہ، قاضیانہ
 یا ضاحکہ نہ ہو گا۔ جس میں آمد و آمد مخلوط ہو وہ شاعرانہ، واصفانہ یا پایائیانہ
 ہو سکتا ہے۔ ضاحکہ نہ کلام میں اگر ابتذال ہو تو وہ سو قیانہ ہو جائے۔ اور
 فاسقانہ کلام میں جذبات، ہوس کی جگہ مذہب یا حکومت پر ملے ہو اور سوسائٹی
 کو انقلاب کی دعوت دی جائے تو وہ باغیانہ ہے۔

فریادیں ہم چند خطوں کے اقتباسات دیتے ہیں جو دوسروں نے مولانا کو لکھتے تھے۔ بعض کے جواب مفصل دئے گئے ہیں۔ بعض کے دو حرفی ہیں۔ اور بعض کے متن خوشی ہی جواب ہے۔ ان خطوں میں آپ کو "خبر خاطر شکے خطوں کا ملت تو شاید نہ آئے" اس لئے کہ وہ ایک خاص صنف کے خط ہیں اور یہ نادرہ اخبار خاطر کو ادبیات کے غم میں فرق کرنے کے لئے لکھے گئے ہیں۔

بیس سالہ علاوہ سیاست کے دوسرے میدان بھی ہیں جن میں مولانا کے فیصلے بڑھتے ملت ہیں بلکہ ختم ہیں۔ یہ خط انھیں پیش کیے گئے اور پیش کرتے ہی ان کے جواب پر سب سے اور بے تکلف و نہ گئے۔ جواب پڑھنے میں زیادہ سے کافی ہنس

ہو۔ ان میں سیاسی خطوط نہیں ہیں اور شیعہ نمونہ اور فارسی ہیں جنہیں جوق
خط پر مشتمل کسی جاسوس کے ہاتھ میں آسکتا ہے۔
مولانا کے اہلکاروں کا ایک خط تبرکاً ہے جس میں درج کر دیا ہوا ہے خط
مولانا محمد میاں فاروقی (حال ام پی) کو لکھا گیا تھا۔ مولانا احمد نوری میں سے
پاکوٹا بھیج دئے گئے تھے اور ۱۵ جون ۱۹۴۵ء کو دہلی کو روانہ کئے گئے تھے۔

لام داس

پاکوٹا

۱۵- جون ۱۹۴۵ء

صديق المومنين جيسيا کہ کل شام آپ کو دہلی سے معلوم
ہو گیا ہو گا۔ آج میں مجھے دہلی لایا گیا ہے۔ آج رات کی ٹرین سے کلکتہ جا رہا
ہوں۔ میں نے اس وقت ایک تار اکسپرس آپ کے نام اس مضمون کا بھیجا
ہے کہ اہل خاں صاحب بلا تاخیر کلکتہ آجائیں امید ہے کہ وہ تار ملتے ہی
مدان ہو گئے ہونگے۔

کھڑک پور میں آپ کو دیکھ کر طبیعت نہایت خوش ہوئی تھی۔
اس محبت و اخلاص کے لئے شکر گزار ہوں۔ افسوس ہے کہ یہ اطمینان گفتگو
کرنے کا موقع نہ تھا۔ اس لئے چند منٹوں سے زیادہ ملاقات کا سلسلہ قائم نہ
رہ سکا۔

امید ہے آپ بخیر و عافیت ہونگے والسلام علیکم ورحمۃ اللہ علیکم

ابوالکلام

یہ دو خط جناب اقبال شہیدانی صاحب کے ہیں۔ یہ بہت پرانے ہندوستانی
نیشنلسٹ ہیں اور آج کل اپنے سوانح حیات لکھ رہے ہیں۔ ان سے آپ کو معلوم
ہو گا کہ ۱۹۳۵ء میں حضرت مولانا عبدالحق صاحب مرحوم (۱۸۷۲-۱۹۴۱ء) کابل
میں تھے اور وہاں انہوں نے انڈین نیشنل کانگریس کی بنیاد ڈالی تھی۔ پھر جب
وہاں دو انقلابیوں نے مولانا کو گرفتار کر لیا اور راجہ ہند پرتاپ نے ہندوستانی
مادنی حکومت قائم کی تو اس کے وزیر داخلہ بنے۔ مولانا بیکریت اللہ بھوپالی مرحوم
نے دہلی میں ۱۹۳۶ء میں کیسٹون ریلوے میں وفات پائی۔ مولوی محمد بشیر صاحب
امیر مہاجرین سرحد وزیر جنگ بنے۔ ڈاکٹر رحمت علی دہلی آج کل لاہور

۱۰ جون ۱۹۴۵ء میں فریج پڑھاتے ہیں (وزیر رسل و رسائل تھے۔ سرپرست دہلی راجہ
تھے) جو برسر میں نازیوں کے ہاتھوں قتل ہوئے) اور راجہ ہند پرتاپ
(جو آج کل دکن یا بھون ہند ہیں) حکومت کابل، آریانا اور افغانستان ہند
کے مددگار تھے۔ اقبال شہیدانی صاحب بھی وزارت جنگ و رسل و رسائل
کے نائب وزیر تھے۔ ان کو مولانا ابوالکلام آذاد نے کابل بھیجا تھا۔ اب وہ
پاکستانی ہیں اور اتحاد اسلامی کے خواہش مند ہیں۔

یہاں علم تعمیر یا خوش کا خیال آگیا۔ میرت سائنس متعدد "اقبال"
اپنی اپنی شان میں نظر آئے گئے۔ مثلاً اقبال احمد خاں سہیل (مرحوم) شاعر
ادیب، ڈاکٹر اقبال شاعر، ڈاکٹر اقبال (پروفیسر لاہور)، پروفیسر اقبال علی شاہ
(میرٹھی - مستحق) اقبال شہیدانی صاحب الفلاحی۔ مراقب دنگ (دلی گورنمنٹ)
اقبال سنگھ (دکریٹ)۔ . . .

بسم اللہ تعالیٰ

۱۲ جون ۱۹۴۵ء

سیدی و مولائی - اسلام علیکم ورحمۃ اللہ -

یہ غالباً پیشتر لکھا گیا ہے جو خدمت عالی میں ارسال کر دیا ہوں
اس مکتوب کے ساتھ چند صفحات ایک خاص واقعہ کے متعلق جو اب تاریخی
واقعہ ہو چکا ہے ارسال خدمت ہیں۔ دو ایک عربی اخبارات کے کٹنگ بھی
بھیج دیا ہوں۔ ممکن ہے باعث دل چسپی ہوں۔ ایک اور صفحہ بھی ہے جو
مولوی فضل الہی صاحب مرحوم و معذور نے ہر شہر مرحوم اور سینئر مسولین
مرحوم کو لکھا تھا۔ اور جس کی کاپی مولوی صاحب مرحوم نے مجھے دی تھی۔ کسی
دوسرے وقت میں ارسال کروں گا۔ یہ سب چیزیں تاریخی حیثیت رکھتی
ہیں، اور بہت ممکن ہے، ہندوستانی تاریخ نویس اس سے کچھ فائدہ
حاصل کر سکیں۔

سنو کے جواب کا ایک مدد سے منتظر ہوں۔ تاخیر غالباً ناگوار محروم
کی وجہ سے ہوگی۔ جواب آئے پر یہاں سے سفر کی تاریخ مقرر کروں گا۔

والسلام

معذور کا خادم

اقبال

اگست ۱۹۴۵ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم ۔ نفعاً وفعلاً علیٰ رسولنا محمد

قاہرہ - ۴ اکتوبر ۱۹۵۵ء

حضرت مولانا صاحب قبلہ ، سلام سنوں ۔ مگر یہ مجھے اہل غل صاحب نے
میرے علی سے مکتوب کا جواب دیا ۔ کہ مکتوب میرے دست و دعا میں کہ مجھے
سکون و اطمینان حاصل ہو ۔ شکریہ ۔ مسلمان ہاں کہیں سکون و اطمینان کی حساس
شخص کو حاصل ہونا چاہئے شیر کالانا ہے ، بہر حال یا کسی گناہ ہے ۔

ہیں ابھی یہاں کچھ روز اور قیام کروں گا ۔ ارادہ ہے کہ اس ماہ کے آخر میں
چلا جاؤں ۔ وہاں پہلے دوست بھی ہیں ۔ وہ چاہتے ہیں کہ ان کے ساتھ
مل کر کچھ تجارتی کام کروں ۔ آخر دن کو کرنا ہے ۔ لی الحال بد نظر کوئی خاص مقصد
نہیں ۔ یعنی سیاسی ۔ خدا کرے کچھ تجارتی کام چلیں گے ۔ دعا فرمائیے گا ۔

یہاں مسٹر دیسائی دانی کشنر اتفاق سے مل گئے ۔ ان کے ساتھ ایک مکتوب

خدمت عالی میں بھیج دیا ۔ استاد مرحوم کامرید ہوں یعنی

خط لکھیں گے کہ حسب مطلب کچھ نہ ہو

ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے

اہل غل صاحب کی خدمت میں سلام عرض کرتا ہوں ۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

حضور کا خادم اور دعا کا طلبگار

اقبال

۱۔ دو خط ایک ایسے شورش پسند کے ہیں جس کا مقصد مہجرت ہی حرکت
و یہ جان ہے ۔ جس نے اپنے قید بند کے زمانے میں جیلروں تک لکھے انقلاب پسند
نہیں بلکہ انقلابی بنا دیا ۔ وہ ایک گروہ وقار ہے جو ہمیں سے آج تک چٹان کی
طرح اپنے مسلک پر قائم ہے ۔ شیخ حریت کے ان پرداؤں کے سوز و گداز کو کوئی
کیا جانے ! مولانا کے بعد

جو غم ہی ہاں گداؤں کو منہم غماریا کریں !

محرم المتعام سلام سنوں ۔

اعادۃ ہفت روزہ چٹان " نے فیصلہ کیا ہے ۔ کہ ۱۹۵۴ء کے آغاز میں
مولانا ابوالکلام آزاد کی جامع صفات شخصیت سے متعلق ایک خاصہ اور ضخیم نمبر

آج کل دہلی (ابوالکلام نمبر)

شائع کرے ۔ : مولانا ایک اہم وقت ہو گا ۔ ان علی ۔ ادبی ۔ تفسیری ۔
دینی اور سیاسی خدمات کا جو اس بزرگ ہستی نے پچھلی نصف صدی میں سر انجام
دی ہیں ۔

ہماری کوشش یہ ہو گی کہ ہم اس نمبر کو مولانا کی شای کے شایان اور
ان کے مذاق کی نفاست کے مطابق شائع کریں ۔ اس ضمن میں ہم نے ان تمام
اہل قلم اور اہل سیاست سے رجوع کیا ہے ۔ جو مولانا سے قریب رہے ۔ یا
آپ کی عظمت کے کسی دیکھی اعتبار سے مترق ہیں ۔

نیا زکار

شورش کا شیریں

ایڈیٹر چٹان " لاہور

بھائی اقبال

سلام سنوں " آج ہی ایک خط " حضرت مولانا مظلہ کو بھی لکھا ہے
بھئی تو ان کی نگہ انتہا کو آمادہ کیجئے ۔ ع

توسس گئے ہیں کسی مرد راہ واں کے لئے

اس قدر سال نام کی ترتیب و ترتیب کا اچھا خاصہ نقشہ بنایا ہے " دوسرے
معنی " کئی تصویریں ۔ سرنگی و یک رنگی " پریس اپنا ہے " آپ جابحت دیکھ کر
یقیناً خوش ہوں گے ۔ اپنے قلم کو بھی حرکت میں لائیے ۔ مولانا مظلہ کی سیر
کے بعض خاص پہلوؤں پر کچھ لکھیں ۔

۲۔ میری دو شانہ استعدا ہی نہیں درو مناد خواہش بھی ہے " ایک
بات مزید پیش نظر رہے کہ پندرہ دسمبر تک معین مل جائیں ۔ آپ کا بھی اور
مولانا کا بھی ۔ فرمائیے ان سے کیسے التماس ہو ،

جواب کا منتظر

انتھام

شورش کا شیریں

۹ - ۱۱ - ۵۵

جواب ۔ بھئی سوج ہو تو آپ دہلی آکر مل میں ۔

۱۹۵۵ء

ایک ہندو شیا سی کا خط

۳۴ جون ۱۹۵۷ء

مذہب مکرّم جناب پیر مرشد صاحب دام ظلکم

بھنے اگ عرصہ کم روز خاص دل میں پوشیدہ رکھتا تھا کہ جناب کی خدمت میں چند حرف ارسال کروں مگر تو قبل دینے دیکھ جبریاں تھیں۔ آج خوش قسمتی سے تحریر کرتا ہوں امید قوی ہے کہ جواب دے کر بندہ پر بڑی عنایت کریں گے۔ ہم ڈوب بھی ہے کہ ایک ملک کا اتنا بڑا آدمی اک غریب فقیر کو کوہوں جو اپنے ننگے بند خیالی و پاک دامن کا سپرہ لایچ و تیا پر ہر سو پھیلے ہوا ہے اس لئے ایسا۔ آج میں نے ہندی کی مشہور شاعری کی ایک کتاب پر غور کیا جس میں ملک محمد ہاشمی کے تعانیف اشعار تھے۔ ایک ہندی شاعر نے ان کو "صوفی" لکھا جس کو میں بھی مانتا ہوں اور ہر شخص ماننے کو تیار ہے۔ مگر مذکور کتاب کے اندر "صوفی" الفاظ کی تشریح نے مجھے پریشان کر دیا۔ بعض اشخاص نے تو صوفی اس جماعت کا نام لکھا ہے جو سفید اون کے کپڑے پہنتے تھے۔ غرض کہتے ہی الفاظ جیسے تھے۔ کیا میں امید کروں کہ وقت سیاست سے نکال کر مجھے دو الفاظ میں صوفی الفاظ کے مرادف الفاظ دینا اس جماعت کی ابتلائے قادیان پر چند حرف عنایت فرمائیں گے۔

میں ایک ہندو فقیر (سنیاسی) ہوں اور اردو ہندی دونوں سے پریم ہے۔ ۱۰۰ امید ہے حرف و خط و نیز دیگر خطی پر غور نہ کریں گے۔ مجھے یہ مشورہ موصوم کیوں پسند ہے۔

ہندو بندے تو ہیں خدا کے بنوں میں پتھر ہیں ہمارے
میں اس کا بندہ بنوں گا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہوگا
آپ کا خیر اندیش

سوامی۔ برہم دتہ ہنس

جواب ۱۔ میر خیال ہے کہ یہ لفظ یونانی لفظ صوفیوں سے نکلا ہے جس کے معنی حکمت و عقل ہیں۔ اس سے فیلا صوف بنا ہے۔ قلعی طور پر کہنا مشکل ہے لیکن یہ خیال زیادہ معقول معلوم ہوتا ہے۔

ایک ادبی سوال اور اس کا جواب

دلی کیفیت ضلع المولہ

۱۰ ستمبر ۱۹۵۷ء

تحفیدت ماب قبل مرانا صاحب مدظلہ

آداب۔ آپ پر بخوبی روشنی ہے کہ بچوں اور نوجوانوں کے لئے شیشا سودی کی مشہور و مستند تعزینت کرسیا سے بہتر کتاب آج تک کسی زبان میں شائع نہیں ہوئی۔ خوش قسمتی سے اس لطیف کتاب کے ہندی ترجمہ کی ایک جلد میرے پاس موجود ہے جو غالباً ساٹھ ستر سال پہلے میں چھپی تھی۔ میں سفارش کرتا ہوں کہ محکمہ تعلیم یا کوئی اور شعبہ تعلیم اس ترجمہ کو چھپوا کر شیشا سودی کے پند و لعنا سے اہل ہند کو مستفیض کرے۔ فرد طلب یہ ہندی کتاب بہ سرچشمہ اس سال خدمت ہوگی۔

بکہ عرصہ ہوا ایک کتاب میں دیکھا تھا کہ انگریزوں کے ہمد میں جب آپ احمد نوح کے قلعہ میں سلطان جہان یا خاکم بدہن اسیر تھے تو ایک چپڑیا سے جو آپ کے کمرہ میں غلّی ہو کر باعث تکلیف ہوتی تھی آپ کو زیر ہونا پڑا کیونکہ اس کو مداخلت سے روکنے کی تمام تدبیریں بے کار ثابت ہوئیں۔ مبادا موجودہ سیاسی جلد جہ میں جبر حالات ماضی رہتا ہو جائیں یہ تجویز پیش خدمت ہے کہ آئندہ آپ کے بستر و نذارت میں ایک دریا لگائے بھی اضافہ کر دیا جائے۔ جو بوقت ضرورت ایسے مدخلین جیسا کہ تدارک و اندفاع میں تیرد تفتنگ ڈکسیا بمب اور بومرنگ Boomrang سے بھی زیادہ نوبت ہوگی۔ چونکہ میں ہمارا جہاز دور دور ہیں اس خدمت کے جبر کا بھی مستفی ہوں اور اجر بھی تجویز کر دیتا ہوں۔ وہ ہوا ہلا۔ مجھے دو طرحوں کی نقلیں جن کے ایک ایک معرہ ذیلی میں منقول ہیں عنایت فرمائی جائیں۔ ان کے معمولی میں میں اب تک ناکام رہا۔

۱۔ بیاور کشتی چٹم نشیں و سیر دریا کشی

۲۔ منہ ایں شیشہ تنہائی کہ درویرانی سود

نیز غلیہ بادشاہوں کے مشہور عالم باغ موسومہ شالامار کے مرجع نام اور دو تسمیہ سے بھی ملے (رائیں)۔ یاد پڑتا ہے کہ وقائے قیمت خاں عالی میں مذکور ہے کہ اس کا اصل نام شہر و ماہ باغ تھا۔ براہ کرم اس کی ترقیق و

مکتبہ

تصہبی فرمائی۔ اخبار Blitz نے اس سے متعلق ایک غلط بیانی شائع کیا ہے اس کو تصحیح اپنا فرض سمجھتا ہوں۔

دعا گو و خلیج دعا

نیازا پاس

مری کوشش واس زس خراب آبادی

تعمینت کرتے وقت تقریر کے بعض احوال کے متعلق تمہیں کے ساتھ کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ کیا آپ ازراہ عنایت میرے عزیزہ مولانا کو سنا کر جوابات لکھنے کی زحمت گوارا فرمائیں گے؟ یہ مقالہ چونکہ دائرۃ المعارف میں چھپے گا۔ اس لئے تمام معلومات زیادہ سے زیادہ واضح اور مستند ہونی چاہئیں۔ مثلاً

۱۔ مولانا کا سال ولادت مشہور ہے۔ لیکن بچپن، تاریخ اور دن کے متعلق

کچھ نہیں سے کچھ معلوم نہ ہو سکا۔

۲۔ "لسان الصدف" کا پہلا پرچہ ۲۰۔ نومبر ۱۹۷۷ء کو نکلا تھا۔ یہ پرچہ اور

متفرق پرچے میرے پاس ہیں۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ یہ کب تک جاری رہا؟

۳۔ "المدہ" کی ایڈیٹری کا زمانہ مشہور ہے اور آخر سے مشہور ہے اس کے اوائل

تک کا معلوم ہوتا ہے۔ کیا اس تعلق کی قطعی تاریخیں معلوم ہو سکتی ہیں؟

۴۔ مولانا "دیکس" میں کب سے "تب" تک رہے

۵۔ مولانا کی تقریروں سے مندرجہ ہونے والے کلمات کا سفر مشہور میں ہوا

تھا۔ کیا اس کی صحیح تاریخ اور مدت کا علم ہو سکتا ہے؟ مولانا کے

بھائی کا انتقال کس مقام پر ہوا تھا؟

۶۔ مختلف لوگوں نے لکھا ہے کہ مولانا یہ سلسلہ تعلیم معرجمی گئے تھے۔ یہ سفر

کس وطن میں ہوا تھا؟

۷۔ مولانا کے والد ماجد مشہور میں ہمارے گئے تھے۔ اس وقت ان کی عمر

کیا تھی۔

۸۔ میرا خیال ہے کہ وہ وقتاً فوقتاً ہندوستان آتے رہے، اس لئے کہ

بہنو، بھائی، برادر وغیرہ میں ان کے بے شمار مدد تھے۔ مستقل اقامت

کی نیت سے مشہور میں آئے۔ کیا یہ درست ہے؟

۹۔ مولانا کے والدین کی تاریخ اسے وفات، میں نے مشہور میں ان کی

قبروں کی زیارت کی تھی اور تادمین لکھی تھیں، لیکن اب وہ مقبرہ

کچھ کا خدو میں کم ہو گئی ہے اور نہیں ملتی

۱۰۔ "پانچ" میں "تذکرہ قیام کو" منظر ہندی سے "تذکرہ قیام کو" منظر ہندی سے "تذکرہ قیام کو" منظر ہندی سے

سے۔ مولانا نے "غبارِ خاطر" میں اس مدت کو "امیری" میں مصوب

کیا ہے۔

میں نے بڑی ہمت کر کے سطوریں لکھی ہیں لہذا یہ بھی لکھنے کے مولانا کی صحت

اب کیسی ہے۔ مجھے ہر حال میں جلد ناپ ہے۔ صرف اس انتظار میں ہوں کہ ذرا طبیعت

جواب:- پہلا معروف آتش فشاں کا ہے۔ عبداللہ اور بڑائی نے منتخب آتش فشاں میں ذکر کیا ہے اور یہ ملنے لگتا ہے۔

شالامار کے بارے میں کئی رائیں ہیں لیکن میرے ذہن میں نہیں بیان کی جا سکتی۔ شالامار بارہ دہائی میں بھی تھا اور تک زیب نے اپنی "تفت لیشنی" کا وہیں سے اعلان کیا تھا۔ لیکن اب اس کا نام نشان باقی نہیں ہے۔

.....

مکرم و مخرم چہ ہری غلام رسول ہر سال آؤیہ انقلاب ہمارے اعدا کے بہترین ادیب فارسی کے رمز شناس عربی اور انگریزی ادب کے قدردان کا مولانا کے بہت قدیم یاد رہے۔ سیاسی زبوروں نے اس رشتہ کو جنبش نہیں دی بلکہ مزید استوار ہی ہوئی۔ لاہور میں ان سے مولانا کی ملاقاتیں بھی مجھے یاد ہیں اور تعظیم ہند کے ایک بہر صاحب کا وہی ہیں مولانا کے یہاں فروکش ہونا بھی کل کی بات ہے۔ ان کے خطوط پر جو مولانا کے جواب ہیں وہی باہمی محبت و مخلص کے لئے شاہد عدلی ہیں۔

باسمہ سبحانہ

۲۷۔ ۱۸ پرچہ ۱۹۷۷ء

برادر محترم۔ میں نے جب آپ کو لکھا تھا کہ جلد راجہوں تو اسی وقت تیار کر لیتی تھی۔ لیکن دفتر زیادہ ہو گیا اور اب تک میاوی سے بھیجا نہیں چھوٹا۔ ذرا طبیعت تسکے تو چند ڈکے لئے حاضر ہواؤں۔ چند مزدوری باتیں پیش نظر ہیں۔ پھر میں روپ جاتا چاہتا ہوں۔ اغلب ہے اس سفر میں چارپانچ بیٹے لگ جائیں۔

یہاں پنجاب یونیورسٹی ایک دائرۃ المعارف مرتب کر رہی ہے۔ اس کے لئے حضرت مولانا کے متعلق ایک مقالہ میرے ذمے لگتا ہے۔ وہ تمام حالات میرے پیش نظر ہیں جو مولانا نے اپنی تصانیف میں نمٹا لکھے یا دوسرے اصحاب نے متعلق کتا ہیں

اگست ۱۹۷۷ء

منجمل جائے تاکہ سفر کے قابل ہو جاؤں۔

ایسے آپ یہ نہیں۔ یہ صاحب کی سیرت کی جلد اول کے بہت
دیکھے گئے۔ دوسری جلد کے پردوں کا انتخاب ہے۔ کتاب انشاء اللہ جلد چھپ
ہوگی۔ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

نیاز مند

ہم

جواب - بہتر ہے کہ آپ دو تین دن کے لئے یہاں آئیں تو ان سوالوں کے زبانی
جوابات مل جائیں۔

باسمہ سبحانہ

سید محمد

حضرت مولانا۔ میں کل ایک مفصل حرمینہ خانی صاحب کی وساطت سے
ذمت گزری جس میں بھیج چکا ہوں۔ آج دو پہر کو یہ تو معمول کے مطابق سب سے
بے آپ ہی کی یاد تازہ ہوئی۔ میں نے عرض کرنا چاہا کہ مرنے کا ایک شعر آپ نے
”فبار خاطر“ میں کسی قدر بدل کر چھپا ہے اور بدل ہوا ٹھیک اصل سے بہتر نہیں۔
اور دفتر کے باوجود معلوم نہ ہو سکا کہ اس میں مصدق کیا جاتی۔
شکریوں ہے۔

میں انہیں دو دو گراں مایہ چاہت یا لم

کہ یہ اغاڑہ آں صبر و شب تم واوند

نہیں فرما رہے ہیں ”دو دو گراں مایہ“ کی جگہ ”دو دو گراں بار“ چھپا ہے

یہ بھی پوچھنا چاہتا تھا کہ آپ نے شرف جہاں قزوینی کے دیوان پر کس جو
نہرہ لکھا تھا؟ آیا بس کا دیوان بہت اچھا ہے؟ آیا اس نثر کا کوئی ٹکڑا
یہ کہ مسودات میں موجود ہے؟ لیکن اب اس کے سماچارہ نہیں کہ وہی دوبارہ
آ۔ تو پوچھوں۔ والسلام علیکم

نیاز مند

ہم

جواب - ہو سکتا ہے کہ میرے حلقے میں وہی اغاڑہ ہوں جو میں نے لکھ دیے۔ اگر
آپ نے دیکھا ہے تو یہ دیکھا ہے تو وہی اغاڑہ ٹھیک ہیں۔
شرف جہاں قزوینی کی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے فارسی شاعری میں

دو دو گراں کے طریق بنیاد ڈالی، تو دو گراں اس معاملے میں بولا جاتا ہے
جس معنی میں اردو میں معاصر پندی کہتے ہیں۔ اس کے مسودات ضائع
ہو گئے موجود نہیں ہیں۔

خان بہادر ظفر حسین خاں کی موزون آکاؤں کتاب ’الارواح فلسفہ‘ چھپ چکی ہے
مطالعے کے باوجود اپنی گونا گوں مسودات کے ذریعہ فرمایا ہے وہ کتنا دقیق ہے!
’الارواح فلسفہ‘ میں آپ نے بعض مصطلحات ایسی استعمال کی ہیں جو
غور طلب ہیں۔ آپ نے Resultant کے لئے اصطلاح استعمال کیا
ہے۔ یہ صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ Resultant ریاضی کی مشہور اصطلاح ہے
جس کے لئے صحیح عربی لفظ حاصلات ہے۔ Emergent کے لئے
آپ نے درجات کا لفظ استعمال کیا ہے۔ حالانکہ مزید اس کے مفہوم کو ادا نہیں کرتا
میں نے اہل ان کے زمانے میں اس کے لئے ظہور فنی کا لفظ استعمال کیا تھا لیکن پھر
میں نے اس کے لئے زیادہ مؤلف عربی فقرات پایا تو غلطی کی جی ہے۔
Alto کے لئے آپ نے ذرا استعمال کیا ہے۔ ٹھیک ہے۔ لیکن عربی
کی پرانی اصطلاح جو ہر فرد سے۔

آپ نے Dialectic کے لئے کلامیات و جدلیات و لفظ
لکھے ہیں۔ کلامیات اس لئے درست نہیں ہوگا۔

Experimentalism کے لئے آپ نے اختیار کیا
استعمال کیا ہے۔ جو بھی لفظ استعمال کیا جائے اس میں تجربہ کا مفہوم آنا چاہیے
آپ نے Mass اور Quantity کو مراد قرار دیا
ہے اور دونوں کے لئے کثرت کا لفظ استعمال کیا ہے۔ حساب لگ کر اس
کے لئے صحیح لفظ کثرت ہے۔ اہل ان کے مفہوم میں میں نے اس کے لئے
جسم ہی استعمال کیا ہے۔

آپ نے Platonic Ideas کے لئے افلاطونی اعیان کی
اصطلاح استعمال کی ہے۔ عباسی مترجموں نے اس کے لئے مثال کی اصطلاح استعمال
کی تھی اور وہی صحیح ہے۔ حین کا عربی فلسفہ اور تصوف میں دوسرا مفہوم ہے۔
Response کے لئے آپ نے جوابی حرکت اور رد عمل و رد فعل کے لئے
جی۔ رد عمل Reaction ہے Response کے لئے
صرف جواب صحیح اصطلاح ہوگی۔

Self کے لئے اپنے ذات اور نفس و نطق لکھے ہیں۔ شہزادان استعمال کیجئے۔ نفس مجھ نہیں ہوگا۔ اگر Self کے لئے نفس استعمال کریں تو Noua کے لئے کیا باقی رہے گا۔ عربی ظن ہے Noetic کے لئے نفس نام لفظ استعمال کیا گیا ہے Velocity کے لئے آپ نے حرکت کا لفظ پایا ہے۔ چھاپ Movement کو کیا کہیں گے۔

Proton کے لئے آپ نے برقی مثبت کی اکائی لکھا ہے۔ میری رائے ہے کہ اس قسم کے تمام انگریزی اصطلاحات جو ہمارے لئے سہل الفاظ ہیں ہمیں اختیار کر لینے چاہئیں۔ اردو میں Electron اور پروٹون ہم کہہ سکتے ہیں Pluralism کے لئے آپ نے کثرت کا لفظ استعمال کیا ہے۔ ے جمع نہیں ہوگا۔ اسے مذہب کثرت کر دیجئے۔

فقیر دیا نند مشرا کا سوال اور اس کا جواب

دہلی ۱۰ اکتوبر ۱۹۵۶ء

محرم مولانا صاحب

محاضر امر دہلی لاہور نے آپ کا معنوی اسوہ حسین 'ماخوذ از داستان کرپلا' بشکرہ نفیس اکیڈمی اپنے مورخہ ۱۰ اکتوبر کے شمارے میں شائع کیا ہے۔ ایڈیٹر لکھتا ہے کہ ہم مولانا نے موصوفہ سے دریافت کرتے ہیں کہ کیا وہ اس موقع پر مسلمانوں کی کثیرہ بھوجی مشورہ دیں گے کہ وہ 'ہڈلانا' نہ وجاہرا نہ حکومت کا علائقہ مقابلہ کریں اور کسی ایسی حکومت سے اطاعت و فرمانبرداری کی بیعت نہ کریں جو خدا کی خیریت ہوئی انسانی حریت اور حقوق کی غارت گر ہو۔"

قطع نظر اس کے کہ محاضر ایسا کرنے میں کہاں تک حق بجانب ہے۔ میں ایک بات آپ سے دریافت کرنا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ اسلام میں بنیادی حقوق کا نظریہ کیا ہے۔ کیا یہ خدا کی بخشش ہیں جیسا کہ آپ کے معنوں میں درج ہے یا انسانی دماغ کی کاوش کا نتیجہ ہیں۔ اس معاملے میں اگر آپ مجھے راہ دکھ سکیں تو آپ کا بہت شکر گزار ہوں گا۔

خادم

دیا نند مشرا

جواب ۱۔ جو چیز قرآن کے مطالعہ سے معلوم ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ مساوات پر یعنی انسانی برادری بھائی چارہ "پیغام غور سے اس میں رد و دیا گیا ہے تو

اس خیال کی مخالفت کی گئی ہے کہ مساوات یا نسل کی بنا پر انسان کا کوئی گروہ دوسرے گروہ سے افضل ہو سکتا ہے۔

مساوات انسانی کا یہ تصور فطری ہے اور خدا کی بخشش ہے۔ عموماً اس کے حصول کی کوشش یا عدم سعی۔ یہ انسانی دماغ پر منحصر ہے۔ فطرت مجھ اسے راستہ دکھا چکی ہے اس پر چلنا نہ چلنا اس کے اختیار میں ہے۔

مکتوب ڈاکٹر محمد نظام الدین صاحب ڈاکٹر گڑ ڈاکٹر الماریات الماریہ۔ حیدرآباد ۲۳۔ اگست ۱۹۵۶ء

معنی و معنی

تسلیم۔ آپ کے الطاف نامہ مورخہ ۱۰ اگست کلمہ مدشکور ہیں۔ حضرت مولانا کی خدمت میں تمام علمی دنیا اور خصوصاً دائرۃ المعارف کی جانب سے ہدیہ تشکر پیش فرمائیے اور عرض کیجئے کہ آپ کے عہد اور آپ کی سرپرستی میں جو کام ہو رہے ہیں وہ ابداً یاد تک زندہ رہیں گے۔ خدا تعالیٰ آپ کو ان کا اجر دے گا اور یہ کارنامہ تاریخ ثقافت عالم میں ذریعہ حروف سے لکھا جائے گا۔ دائرۃ المعارف کی سرپرستی و حقیقت ہمارے مشابہ کی سچی قدر دانی ہے۔ کتاب الہند جس کا ملنا مشکل تھا وہ بھی حضرت مولانا کے فیض سے عالم ثقافت کو کمر دستیاب ہو جائے گی اور ہندوستان اور بیرونی کا نام پھر روشن ہو جائے گا۔ پہلے بیروت مکرر طغوت ہیں۔

میری شخصی استدعا مورخہ ۱۰۔ جون ۱۹۵۶ء کے متعلق کیا کارروائی عمل میں لائی گئی کچھ پتہ نہیں چلا۔ دوسری جواب سے سرگراں فرمائیے کہ یہاں حالات بہت تبدیل ہو رہے ہیں۔

مفتخر کرم

محمد نظام الدین

جواب ۱۔ کتاب الہند کی لمباحث و اشاعت یعنی ایک علمی و ثقافتی کار

دائرۃ المعارف کی شہرت ہندوستان کی شہرت ہے۔ حیدرآباد کی ایکش کے ذمے میں مستند استفسارات بیرون ہند سے اس اسلامی کے متعلق وصول ہوئے تھے۔ آپ کے ذاتی مسئلہ پر فہم ہے۔

اگست

ٹیکوٹو رحیمی صاحب کا سیالکوٹ (پاکستان) سے مکتوب

سیالکوٹ - ۱۹ ستمبر ۱۹۵۵ء

مکرمی و محرمی جناب مولانا! السلام علیکم ورحمۃ اللہ

ایک مدت سے امدادہ کرتا تھا کہ آپ کی خدمت میں مولفہ لکھوں۔ چند
ریک مسائل ہیں جو میرے لئے ایک مدت سے الجھن بنے ہوئے ہیں۔ آج میں
آپ ہی کی خدمت میں ان کے حل کرنے کے لئے رجوع کرتا ہوں کیونکہ میری
دانش میں ان مسائل کی وہ غواروں کو طے کرنے کی اہلیت سرزمین پاکستان
ہند میں آپ کی ذات کے بغیر اور کوئی نہیں رکھتا۔ لہذا آپ ہی کو تکلیف دے
رہا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ آپ کی مصروفیتیں بے حد ہیں۔ لیکن اسے کیا کیا جاتا
کہ اور کوئی راستہ بھی دکھائی نہیں دیتا۔

اسلام کی ہمہ گیر سادگی اور یہ کہ یہ فطرت کا مذہب ہے۔ مسئلہ توحید اور اس کے
بدر منظر عمل صالحہ پر زور۔ یہ سب کچھ نہایت عمدہ اور قابل قبول۔ لیکن اس کا
کیا جواب کہ نتائج کے اعتبار سے (درون وسطی کے شاعرانہ زمانہ سے قطع نظر)
سمانے عالمی کے ادب کے نہیں بلکہ اذکبار عربوں مدی حبیبی یا خلافت عباسیہ
کے خاتمہ کے بعد اسلام کی تمام ترقی کا دار و مدار ایسا مسدود ہوا کہ پھر نہ نکلا۔
اور آج تک پیرایہ اسلام ذلت و ادبار میں مبتلا ہیں۔ میں اس عقیدت سے
پوری طرح آشنا ہوں کہ اسلام اور پیرایہ اسلام دو مختلف چیزیں ہیں۔ اور
دونوں کو غلط نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن اس کے باوجود میرے لئے یہ چیز معتد بہ چکی
ہے کہ اتنی چھوٹی تعلیم کے ہوتے ہوئے مسلمانوں کی حالت ہر لحاظ سے اس قدر پست ہے
اور کچھ نہ تہذیب و تمدن، اقتصاد، مریض الخالی، خدمت علم و سائنس، وراثت
فی الارض، المائیت اور اس کے علاوہ خاصائص انفرادی اور اجتماعی، ان سب
چیزوں میں مسلمان سب قوموں سے پیچھے ہیں اور پھر نظام کوئی صورت اصلاح حال
کی دکھائی نہیں دیتی۔ مغربی ممالک کی نظروں میں مسلمان محض ایک مذاق بن کے
رہ گئے ہیں۔ اس کے برخلاف دوسری اقوام کو دیکھا جائے تو وہ ہر چیز میں ہم
پیش پیش ہیں۔ خدمت خلق، راستبازی، بلند اخلاق ان چیزوں کا
اسلام اقوام کے اندر اس قدر درودور ہے کہ حیرانی ہوتی ہے۔ علم دینی کے

ہم سے پیش پیش ہیں۔

میں ایک چیز نے بظاہر میری رہنمائی مزدور کی ہے اور وہ یہ کہ
نے اس دنیا میں آج تک سر اٹھایا مثلاً بابل و کلدانیوں کی تہذیب

ہندو مت میں آریاؤں کی تہذیب، مغربیوں کا عروج و ترقی، یونانی اور رومن
تہذیبیں۔ یہ سب اپنے اپنے زمانے میں انتہائی عروج پر پہنچیں اور پھر ان کا
دوال ایسا آیا کہ پھر دبا پھر اُٹھیں۔ تو کیا فطرت کا یہ الہی قانون تو نہیں کہ جو قوم یا
تہذیب ایک انتہائی بلندی پر پہنچ جائے اس کی پستی لازمی اور یقینی ہے۔
اور پھر وہ نہیں اُٹھتی۔ مجسّمہ کہیں اسلام کے ساتھ تو ایسا نہیں ہوا۔

دن بعد سنتہ اللہ قبل یدہ کے ماقبت تو ایسا نہیں ہوا۔ لیکن قرآن حکیم
میں بھی تو لکھا ہے کہ ﴿حَولَ الَّذِیْ اُتِیَ الرُّسُولُ بِالْاِنْجِلِ وَدِیْنِ الْحَقِّ
بِظُہْرِ الْوُجُہِ﴾ اللہ تعالیٰ تو اس کے ماقبت اس دین کو سب پر غالب آنا چاہیے۔
لیکن ایسا نہیں ہوا۔

اگر بہ نظر خود دیکھا جائے تو صاف معلوم ہوگا کہ جو ذلیل اور پست ترکیبیں
ہیں۔ وہ مسلمانوں کے اندر بددعہ اتم موجود ہیں۔ حالی مرحوم جس قدر برائیاں
ٹھنکے تھے ان سے کئی گنا زیادہ اب موجود ہیں۔ آج کے متبادل میں شاید وہ
ذوہتر تھا۔ شرافت، اورانت، قہر، دوست بقی، ایثار، دم، سچائی، عدل
والنصاف، ان سب خصائص سے ہمیں دور کا بھی تعلق نہیں۔ نفرت،
خود غرضی، ظلم، بددیانتی، تنگ نظری، سب ہمارا شیوہ بن چکی ہیں تو خدا را
جگائیے کہ ایسا کیوں ہے اور کیا کوئی اصلاح حال کی امید ہے۔

جو میرے حقوق و شہادت ہیں وہ یہ ہیں کہ قرآن و سنت کے صحیح اور سید
راستے کی موجودگی میں مسلمانوں کی تمام عالم اسلام میں یہ حالت کیوں ہے مشرق وسطیٰ
کے اسلامی ممالک کی حالت شاید ہم سے بھی زیادہ زبوں ہے تو آخر ایسا کیوں ہے
کیا لہذا بالذات اسلامی تعلیم میں وہ دلکشی ختم ہو گئی اور محمد علی باب کے مطابق
کہ ہر مذہب ایک ہزار سال کے بعد اپنی اصلی ماہیت کو مٹھیتا ہے یہی اطلاق
ہمارا اور ہے نہیں۔ حضور اور علی، اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئیوں کا ذکر آپ نے
تذکرہ میں جو کیا ہے وہ تو یاد رکھیں کہ یہیں۔ لیکن آخر امید کی کونسی
ہوگی۔ ان امور کا جواب دیجئے اور ضرورت وقت نکلیے۔ میں پُرانا نیا مذہب
ہوں اور نسکین قلب کی تلاش میں ہوں۔ آپ کا دلے نیاز مند

نور حسین

بھابھا۔ اسلام دین فطرت ہے یا نہیں اس کا فیصلہ صرف اس بات سے ہو
سکتا ہے کہ خود اسلام کی تعلیم کو پُرکھا جائے۔ باقی رہی یہ بات کہ لوگوں
میں بے عمل کیوں ہے اس کی ذمہ داری اسلام کی تعلیم پر نہیں ہو سکتی

لوگوں کی بدعملی پر ہے۔ اس تیرہ سو برس کے اندر اس تعلیم کے جو کامیاب نتائج ملے وہ بھی ہمارے سامنے ہیں اور اب لوگوں کے بدعملی کے نتائج بھی ہم دیکھ رہے ہیں۔

علائی کے متعلق ایک استفسار

راہی چپچہدہ
۴۔ اگست

ذوالہجہ الحکم حذوہ صلاۃ علیہ وسلم! ادام اللہ بقائکم۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ ایک مسئلہ کی تحقیق کے لئے بصورتِ تحریر حاضر خدمت ہوا ہوں۔ آپ نے اپنے ترجمان القرآن میں "ما ملک لیا نکم" کے لئے نکاحِ مکرہ قرار دیا ہے اور بغیر نکاحِ دہلی "نا جائز ہے اور اس کی ضمانت آپ نے دوسرے حصہ سورہ مومنین کے نوٹ کے اندر کی ہے کہ "قرآن کے نزدیک اتحد تاسلی کا جائز طریقہ صرف ایک ہی ہے اور وہ اندواج کا طریقہ ہے۔ اس کے علاوہ جو طریقہ بھی اختیار کیا جائے گا ناجائز ہوگا خواہ کسی شکل اور کسی نوعیت کا ہو۔" حالانکہ آیاتِ قرآنیہ سے اس کا صاف طور سے ثبوت نہیں ملتا ہے بلکہ اس کا ثبوت مناسبت سے کہ جبکہ وہ لونڈی کسی دوسرے کے ملک میں ہو تو مالک سے اجازت لے کر اس کا نکاح کیا جائے گا جیسا کہ آیت شہادہ ہے "فانکحوا من باذن اہلہن" اور دوسری آیت "وانکحوا لایمالی منکم والاعمامحرمون علیکم واما انکم سے اس کا ثبوت ملتا ہے کہ جبکہ کسی کے پاس کوئی لونڈی ہو اور اس سے فائدہ نہ اٹھا رہا ہو تو دوسرے سے اس کا نکاح کر دے۔

اور سورہ مومنین میں "الا علی اذواہجم او ما ملککم ایمانہم سے تو صاف طور سے اس کا ثبوت ملتا ہے کہ بغیر نکاحِ لونڈی سے دہلی کرنا جائز نہیں کیونکہ آیت ازواج اور ما ملککم ایمانہم کے حق دہلی میں ملتا ہے اس لئے کہ عقدِ نکاح کے بعد ملک میں بھی ازواج میں داخل ہے تو پھر دوبارہ ملک میں کا تو کر دیکھیں نہا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ آزادِ قرہ بیوی اور لونڈی سے دہلی جائز ہے۔ اس آیت کے علاوہ فتاویٰ عالمگیری و عربی و قاضی خان وغیرہ سے اس کا ثبوت ملتا ہے کہ ملک میں سے بیوی نکاحِ دہلی جائز ہے اور اس دورِ حاضر میں حجاز کے بادشاہ سلطان ابن سعود کا بھی اسی پر عمل ہے اور ہمارے شہر کے ملا بھی قرآنی و حدیثی و دلائل عقلیہ کی روشنی میں اسی کو ثابت کرتے ہیں کہ شرعی لونڈی کو نکاحِ دہلی جائز ہے۔ اب یہ یوں ہیں کہ صحیح مسئلہ کس کو سمجھوں بہرانی فرما کر اس مسئلہ کی وضاحت

قرآن حدیث و ائمان کی روشنی میں فرمادیجئے تاکہ پیداشد مشکوک و شبہات رفع ہو جائیں۔

دائم نیازمند
محمد نعیم

جواب۔ مختلف موقعوں پر مختلف نوعیت کی تصریحات ہیں۔ لڑائی کے قیدیوں کی نسبت عام رواج یہ تھا کہ وہ لونڈی غلام بنائے جاتے تھے۔ اسلام نے ابتدائیں رحم و شفقت کے احکام دے کر اس رسم کے خیر اندازہ کیا اور پھر سورہ عسکریہ کی آیت "وہبنا منا اما فذلہ نازل کر کے اس رسم کو بھی بند کر دیا۔ البتہ اس سے پہلے جو لونڈیاں لوگوں کے تصرف میں آچکی تھیں ان کے حقوق کو باطل نہیں کیا۔ سورہ مومنین میں اسی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

مرد شہید کے متعلق استفسار

۷۸۶

لاہور

مگر ای قدر خراب!

السلام علیکم۔ قائلہ چلتے رہیں گے اور انسانی فکر میں بھی ترقی رونما ہوتی رہے گی اور چند ایسے انسانی ہی قرطاسِ عالم پر ابھریں گے جو لڑائی باز سے زندگی حاصل کریں۔ مجھے بھی انہیں میں سے ایک فرض کر لیجئے۔

سردار کی ذات، اصفت اور ارشادات پر کچھ تحقیق کر رہا ہوں۔ آپ کی کتاب "خوبی شہادت کے قطرے" مقرر سے گزری تو دل سے کہا کہ آپ اس سلسلے میں میری معاونت کر سکیں گے۔ براؤ کریم مجھے وہ کتب اور وسائل تو فرمادیجئے جس کا مطالعہ مجھے منزلِ مطلوب تک لے جائے۔

آپ کی مدد و مقرر حق کے باوجود جواب ملنے کا یقین رکھتا ہوں۔ فقط

آپ کا خیر و ایش

کرم الہی بدر

جواب۔ فارسی شہاد کے جو ذکر کرے ہیں اکثر میں مختلف حال موجود ہے۔ بخیریت کے تذکروں میں مرآۃ الخیال میں کسی قدر تفصیل ملتی ہے مگر کتاب میں بعض تفصیلات ملیں گی۔ نیز کتاب پیدائش کا فارسی ترجمہ بھی سردار کی نگرانی میں تھا۔

اگست ۱۹۵۷ء

مولانا ابوالکلام آزاد

ایک روشنی داغ تھا دریا

ملک میں اک چراغ تھا دریا

مولانا آزاد کا ذکر کہنا غلوں میں کروں اور جذبات کی فیرش کو کس طرح دماغ کا
ساحل بنالوں! ان کی عظمت کا صحیح اندازہ تو اس وقت ہوگا جب وقت کا یہ لڑکے کی سن گئے
کسوٹی پر ان کے ہم عصر مشائیر کی شخصیت اور ان کے کارناموں کو پرکھے گا۔ ہم لوگ جو
بہاؤ کے دامن میں اپنی زندگی گزارتے رہے ہیں کیا اندازہ کر سکتے ہیں اس کی پابندی
کا! اس کی بروت پوش چوٹیوں کا جس پر سکون کی ایک ابدی کیفیت چھائی معلوم ہوتی
ہے! اس کے دل کی خورشوں کا جس میں لاد کو تار بنتا ہے! اللہ طوفانوں کی یورش راؤ
بجلیوں کی تڑپ کا جو اس کی آغوش میں لپٹی ہیں یا جاہرات کے ان خزانوں کا جو اس
کے سینے میں پوشیدہ ہیں! اس مقرر مضمون میں تو بس آٹھابی کر سکتا ہوں کہ ان
کی عمر آفریں شخصیت کے چند نمایاں پہلوؤں کی طرف اشارہ کر دوں

ہر بڑی تہذیب صدیوں وقت کی گودی میں پل کر اپنے کمال کو پہنچتی ہے اور
اپنی خاص قدیم خاص اصول و ریزیکہ و بد کے خاص سانچے کو حاصل کرتی ہے۔ ہندوؤں
کی تہذیب بہت سی مختلف تہذیبوں کا شگم ہے جس کے بندنے میں مختلف قوموں نسلوں
نہاؤں اور مذہبوں نے حصہ لیا ہے۔ اور اس کا ٹوٹا سلسلہ ہزاروں برس سے قائم
ہے۔ قدیمت کی قیامت سے تاریخ میں کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک تہذیب کی تمام
ماہیت ہی اچھی قدیم کسی غیر معمولی شخصیت میں اپنا شمس تلاش کر لیتی ہے۔ جیسے
اٹلی میں لیونارڈو ڈی وینچی، جرمنی میں گوٹے، امریکہ میں براہیم ٹکن، ہندوستان
میں شکر، گاندھی اور مولانا آزاد اس ہندو مسلم تہذیب کا ایک شاہکار تھے جو گزشتہ
ہزار برس میں پروان چڑھی ہے۔ انھوں نے مشرقی تہذیب، ادب اور علوم و فنون

کے ماحول میں مبتلا کی تربیت پائی! مذہب کو اپنی توجہ کا خاص مرکز بنایا اور اس طرح
ان کی بہترین قدیم کو اپنی ذات میں جذب کیا۔ لیکن وہ اس پر قائم نہیں ہوئے۔
ان کی خلاق طبیعت نے اس کے ساتھ ساتھ مغربی تہذیب کی بہترین قدروں کو بھی
اس طرح اپنایا کہ ان کی ذات مشرق و مغرب کا ایک حسین شگم بن گئی۔ اس میں ایک
طرف مشرق کی سکون پسندی اور گہرائی، اور اداری اور عقلی، انسانیت اور
روحانی بصیرت تھی اور دوسری طرف مغرب کی روشنی خیالی، ذہنی جرات، انسانی شہ
عملیت اور عوام کی پاسداری کا جذبہ کاربند رہا تھا۔ اس طرح ان کی ذات ماضی اور حال
کے درمیان، مشرق اور مغرب کے درمیان ایک پل کا کام کرتی تھی۔ وہ ایک نرودست
عالم دین تھے لیکن ملاکی تنگ نظری سے آزاد۔ فلسفے میں گہری نظر رکھتے تھے لیکن کبھی
اس کی سطحی روشنائی میں راستہ نہیں بھٹکتے۔ ان کا مسلک گویا یہ تھا کہ
نہ فلسفی سے نہ طاہر سے غریب مضامین کو

یہ دل کی موت، وہ اندیشہ و نظر کا شاد

ان کے نزدیک مذہب اظہار، سائنس، سیاست سب کا ایک ہی مقصد تھا اور
وہ یہ کہ انسان اپنی زندگی کو شرافت کے سانچے میں ڈھالے اور اس غرض کے لئے
اپنی جہانی ذہنی اور روحانی قوتوں کو پرواز فرورے۔ ان کی زندگی میں دین اور
دنیا کی تفریق نہ تھی، دونوں میں حق پسندی اور شرافت کے اصولوں کی کارفرمائی تھی۔
وہ ایک نچرے کار اور بیاد مغز سیاست دان تھے لیکن ان تمام ریشہ و رانیوں اور
گھٹیا چالوں سے بلند جن کے ذریعہ بہت سے سیاست کا کھیل کھیلے وائے اپنی
قوت اور اثر کو بڑھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنی قوم اور ملک کے دل
میں اپنی جگہ پیدا کی تھی لیکن اس کے لئے کبھی اشتہار بازی کے طریقوں سے کام

ہیں لیا۔ وہ کبھی عوام کی سطح پر نہیں اترے، بلکہ محبت اور بھلائی کے ساتھ انہیں اپنی سطح پر لانے کی کوشش کی اور جب کبھی وہ لاتے سے ہلکے اور مولانا کی طرف سے انہوں نے بدگمانی یا رد گردانی، مولانا حراستِ مستقیم پر چلے رہے اور مصلیٰ اہمیت کے فرض کو یکسوئی اور دل سندی کے ساتھ انجام دیتے رہے۔ سیاست کے طوفان آئے، زلزلوں نے پہاڑوں کے ثبات قدم کوڑ کھڑا لیکن یہ مرد جا بد، یہ کوہ وقار مومن اپنی جگہ پر اپنے اصولوں پر اپنی رائے پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہا اس شان کے ساتھ کہ دستار کشی کی تشریف لے کر وہ نہ مٹھوں اور نہ بالٹھوں کی خدمت کا خوف اور شکوہ۔ ان کی دوبارہ وہ اپنی اہل بد بانی کو اس طرح برداشت کیا کہ پیشانی پر بل ٹیک نہ آیا۔ زیادہ سے زیادہ کہا کرتا تھا کہ "میں کبھی طاقت نہ اٹھا سکتا ہوں"۔ یعنی نہیں جانتے، نہیں سمجھتے کہ ان کی حرکتوں کا کیا نتیجہ ہونے والا ہے۔ ان کے دل میں کینہ کے لئے جگہ ہی نہ تھی۔ انہوں نے کسی جگہ ظہوری کا رنگ شرفِ نعل نہ لہرایا جو ان کے قلبِ مافیٰ کا نقشہ بھی کھینچتا ہے۔

شہدِ آستینِ ظہوری پیر از محبت یار

برائے کیست اغیار و دردم جانست

ان کا پیغام قوم کے لئے یہی تھا کہ نیک اور شرافت کا ساتھ دو اور ہرمانی اور بے انصافی کے ساتھ رشتہ نہ جوڑو۔ خدا کی وہی کو حق اور صداقت کی سی ہے، جو ستیہ کا راستہ ہے مضبوطی کے ساتھ چلو۔ اور خدا انہوں نے ہر جگہ کبھی اس جہل المتین کو اس مفسودہ رسکِ احمق سے نہیں چھوڑا۔ کبھی غلطی اور بے انصافی میں "اپنوں" کا ساتھ نہیں دیا۔ کبھی جمع اور پکی بات میں غیروں سے پہلو تہی نہیں کی۔ ان کے لئے "اپنے" وہی تھے جو ان کے اصولوں سے متفق ہوں اور غیر "وہ جو ان اصولوں کی مخالفت کریں۔

قدرت نے انہیں ایسا روشن دماغ دیا تھا کہ وہ ہر شکل سیاسی مسئلے کی گھینوں کو سلوک دیتے تھے اور ان کا نام نہ لیتے۔ یہ کامیابی کا راستہ کھول دیتا تھا یہی حال ہنر کے کام میں تھا ہم لوگ معاملے کی جزئیات میں الجھتے، موافق اور مخالفت دیوں کا فریب کھاتے لیکن ان کی منظر تفسیلات کو چیرتی ہوئی نفسِ صادق تک پہنچ جاتی اور وہ ایک واضح اور حکم فیصلہ صادر کر دیتے۔ ان کا دل اتنا قرار تھا کہ اس میں کسی قسم کے تعصب یا تنگ نظری کو بار حاصل نہ تھا۔ اس کے ساتھ ایوانِ انصاف پسندی اور انسان دوستی سے معمور تھے۔ اسی وجہ سے ان پر تمام تقلیدوں کو چڑھ پورا بھروسہ تھا اور وہ جلتے تھے کہ مولانا ان کے جائز حقوق کی حمایت کریں گے۔ میں نے ان کی زبان سے کسی شخص کی بُرائی میں سخت سے سخت لفظ یہ سنا کہ فلاں "چھوٹے دل"۔

دماغ کا آدمی ہے "یعنی ان کی ترازویں دل اور دماغ کی تکی انسان کی سی نہیں تھیں ہر دلی اور ذہنی تھی!

انہوں نے جنگِ آزادی کے زمانے میں اس تحریک کی سرمداری کی اذیت و بند کی مصیبتوں اور تسربانی اور ایشاد کی آزمائشوں کو شہد کا گھونٹ بنا کر پیالہ میں جب آزادی حاصل ہوئی تو انہوں نے اپنی ساری قوت اور توجہ اس بات پر وقت کر دی کہ قومی زندگی صانع بنیادوں پر قائم ہو۔ جب کبھی کوئی ایسا نازک موقع یا مشکل تھا آیا یہاں یہ اندیشہ نہ کہ شاید مصطلح کی کشش، انصاف اور دین ستاری پر غلبہ، آجائے تو ان کی اہل پرستی، حریت اور حق گوئی نے سید سکندری کا کام دیا اور مصطلح پرستی کو پسپا ہونا پڑا۔ اسی وجہ سے حق شناسانے ان کو قوم کے خیر کا خطاب دیا تھا۔ یعنی اس مبدی میں انہوں نے اس فرض کے بار کو اٹھایا تھا جو گاندھی جی، تمام دیتے تھے۔ ناواقف لوگ ان کو عام جلسوں یا سرکاری تقریبوں اور عورتوں میں دیکھتے تو خیال کرتے کہ شاید مولانا آنا داب سیاست کے مرکز سے دھڑکے ہوئے ہیں۔ لیکن انہیں یہ معلوم نہیں کہ ہر مقام اور زمانے کے اپنے آداب ہوتے ہیں۔ جب کانگریس آزادی کی جنگ کر رہی تھی مولانا اس کے ایک ممتاز رہنما اور صدر کی حیثیت سے طوفان کے مرکز میں رہے، آزادی کے بعد انہوں نے اپنے لئے ایک وہ سری شاہراہ عمل حقیقی کھنی تھی جس پر چل کر وہ ملک کی خدمت اور رہنمائی کر سکتے تھے۔ بے شک اب وہ ایک زمانے سے گوشہ نشین تھے۔ لوگوں سے کم گفتگو تھے لیکن ان کی انگلیاں قوم کی نفس پر تھیں اور وہ جانتے تھے کہ کیا کرتا ہے اور کیا کرنا چاہیے۔ اس زمانے میں ان کی شان یہ تھی کہ

مش خورشید سہروردی نکر کی تابی میں

شبِ فصل کی طرز سے چھل سب کا رفیق!

اور سب کی رفاقت کا ثبوت یہ ہے کہ جب ان کے بنائے واسے ان کو یاد کیا اور وہ اس کا نام بچتے بچتے اس کے حضور میں پہنچ گئے تو نہ صرف لاکھوں دلی والوں کی جگہ کروڑوں ہندوستانیوں کی عقیدت اور محبت، امیر اور ضابطہ کے بڑے توڑ کا منہ پڑی اور باہمی فرقوں اور اختلافوں کو بھول کر سب نے ان کی خاموشی اور بے لوث خدمت کا اعتراف کیا۔ میں نے اس جمعِ خیر میں جو ۱۲۲ فردوں کو ان کے مکان کے گرو جمع تھا ایک بوڑھے سٹیک کو یہ لکھتے سنا کہ اسے تمہیں کیا معلوم ہے آزادی تو بادشاہت کی ہے بادشاہت! ایک معنی میں یہ بالکل سچ ہے۔ وہ دل اور دماغ کے بادشاہ بھی تھے اور حکومت کی پالیسی کے بنائے اور

ڈھالنے ہیں۔ ان کا جو حصہ تھا اور ان کے ساتھی ان کی رائے اور فیصلوں کی جو قدر کرتے تھے اس کے بیچي نظر اس بڑے کا یہ قول ٹھیک معلوم ہوتا ہے۔
 یکسے وادشا جس میں ایک طرف انتہائی خود داری اور خودی کا احساس تھا جو کبھی کسی وقت کے۔ ماننے سر نہ تھا تھا۔ ایک فیر بھی تھا۔ فیر اقتباس کی اصطلاح میں یعنی

وہاد سکندر سے وہ مرد فقیہ سیرادی
 ہو جس کی فیر ہی میں پڑے اسدا اہلی
 اسی وجہ سے اس کے ان قہر و شہی کے ڈانڈے جاتے تھے اور دل بچار اٹھتا تھا
 نہ تحت و تاج میں لے شکر و سپاہ میں سبے
 جو بات مرد سکندر کی بارگاہ میں ہے

اس فیر کے پاس متاع دنیا میں سے بہت کم تھا، نہ مال نہ دولت نہ جائداد نہ سرمایہ۔ نہ خانگی نہ خدگی نہ پابندیاں جو دل میں کمزوری پیدا کرتی ہیں۔ اس میں سہ تیزی کی ایک خاص شان تھی اور نام و منہ اور منہرت پسندی سے نفرت۔ کبھی کو انجمن کسی در سگاہ کسی حکمت کو اپنے نام سے منسوب نہیں ہونے دیا۔ شاید ایک وفد کے سوا کسی یونیورسٹی کی اعزازی ڈگری قبول نہیں کی تاہم پیدائش منہج پوشیدہ رکھی کہ دوست اور عقیدت مند اس کو متاثر نہ لگیں۔

مولانا اندلے جہاں ایک شاندار شخصیت اور انداز فکر و عمل والا تھا وہاں ان کے دل میں عام لوگوں اغریوں اور سہاج کے متاثر ہونے طبقوں کے خاص ہمدردی اور گہرا تھا جس کے افسانے زبان خلق مدون تک متاثر کی۔ دیکھی اس کی ایک انوکھی جھلک آپ کو اس انتخاب میں دکھائی دے گی جو انھوں نے ۱۹۳۱ء میں اپنے علمی اور مذہبی شاہکار ”ترجمان القرآن“ کے لئے لکھا تھا۔ اس نیر و ست تعریف کو انھوں نے ان کی رئیس کے نام منسوب کیا نہ عالم کے نہ کسی دوست کے نہ عزیز کے بلکہ ایک غریب گناہ اجنبی کے نام جو ان کے پاس ایک دو سوے دیس سے سینکڑوں میل چلی کر علم اور دینی ہدایت حاصل کرنے آیا تھا۔

”قابلاً و سیرہ ۱۹۱۱ء کا واقعہ ہے، میں راپٹی میں نظر بند تھا عشا کی نماز سے فارغ ہو کر مسجد سے نکلا تو مجھے مدرس ہوا کوئی شخص پیچھے آ رہا ہے۔ مڑ کے دیکھا تو ایک شخص کبیل اور ڈھے کھڑا تھا۔

”آپ مجھ سے کچھ کہتا چاہتے ہیں؟“
 ”ہاں جناب میں بہت دودھ سے آیا ہوں۔“
 ”کس سے؟“
 ”مرد پاد سے۔“
 ”یہاں کب پہنچے؟“

”آج شام کو پہنچا۔ میں بہت غریب آدمی ہوں۔ قذحار سے پیدل چل کر کڑا پہنچا۔ وہاں چند ہمدردی سدا کر مل گئے تھے انھوں نے فکر رکھ لیا اور آکر سے پہنچا دیا۔ آکر سے یہاں تک پیدل چل کر گیا ہوں۔“

”افسوس تم نے اتنی معیبت کھنڈ برداشت کی؟“
 ”اس لئے کہ آپ سے قرآن مجید کے بعض مقامات سمجھ لوں۔ میں نے ’الہلال‘ اور ’البلاغ‘ کا ایک ایک حرف پڑھا ہے۔“
 یہ شخص چند دن تک صبراً اور صبر لیا ایک واپس چلا گیا۔ وہ چلتے وقت اس نے نہیں ملا کہ اسے اندیشہ تھا میں اسے واپسی کے مصارف کسے روپیہ دوں گا اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کا بار مجھ پر ڈالے۔ اس نے یقیناً واپسی میں بھی مسافت کا خرچہ پھیلے کیا ہوگا۔

مجھے اس کا نام یاد نہیں ہے مگر میں نہیں معلوم کہ وہ زندہ ہے یا نہیں۔ لیکن اگر میرے حافظے کو کبھی نہ کی ہوتی تو میں یہ کتاب اس کے نام سے منسوب کرتا۔“

کیسا شاندار اور اثر آفریں اعتراف ہے طلب صادق کا، علم کی پیاس کا، مذہب کی سچی لگن کا، خواہ وہ ایک بوسیدہ کبیل ہی میں ہو جس پر۔ اس مرد مومن کی زندگی میں خدا کی فیاضی کی ایک عجیب شان نظر آتی ہے۔ اسے قدرت نے کیا کچھ نہیں دیا، وجاہت ظاہری جو اس کو لاکھوں میں ممتاز بناتی تھی، دماغ کی باقی جو فکر و عمل کے تاریک گوشوں کو منور کرتی تھی، دل کی فراخی جس میں تعصب کے سوا سب کے لئے جگہ تھی، علم کی وہ فراوانی کہ حدوں کا پتہ نہ چلے، تحریر و تقریر کا وہ کمال جو اس کی زندگی ہی میں فساد ہو گیا۔ زبان کو اس نے ایک نئی قدرت اور نیا انداز پیش اور لفظوں سے کام لیا شہلہ اور شبنم کا، رزم اور بزم کا، پھول اور خار کا، مذہب میں اس کی وہ نظر تھی کہ اس کے آئینے میں

دیں اور دنیا دونوں کی واضح تصویر نظر آتی تھی اور فکر حاضر ہے ایسی واقفیت کہ
مغرب کے عالم بھی اس نادر نامہ سے متفق تھے۔ یہ تھے مولانا آزاد۔ ایسا دوسرا
کہاں سے آئے گا؟ بقول حالی

حک یکسر تھا ہے سبہ آئیں اک فلاطون نہیں جو یونان میں
ختم تھی اک دہاں پر شہر تھی ڈھونڈتے کیا ہو سیدے تکیں میں
لب جامہ بیاں ہوا خاموش فوجی لگی واسطہ کیونگت میں
وہ گیا میں سے بزم روشنی تھی شمع جلتی ہے کیوں شہستان میں

پھر میں ایک قطرہ تاریخ سن لیجئے جو ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب نے مولانا
کی وفات پر لکھا ہے اور جس کے آخری شعر میں امید کا وہ پتہ ہے جو کہ اور بالکل
کی موجودہ کیفیت میں ہماری بہت بندھاتا ہے

کی تک ہم سب ہند کے خادم خوش ہو کر کچھ تھے
ہم نہیں دیش کی فکر کریں جب تک ہم میں ہے آزاد

آج پھر ذکرِ تجھ سے ہم تو سر کو پکڑ کر روتے ہیں
اور تو سب نیکوں سے چھٹ کر بارگاہِ ارم میں ہے آزاد
رحلت کی تاریخ تری نکلی منہ سے فتوں میں کہ
دل پہ آج، مجرم یا سیرے غم میں ہے آزاد

۱۹۵۸ء

اتنے میں محسوس ہوا جیسے کوئی کہتا ہے
دل کی انگلیں کھل کے دیکھا اب بھی ہم میں ہے آزاد
دو برج فکر و عمل اس کی سامنے جہاں میں ساری ہے
شرق و غرب میں ہے آزاد، اوپر و خرم میں ہے آزاد
یہ تو حق جگ بیتی، آپ بیتی کوئی کیونکر سنائے سونے اس کے
گفتی: نیست کہ میر غالب نا شاہچہ رفت
ی توں گفت کہیں بندہ خدا او نہ نہاشت

مرزا رحیم نوری خیر لکھنوی

قطرہ تاریخ وفات مسرت کلمات مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم

تھا عروب وہ ہنس بکمال علم و ادب
بلند جس نے کسب تھا نشانِ آزادی
بنایا ملک کو آزاد تھا جو نام آزاد
بسا بے علم و فراست پر اہل بیت و کشاد
ہاں تھے لاکھ تکلم سکوت میں اس کے
وہ سورا ہے نظر ہر فنا کے وامیں میں
زبان موجِ سیلاب تھی دمِ تقسیم
جہاں علم و ادب میں جو چھایا ستار
قر تہاں کی صورت تھا جس کا حلقہ بگوش
عمل میں گاندھی ہندو کے تھا جھوڑش بدوش
جگا چکا جو ہمیں، سو گیا وہ صاحبِ جوش
تھے اُس کے سامنے شاگرد بھی کے حلقہ بگوش
بتائے مشک کی خوشبو جیسے مشک فروش
پڑا اس کا نام بقا سے رہے گا ہم آفوش
کہ جس طرح ہو سمند میں وقت طوفان جوش
تو آئی غیب کی جانب سے یہ طوائف سرش

خیر معرب تاریخ لکھو، حبیبی میں

اُداس اُداس ہے مجمع ابوالکلام خوش

۱۳۷۷ھ

اگست ۱۹۵۸ء

۴۰

آغا علی دہلی (ابوالکلام خیر)

ابوالکلام بحیثیت انشا پرداز

مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی شخصیت اپنی جگہ ایک انجمن تھی۔ وہ ایک نئے ذہنی تھے اور انشا پرداز بھی، مفکر بھی تھے اور مدبر بھی۔ لیکن فوراً کیجئے تو ان کی شخصیت کا ماحول خرد ادب ہی تھا اور وہی ان کے مشاغل کے مختلف میدانوں میں ذہنی تشنگیوں میں ظاہر ہوتا تھا۔ ان کی سیاسی تقریریں، اعلیٰ ادب کی بہترین مثالیں ہیں۔ ان کے فلسفیانہ افکار، صحافت اور ستر سے ادبی پیرائے بیان سے آراستہ ہیں۔ وہ مشکل سے مشکل مسائل کو ایسا سریع الفہم بنا دیتے ہیں کہ معمولی آدمی کو بھی غلط فہمی کا امکان نہیں رہتا، اسے ادبی اجماع نہیں تو کیا نہ مولانا سیاسیات میں بھی ادبی دروازہ سے داخل ہوئے۔ اہل ادب بلاغ بہترین سیاسی مسائل سے پہلے بہترین ادب پارے تھے۔ جنھوں نے در کے دل میں جگہ کر کے مولانا کو یلروں کی صفِ اول میں کھڑا کر دیا۔ زینک ہر شعبہ حیات میں مولانا کی عظمت، ان کی انشا پردازی کی۔ یہی منت ہے۔ اور یہی کہنا چاہتے ہیں کہ اصل جوہر ہے۔

راقم، محووف کو مولانا کی خدمت میں شرفِ نیاز سب سے پہلی بار لکچر میں حاصل ہوا۔ میرا طالب علمی کا زمانہ تھا اور مولانا کی تحریروں کی شہرت سے زبان آشنا تھی۔ ان سے ملنے کا کمال اشتیاق تھا کہ مولانا لکھنؤ گئے ہیں اور رسول طرزی ہوٹل میں قیام ہے۔ رسول طرزی ہوٹل، اس زمانہ میں ملک کا بہترین فیشن ہوٹل تھا جو مغربی انداز پر ایک یورپی ہسٹم کی نگارانی میں تھا۔ مولانا اور رسول طرزی ہوٹل: یہ ایک اجتماعِ نعتیں معلوم ہوتا تھا۔ مولانا عبدالمجید میرا یاد دہانی میرے ہم کتب تھے اور مولانا ابوالکلام اس سے پہلے سے رسم و رواج رکھتے تھے۔ چنانچہ میں نے انھیں کو اپنے

تعارف کا واسطہ بنایا۔ ہم دونوں جب اس کمرہ کے برآمدہ میں پہنچے جس میں مولانا مقیم تھے تو کمرہ کے اندر سے میں نے ایک کلین شیوہ نوجوان کو برآمدہ ہوتے دیکھا۔ مولانا عبدالمجید نے میرا تعارف کرایا۔ میرے ذہن میں مولانا آزاد کا جو تصور تھا اس پر یہ دوسری ضرب تھی۔ یعنی یہ کہ وہ کم بخت ہم لوگوں کے ہم عمری تھے اور ابھی ڈاڑھی سوچھ ان کے چہرے پر برآمد ہی نہیں ہوئی تھی۔ مولانا ہم لوگوں کو اپنے کمرے میں لے گئے اور چاد کے ساتھ اپنے مین کھڑے ہوئے۔ ہم لوگوں کی ضیافت کی اس کا ذائقہ حافظہ میں اب تک محفوظ ہے۔ واقعاتِ حاضرہ پر ہر خیال کے اظہار کے لفظ بہت سے بہتر الفاظ و فقرات کا انتخاب، برجستہ مناسب حال، شعور کا استعمال، عرفیہ وہ کالج کے دونوں لکچرانوں کے ساتھ معمولی بات چیت ذہنی بلکہ ادبیات عالیہ کا ایک کلاسیکل نمونہ تھا۔ اس تصدیق پناہ قوت بیان کا مظاہرہ دیکھنے کا اتفاق مجھے اس پہلے بھی نہیں ہوا تھا۔ مشہور عالم اطالوی فلسفی کروچے نے اپنے جمالیات میں ماہر فن کے کمال کو کیا نہ کوتاہی اظہار ہی کو قرار دیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہر سب سے بڑے مدیون فن کے تو اس وقت درست ہو جاتے ہیں جب وہ اپنے کمال کے اظہار پر مجبور ہوتے ہیں، چنانچہ کروچے کا کہنا ہے کہ کسی مدعی فن کے امتحان کا سیدھا سادہ طریقہ یہ ہے کہ اس سے کہئے کہ ذرا اس گیت کے دوبول تو گائیجیگا یا پینسل حاضر ہے اس سے کہئے کہ کئی نقشہ کھینچ کر اپنے وارداتِ قلب کا ذرا اظہار تو فرمادیجیگا۔ قوتِ اظہار کی اس جانچ سے دنیا کی دنیا میں ان کے کمال کی پول کھل جائے گی۔ اور معلوم ہو جائے گا کہ وہ کتنے کتنے چائی ہیں۔

قوت گرامی

مولانا کے قوت الظہار و بیان کے نمونے ان کی ہر تحریر میں ہر قدم پر پڑھ کر تبسّس کے طے ہیں چنانچہ ”مذکرہ“ کے چند ورق اٹھتے ہی ملاہ کی یہ تحریر سامنے آجاتی ہے۔

”وہی دنیا جس کے میکہ و فراموشی نے غفلت کے جام بھرا دیا تھا۔ اپنے ہر جلوہ سے آنکھوں کو اپنے ہر نغمہ سے کانوں کو سرمستی و سرشاری کی پیچ و دوڑ میں تھیں اب اس کا کوڑا کوڑا پہچہ پہچہ، ہشیامی و بیشیش کا مرقع نقار، بصیرت و معرفت کا دیباچہ تھا۔ قدسے در سے گو گرم گشتار پایا، پتہ پتہ کو مکتوب و مسطور دیکھا، چہلوں نے زبان کھولی پتھروں نے اظہار کرنا شروع کیا، خاک پا مال سے اڑا اڑ کر ہر افشا نیکیں، آسمانوں کو باد اُترنا پڑا تاکہ مسالوں کا جواب دیں۔ زمین کو کتنی ہی مزہ اچھاں پڑا تاکہ فناء آسمانی کے تار سے توڑ لائیں، فرشتوں نے باند قلعے کے کبیسے نوش نہ ہو جائے، سودجہ چراغ سے کراہیں، طوکزدگ جائے، سب نے نقاب اتار دیئے، سارے پردے چھلنی ہو گئے، سب کی برؤں میں اشارے تھے، سب کی آنکھوں میں دکاتیں بری تھیں، سب کے ہاتھ بخشش و قبولیت کے ڈھانچے، اداں کو پکڑا تو سائے ہستی کا پتہ نہ نکلا، بھل کو پاس بٹایا تو لب ہائے راز کا ایک تہمت آشکارا نہکی، ہوا کے جھونکے شہر میں آگے لگ کر پھر بھی خالی رہیں۔ سمنے نے اپنی ساری مویں خرچ کر دیں مگر پھر بھی ہمارے ہاتھ کا پتہ نہ ہوا..... غرضیکہ ہمت خوابیدہ جاگ اٹھی اور دل رفتہ پھر نئی نئی طاقتوں اور مظاہرے سامانوں کے ساتھ واپس آگیا۔ عالم آفاق واقعہ میں جو کچھ ہے ان میں سے کوئی نہ تھا جس کے ارد گرد گرہ یا آنکھوں میں غموں ہو سب کی زبانیں گویا، سب کے اندر سے آشکارا، سب کی سطوح پر ابھری ہوئی تھیں، ذکوئی لب بند ہانڈ کوئی جود مستور، آنکھوں نے دیکھنے میں کمی کی، ان کاؤں نے سمجھنے میں، چشم و گوش نے جو کچھ ہم پہنچا دل کی وسعت نے سب کو سمیٹ لیا۔ اس سے زیادہ ادا کیا کہا جائے۔“

آج کل دہلی دریا اٹھام نہیں

مکمل عشق بدل درد و لب راکش

مرزا شمس فرد بند کہ با شہد خود (صفحہ ۳۳)
یا پھر کہاں ایسا کہ ساتھ ایک اہم حقیقت کا اظہار ان چند سطحوں میں کسی جگہ نہ۔

”خود کچھ تو انسان کی زندگی اور اس کے احساسات کا بھی کچھ یہ حال ہے تین برس کی مدت ہو یا تیس، ان کی گزرنے پر آتی ہے تو گزر رہی جاتی ہے۔ گزرنے سے پہلے سوچے تو میرانی ہوتی ہے کہ یہ پیلاؤ سی مدت کیوں کر گزرنے کے بعد سوچے تو تعجب ہوتا ہے کہ جو کچھ گزر چکا وہ چند لمحوں سے زیادہ تھا۔“

(خیاب خاطر صفحہ ۲۹)

زبانِ وفاقی

ہر ممتی کے مشہور عالم شاعر و ادیب، گوشتے کا قول ہے کہ اگر انسان وفاق زبان نہ جانتا ہو تو وہ اپنی مادری زبان کو بھی سلیقے سے استعمال نہیں کر سکتا۔ ہو سکتا ہے کہ مولانا کی اس بیروت انگیز قوت گویائی کا باعث ان کی متعدد زبانوں سے واقفیت ہو۔ عربی اور فارسی ادب پر تو ان کو عبور حاصل تھا ہی۔ فرانسیسی اور انگریزی زبان بھی خوب جانتے تھے اور آخر الذکر دونوں زبانوں کی کلاسیک کتابیں اکثر ان کے زیر مطالعہ دیکھی گئی ہیں۔ یہ قدرت سے حافظہ ایسا زبردست پایا تھا کہ ایک بار جو پڑھ لیا پھر کی لکھ ہو گئی۔ مولانا کو عربی و فارسی، اردو کے بڑا دل شرازہ برتتے۔ خیاب خاطر میں فرماتے ہیں:-

”معلوم نہیں ایک خاص طرح کے ذہنی واردہ کی حالت کا آپ کو تجربہ ہوا ہے یا نہیں؟ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے۔ کہ کوئی بات برسوں تک حافظہ میں تازہ نہیں ہوتی۔ گویا کسی کو نے میں سو رہی ہے۔ پھر کسی وقت اچانک اس طرح جاگ اٹھے گی۔ جیسے اسی وقت دماغ نے کوا کی کھول کر اندر سے لیا ہو۔ اشارہ و مطالب کی یادداشت ہیں اس طرح کے واردات اکثر پیش آتے رہتے ہیں۔ تیس چالی برس پیشتر کے مطالعہ کے نقشہ کبھی اچانک اس طرح ابھر آتے ہیں کہ معلوم ہوگا ابھی ابھی کتاب دیکھ کر اٹھا ہوں مضمون کے ساتھ کتاب یاد آ جاتی ہے۔ کتاب کے ساتھ جلد جلد کے ساتھ صورت اور متن کے ساتھ یہ کیفیت کہ نمونہ ابتدائی سطروں

اگست ۱۹۵۷ء

میں تھا، غلامی سطروں میں یا آخری سطروں میں، نیز صفحوں کا رخ
کہ جتنی طرف کا تھا، بائیں طرف کا۔ ابھی تھوڑی دیر ہوئی، صاحب
مہمول سو کر اٹھا تو بیکسی ظاہری مناسبت اور توہیک کے یہ شعر
خود بخود زبان پر جاری تھا۔

کم لذت و قیمت افزودن شاد است

گوی شد پیش از این باغ و بوم

ساتھ ہی یاد آگیا کہ شو حکیم صدرائے شیرازی کا ہے جو ادھر ہند
اگر ہی میں ہندوستان آیا اور شاہ جہاں کے جہنک زندہ رہا تو
آفتاب عالم تاب میں نظر سے گزرا تھا۔ غالباً بائیں طرف کے صفحہ
میں اور صفحہ کی ابتدائی سطروں میں۔ آفتاب عالم دیکھ ہوئے کم
سے کم تیس برس ہو گئے ہوں گے۔ پھر اتفاق نہیں ہو کہ اُسے کھٹ
ہو۔ (صفحہ ۱۰۹ تا صفحہ ۱۱۰)

اسالیب بیان

اسی طرح مشرقی اور مغربی فلسفہ کے مسائل ان کے ذہن میں محفوظ تھے
جس پر مخصوص محنتوں میں پُرکلفت کا کرہ کرتے تھے۔ ادب لطیف ہو یا فلسفہ
سیاسی بحث ہو یا مذہبی مسئلہ اور پھر تحریر ہو یا تقریر ہر جگہ ان کی "ابوالکلامی"
کا ثبوت ملتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ موضوع بحث کی نوعیت کے اعتبار
سے مولانا کا اسلوب بیان فی الجملہ بدلتا ہے۔ فلسفیانہ مسائل کی ترہ کشیوں
میں ان کا اسلوب بالعموم صاف اور سادہ ہوتا ہے۔ ایسی تقریروں میں
قناد و نادر، شہر و استغمانی کرتے ہیں۔ بیکسی جیسا اوپر اشارہ کیا گیا ان کی ذہنی
میں ادبیات صورت ہمیشہ صغر پائی جاتی ہے۔ جو دماغ سے خود کرنے سے نخلوں
کے ساتھ آجاتی ہے۔ خاصہ ادبی تواریات ہیں جو استعارہ و تشبیہ تھا وہ فلسفیانہ
تقریر میں تمثیل کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ مولانا کی منطق اکثر و بیشتر تمثیل ہوتی ہے
استغراقی یا قیاسی نہیں۔ وہ اپنے تمثیل استدلال سے شکل سے شکل مباحث اس طرح
ذہن نشین کر دیتے ہیں کہ باید و شاید استغراق اور قیاس کی کاوشیں ان کی تمثیل کے
مسلکے پائی ہوئے ہوتی ہیں۔ ایک اچھوتی تمثیل کی مثال پر اکتفا کرتا ہوں۔

"میں سمجھتا ہوں کہ ہمارا یہی حال رہا جو باد و بوم و بزم و بزمات ابتدا
و تئیر کے آج نظر آ رہا ہے تو کچھ عجیب نہیں کہ مسلمان مسجد کا دروازہ
کھولنے، اذان دینے، نماز پڑھنے اور رمضان کا روزہ رکھنے

کے لئے بھی گورنمنٹ کی اجازت اور رضا کے منظور پا کر میں گئے اور
مجر کے دن خطیب مزے کے ساتھ ہر تہ امتداد ہو کر کھڑا رہے گا
کو شملہ سے تار آ جائے تو خط پڑھنے کے لئے آمادہ ہو....."

(ابولہول، نوبر سٹیشن)

مولانا کی انشا پر ماری کے اجزا اور ترکیبی استعارہ تشبیہ، تضاد

مولانا کے کمال انشا پر ماری کا اصلی میدان ادب لطیف ہے۔ جس کے جوہر
تازہ استعداد، ایسی ہی تشبیہوں کے ساتھ چھتے ہوئے تضادات بھی ہیں۔ جوانی
کی زشتہ حیات میں بھرے ہوئے پائے جاتے ہیں۔ ایک تضاد کی مثال ملاحظہ
فرمائیے: استعارات و تشبیہات تو انھیں اقتباسات میں آپ نے دیکھے۔

"ہمارے تعلیم یافتہ وہ ستوں کا کچھ عجیب حال ہے۔ ان
کے پاؤں کو دیکھتے تو یوں لگتا ہے کہ انہوں کو راز تعلیم و عبودیت فکر
کی زنجیریں پٹی نظر آتی ہیں۔ مگر چہرے کی طرف نظر اٹھائیے تو زبان
کو ادعا و اجتہاد ہے ذمت نہیں اس سے بڑھ کر دینا میں بھی
خدا کا لڑکھائی کا شاہوکار ہے کہ ایک شخص آپ کے سامنے آئے
اور عین اس وقت جب کہ اس کے پاؤں میں تعلیم و اجتہاد
کی زنجیریں ہا زبیب کی طرح صداد سے رہی ہوں۔ اجتہاد فکر اور
حریت راستے پر بے تکانی کچر دینا شروع کر دے" (ابولہول، رستم سٹیشن)

طبیعت ہندی کے الفاظ

چیت فارسی ترکیبوں کے ساتھ مولانا اکثر طبیعت ہندی الفاظ استعمال کرتے
ہیں جو ایک خاص طعنت دیتے ہیں۔ مثلاً

"مگر اس کی گرفتاری میں گرفتاری اور اس کا لگاؤ بھی لگاؤ
ہے؟"

"جس کو کسی کسی تنداؤں اور چاہتوں سے ہمیشہ پیٹتے ہیں
بچاؤ رکھا تھا کہ کبھی ناسور پھٹنے کی جگہ مند مل ہو جائے۔"

"افرض تو فوق الہی کی سیکڑوں ماہیں ہیں۔ ہدایت و
تربیت فیسی کے چڑھوں جیسا ہوا۔"

"دل کی ٹپیں اور ٹپاک" وغیرہ وغیرہ۔

ماخذ و موثرات

مولانا کے قلم سے نکلے ہوئے ادب لطیف کو اگر شرمشور کہا جائے تو

یہ جاز ہوگا۔ شاعری کا کونسا کمال ہے جو ان کی نثر میں جوہ افزہ ہو۔
 کوئی سی صنعت ہے جو ان کی تحریر میں نہ ہو۔ بس وزن اور قافیہ ردیف سے
 عادی ہے۔ اس لئے آپ اسے نثر کہتے پر مجبور ہیں۔ ایسی نثر جس پسیکروں
 نکلے شاعر ہیں۔ مولانا کی انشا پر عادی اگرچہ ایسے مخصوص رنگ میں لگتا ہے
 یکے خود کرنے سے اس میں کچھ اثرات ملتے ہیں جو محمد حسین آزاد، اظہاری،
 عرفی، غالب، مہنئی کی سنی آفرینوں اور ادیبانہ تراش تراش کے مرہون صنعت
 معلوم ہوتے ہیں۔ اگرچہ یہ مسلم ہے کہ مولانا آزاد ہر تقلید سے آزاد تھے۔ اور
 جا بجا انھوں نے اپنی آزاد دروہی کا اپنی تحریرات میں اظہار بھی کیا ہے۔
خلافت

مولانا کی خلافت اور عام خلافت میں وہی فرق ہے جو کسی دہقان کھٹے
 بے نکا ٹھٹھے مارنے اور کسی متمدن و مہذب کے مکرانے میں ہوتا ہے۔ مولانا کی
 خلافت مہذب، امنیہ اور نشان دار ہوتی ہے جو خالوں کے علاوہ مخصوص ہے
 جس میں کوئی سو قیاد یا بازاری پہلو نہیں ہوتا۔ یہ خصوصیت ذیل کی مثالوں سے
 آشکارا ہوگی۔ یہ دونوں اقتباس مسلم ہونی درستی کے قیام کے سلسلہ میں جو جیلے
 لکھنؤ میں ہوئے تھے ان کے متعلق ہیں راقم الحروف ان جلسوں میں موجود تھا۔
 انھیں میں خبر آئی کہ (برائے) کے ہاں ڈر ہے۔ بہنے کہا

کہ اناللہ واما الیہ ماحسون۔ قومی طاقت کے بڑا دل آہنی سوجہ
 ایک طرف اور ان تقری چری کانٹوں کی جھکا دایک طرف۔ سویت
 پسندوں سے پچھا کہ کہیں اس ناوک کا بھی کوئی جواب آپ کے
 ترکش میں ہے۔ جواب ملا کہ نہیں شکست کا اعتراف ہے۔

پشتم اگر ایسا است عاجز و ناز و مشوہ ہیں
 انظار اق اسے ہوش و تقویٰ اوداع لے مقلدیں

ایکس پھر بہنے دل کو تسلی دی۔ اطبا سے قدیم و جدید کا اتفاق ہے
 کہ چھ گھنٹے کے بعد فدا سے بڑے سے صدمہ خالی ہو جاتا ہے۔ جس وقت
 کو نہیں بلکہ صبح آٹھ بجے ہے اور انگریزی کھانا بوجہ سادہ اور بے آمیز
 ہونے کے قدرتی طور پر زود ہضم ہوتا ہے۔ اب ایسوی یہ قدرتی
 نفیس کیا شقیل ہوگی کہ صبح تک صدمہ میں فروکش رہے اور آدائیں
 نکلیں تو صحت کی جگہ صدمہ ہے۔

اہلال، نشیم شبی کا صبح نماز ۵۰ فروری ۱۹۳۷ء

آغا علی دہلی (ابراہیم بکر)

”جن لوگوں نے ان عجیب و غریب گھڑیوں کو نہیں دیکھا
 ہے حال ہے کہ انھیں اس کی کیفیت سمجھائی جاسکے۔ چہرے ہوشیار
 ایمان سے نرغ، گردن کی رگیں ابھری ہوئی، نگے شدت شوق
 ہنگامے سے پڑے ہوئے، ہاتھ میں اچھتی ہوئی ٹوپیاں، احمد
 پاؤں کو اضطرابِ رقص سے قرا نہیں، منہ سے کف اڑ رہی تھی
 اور چوں کہ قریب قریب کھڑے تھے اس لئے آپس ہی میں ایک
 دوسرے کے چہرے پر پڑا ہی تھی۔ رومال نکال کر منہ پر نیچتے
 اور پھر کف الاتے، منتقلین جلسہ کو کیا معلوم تھا کہ بارہ دہی کے
 اسٹیم سے میدانِ رقص کا کام لیا جائے گا۔ ورنہ اس کی
 رعایت ملحوظ رکھتے۔ نتیجہ یہ تھا کہ جوشی تو اجد میں گردشِ رقص
 کی جگہ نہیں ملتی تھی۔ اس سلسلے جو رقص میں جہاں کھڑا تھا وہیں اپنے
 پاؤں سے ایک کے چم میں تختوں کو کوٹ رہا تھا۔ یہ رقص مخلوبہ
 کا اصلی ایک تھا اگر (سرہنری اورنگ) زندہ ہوتا اور اس لمحہ
 کو دیکھتا تو یقیناً ہے کہ ان پر جوش و خروشوں کی ایک کھیپ تو
 فروزا اپنے ساتھ لے جاتا۔“

اہلال - ۳۰ مارچ ۱۹۳۷ء، نشیم شبی کا صبح نماز،

چند تذکرات

مولانا کے نقش قدم پر چلنے والوں کی تعداد کثیر ہے۔ اہلال صرف ان کی
 سیاسیات ہی کا آرگن نہ تھا۔ بلکہ کالج کے فوجیوں کے انداد بی ذوق و بیاری
 پیدا کرنے کا بھی ایک موثر آلہ تھا۔ راقم الحروف کو بھی اندھ پڑنے کیلئے کاشوق
 اہلال کے مطالعہ ہی سے پیدا ہوا اور پھر اہلال ہی میں ”ابراہیم بکر“ کے نام
 سے معنامیں مکمل شروع کئے جو مولانا کی اصلاح و تہذیب کے بعد اہلال میں
 شائع ہوتے رہے۔

ایک بات کا طوطا لکھے تمام عروج ہے گا۔ اہلال جب اپنے اشاعت
 کے شباب پر تھا۔ مولانا نے مجھے اس کے عملاً ادارت میں شامل ہونے کی
 دعوت دی۔ مگر اپنی ناقصہ کاری سے میں نے تکمیل تعلیم کو ترجیح دی اور مذکور
 حق یہ ہے کہ مولانا کی صحبت ایک ایسی جنس تھی جو ہر قیمت پر خریدنا چاہیے
 تھی۔ اسی زمانہ میں مولانا نے مسیحیائیوں کو بھی بلایا تھا۔ یہ
 صاحب اہلال کے اداہ میں عرصہ تک رہے اور مضمون نگاری کی خوب

دودھی۔ اہلال کے بہت سے مضمون ایسے ہیں کہ لوگ اب تک مولانا کے رشتہات قلم سمجھتے ہیں۔ مگر دراصل وہ نقوش بیگانی ہیں۔ مثلاً کانپور کی مسجد کے مسئلہ پر زبردست مضامین کا سلسلہ سید صاحب ہی کا لکھا ہوا ہے۔ مگر کون کون کتا ہے کہ وہ مولانا کے قلم کا اثر نہیں۔ مولانا کا اسلوب تو یہ بلاشبہ ناقابلِ نقل ہے۔ لیکن اہلال کی بعض تحریروں جیسے جید ناظرین کے سامنے رکھ دی جائیں۔ وہ پوچھا جاسکے کہ کون سی تحریر مولانا کی اور کون سی سید صاحب کی ہے؟ قہرنا شکل ہوگا۔ مولانا کے مضامین اور مقالات جمع اور شائع کرنے والی کمیٹی میں ایسا شخص ہونا چاہئے جو سید صاحب کے مضمونوں کو مولانا کے مضمونوں سے الگ کر سکے۔

چالیس برس سے زیادہ عرصہ گزرنے کے بعد جب مولانا پہلی بار پندرہ کی عمری کے علاوہ نام پور سے کھڑے ہوئے تو میرا قیام رام پور ہی تھا۔ اہلال سے سلی رابطہ ایسا نہ تھا کہ یاد رکھنے کے قابل ہو۔ لیکن مولانا کو سب یاد تھا۔ نہایت گہر خوشی سے مجھے دہلی آنے کی دعوت دی اور واپس تشریف لے جانے کے دو ڈیڑھ مہینہ کے بعد پروفیسر محمد اجمل خاں صاحب کا خط آیا۔ عرض نہیں کر سکتا کہ محبت کے چند دن کس مٹل سے گئے۔ اور اہلال کے دفتر میں شامل ہونے کی حماقت پر میں نے اپنے تئیں کتنی نفی کی۔ مولانا شاکی تھے کہ دہلی میں کوئی ایسا ہم ذوق وہم نہ تھا جس کے ساتھ گہری دوگمراہی بات کی جا سکے۔ یہ امر واقعہ ہے کہ اپنی افتادہ طبیعت کے اعتبار سے وہ دیاسی ہنگاموں بلی کے تیز قدموں اور شہرت پسندی سے نفور تھے۔ وہ پڑھنے لکھنے اور غور و فکر

کے لئے گوشہ تنہائی کے طالب تھے۔ لیکن ان شورشوں نے ان کا بچا نہ چھوڑا اور ان کی مادی زندگی انہیں ہنگاموں میں رکھی۔ مگر جیسا عرض کیا گیا ان کی ہنگامہ انگیز سیاسی تقریریں بھی اعلیٰ ادب کا سبہ نظیر نمونہ ہیں۔ مولانا ہر رنگ ہیں ادیب ہی ہیں۔

یہ ہر رنگ کے خواہی جامہ پوش

من اندازِ قدرتِ رامی شناسم

مولانا کی شخصیت کی نفسیاتی نمبر کی بنیاد تخیل پر ہے۔ تخیل ہی نے ان کے

ادب میں ایک بے مثال رموزیت Symbolism پیدا کر دی ہے۔ تخیل ہی ان کے کردار و استعداد کا سرچشمہ ہے اور تخیل ہی ان کے فلسفہ یا مذہب میں تخیل استلال کے جیس میں ظاہر ہوتی ہے۔ حقیقت میں ان کی جگر ادبیات عالیہ ہی کا میدان ہے۔ دیگر میدانوں میں ان کا درود و ہلے پر درشس کا مصداق ہے۔

تصنیفات

مولانا کے مضامین سے رسالہ اندودہ، اہلال اور البلاغ مالا مال ہیں اور ان کے بچہ کرنے اور سلیقے سے کتابی شکل میں شائع کرنے کی ضرورت ہے۔ ان کی بڑے تصنیفات مثلاً ترجمانِ قرآن، تذکرہ، خواب، خاطر و فیروہ کے علاوہ ان کے بعض منظر مثلاً خونِ شہادت کے دو قطعہ "اوسبہ نوہ" مستقل طبع پر طبع ہونے کے مستحق ہیں۔

موعظہ و ذکر کی

"... اگر پانی کہے کہ میری کالہ رانی ہے تو آفتاب بھی چمک سکتا ہے کہ یہ اس کی حرارت کا مجموعہ ہے۔ اگر دہقان مٹی ہو کہ اس نے بیج ڈالا تو موسم اُس سے جھٹکا سکتا ہے کہ بغیر میرے آنے ہوئے مٹی تم میری کیا کر سکتی تھی؟ مزدوروں نے بل جوتا کاشت کار نے بیج ڈالا۔ نگاہوں نے رکھوالی کی اور موسم نے آبپاشی اور ان میں سے ہر ذوق و محنت کو سکتا ہے کہ میں ہی اس پہلالتے ہوئے کیفیت کی وجہ پذیر میری کی علت ہوں مگر وہ جو ان سب سے بالاتر قوت ہے کہتی ہے کہ تم سب بیج ہو۔ اگر قدرت الہی تمام اسباب و وسائل بتیاد کرتی تو تو ایک بیج بنا اور نہ ایک سبز پتہ زمین پر نظر آتا۔"

(اہلال ۳۳ (دوری ۱۹۱۳ء)

مولانا ابوالکلام آزاد

مگر تمہا کرتے ہیں اس دنیا میں وہ مردانِ کار
زندگی اپنے محاسنِ خود بیاں کرتی نہیں
زندگی رکھتی ہے آخر شہرِ بقا میں کچھ نفس
جب ساقی ہے یہ بڑھ کر دستوں میں موت کی
ثبت ہو جاتا ہے لوحِ دہر پر اس کا دوام
زندگی جس صحت جب چاہے بدل سکتی ہے رخ
اپنے زشت و خوب میں ہوتی ہے ساری زندگی
زندگی ہے موت کے تابع مگر ایسا ہم
زندگی بھر کے خیالوں ہی کا ہے اک خوابِ موت
بالعموم انسان کو موت آتی ہے سب زندگی

انفراق اسے غنولتِ بے بندِ مرگ و حیات

موت کے راس پہ نہایت، زندگی کے شاہکار

تیری مرگ و زلیلت، وحشت ہیں اک زنجیر کے
تھا اسی کا مقتنی تیرا مسلِ آغز سے
ماہم انسانیت کرنے کو تیری موت پر
سندھ جن کی انیلت کا ہے تاخیرِ انقراض
موتِ اندر موج تھا اک تسلیمِ ذخیرِ ہم
ماگڑ تھا ردِ ترا اور ماضی تیرا قبول
ورکھ جامِ شریعت در کھنڈ سندھِ عشق
تیرے ہی نقشِ قدم پر پڑتے ہیں سب کے قدم

سلسلہ کردار کا تیرے ہے شمس کو ہمارا
زندگی جس موت پر پہنچ ہوئی پیمانِ کار
آج شاید آسمان پر ہوں طالعِ موگوار
چند ان اسلاف کا تھا آخری تو یادگار
علم کا تو ایک عالم تھا دیارِ اندر دیار
نہی دامنِ دین برحق تیرا ترک و اختیار
تو شیرِ عقل تھا اور تو جسٹس کا مستشار
کس قدر زندگی ہے تو نے حکمتوں کی رہنمائی

دیکھ کر انداز تیری روح کے روزِ ازل
 پھر بنائے پختیٰ شکریہ تیری زندگی
 ہو سکا تجھ تک پہنچ کر مغترِ مدبرِ جہاں
 تھا ترے آغزِ عظمت ہی کا پرچمِ اہلال
 کس قدر ویران ہے مستقبلِ انسانیت
 ہو سکے گی کسی تلافی اب جنِ مافات کی
 مٹی تری و فحش تواضع میں سرافازی کی شان
 پیش پا آنت وہ رہتی تھی یہ مدِ عجز و نیاز
 فاطمہ تیری طلاق پر اگر تیرا بان تھا
 اس طرح منہ سے ترے جھڑتے تھے پھولِ افادہ
 جنبشِ ادنیٰ بھی تیرے بلک کی اعلیٰ ادب
 نامہ اعمال و دوست آئیں گے جس وقت لوگ
 ناموافق جس قدر ہوتی سیاست کی فضا
 قلندرِ احمد نگر کو یاد ہیں وہ صبح و شام
 تھا ترے نزدیک صبحِ وقتِ آزادی بند
 لال پریشاں کن تری جمعیتِ خاطر کو تھا
 تو امیرِ کارواں بھی تھا امامِ الہند بھی
 نہ تائے عزم تیرا اس سے ظاہر ہے کہ تھی
 تھا جہاں نوابِ فہریت تیرا خود شیدِ حیات
 سربراہِ افلاک بس زمین کو کر گئی کشت کی نظر
 مسجدِ جامع! تری رفعت کا ضامن ہو گیا
 سربراہِ سجدہ ہے وہ تیری سیڑھیوں کے سامنے
 اُس کے ذمے تھے جو تیرے حق وہ پورے کر گیا

دی حیات و نبوی تجھ کو ابد نے مستعار
 اپنی ایک اک سانس میں رکھتی ہے قرون کا شمار
 ہو سکے گا اور کیا فوزِ عظیمِ روزگار
 مٹی تری صبحِ غنیمتیں روکشِ نصرتِ الہند
 عالمِ تخلیق میں ہے اک خدائے بے کنار
 حشر تک شاید رہے گی چشمِ ہستی اشکِ بار
 تیری افتادِ طبیعت میں ہمارا کا وقار
 یکلا ہی سے تری شانِ کلا و تا جسدِ
 مٹی طلاق تیرے اندازِ خلافت پر نشا
 خلد سے جیسے ہماراں کا گھر ہے اک اُبشار
 خازنِ رولے نگارِ شش تیری خاطر کا غبار
 حشر میں تو آئے گا تفسیرِ قرآن در کسار
 ہمتِ عالی کو ہوتی اتنی ہی کچھ سازگار
 مٹی جہاں شامِ خزاں تیرے لئے صبحِ بہار
 جسدِ افرونگی کا دُور قید و بند و گیرِ دُور
 مسلم بندوستان کا افراق و انتشار
 ماسوائے ملکِ ملت کا بھی تھا تو ذمہ دار
 ہر ہوں کی منہلِ مقصود تیری رہ گزرا
 اب حیاتِ افروزِ عظمت ہے تری شمعِ مزاد
 زیرِ پائے مسجدِ جامع بیتِ کمرِ مزاد
 علم و دین کا اک ستوں، عزم و میل کا اک منار
 تیری محرابوں میں بھی ایسے نہیں طاعت گزرا
 اب ترے ذمے ہے اُس پر رحمت پروردگار

ثبت ہے عظمت تیری رہبرِ توفیقِ دوام

یہ عظیم المرتبت تربیت، فلکِ رفعتِ مزاد
 لے نہایت ہوا بھلا ہر

تذکرہ

”ان اور انی پریشان کی تالیف کا باعث ایک دوست ہویر کا امر تھا! مولانا نے تذکرہ کے آخر میں تحریر فرمایا ہے ”اب وہ شعر ہیں کہ اپنے حالات بھی قلمبند کروں۔ اس تمام داستان سرائی کے اہتمام سے ان کا اصل مقصد یہی تھا۔“ تذکرہ اسامی فکر کے موضوع پر ایک مقالہ کی حیثیت سے بڑھا جا سکتا ہے۔ اس کی حیثیت ایک کتاب سے بہت زیادہ ہے۔ وہ ایک اثناسیہ ہے، ایک شخصیت ہے، ایک شعور اور جوش ہے، ایک الہامی واعظ کی قوت نطق، ایک بڑے دل کا گریوٹیکا، ایک المیہ کا موزون نغمہ اور ایک نچ کا مسرت انگیز نمونہ، وہ ایسی خود نوشت سوانح عمری ہے جو ایک تصور کا پسند میں گئی ہے اور ایسا تصدق جو فطرت انسانی کی حقیقی جاگتی تصویر ہے۔

لیکن تذکرہ ایک انوکھی کتاب ہے وہ کتاب نہیں جس کی خواہش ناخر کوئی۔ ان کا مقدمہ بہت دل چپ اور قابلِ توجہ ہے۔ وہ مزید ایسے مشاہد پرست معلوم ہونے ہیں جو تمام مشاہیر کی پریشانی کا باعث بن جاتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ ان کی مولانا آزاد سے سلسلہ میں واقفیت ہوئی۔ اس وقت مولانا طالب علم ہی تھے۔ انھوں نے مولانا آزاد کے انتقال کو دیکھا۔ جب مولانا آزاد نے ”الہدائی“ شائع کرنا شروع کیا اور ہندوستانی مسلمانوں کے قلوب کو ایک خاص اثر سے مسکرایا تو مرزا فضل الدین کو خیال ہوا کہ اس کا عین وقت ہے کہ ایسی پر اثر شخصیت کے مدحوں کو ان کے حالات سے واقفیت ہوئی چاہیے۔ لیکن مولانا آزاد نے ان کی خود نوشت سوانح عمری کی فرمائش کا مذاق نہ کر لیا۔

”کتی بزرگ اور عظیم دانشور زندگیاں سادہ سے سامنے ہیں جن

کے سوانح اور حالات نہیں لکھے گئے۔ ان کو نظر انداز کر کے میری زندگی کے حالات مرتب کرنا محض ایک مسوئیت پر حرکت ہوگی۔ لیکن یہ بات قابلِ فکر ہے کہ مرزا فضل الدین مزاج کے معاملہ میں نکتہ رس نہ تھے۔ انھوں نے مولانا آزاد پر مسلسل تعارض جاری رکھا۔ یہاں تک ان کو یہ وعدہ حاصل ہو گیا کہ ”ہر ہفتہ لکھ“ ملتا رہے گا۔ جو کچھ ان کو ہر ہفتہ ملتا رہا اس سے ابتداء میں مرزا فضل الدین نے یہ سمجھا کہ مولانا آزاد اپنی خود نوشت سوانح عمری کو اپنے خاندان کے حالات سے شروع کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن جب مولانا آزاد موضوع سے ہٹنے لگے اور یہ معلوم ہونے لگا کہ وہ اصل مضمون پر آنا نہیں چاہتے تو مرزا فضل الدین اس پر مجبور ہوئے کہ ان کو دو لکھیں اور فائنل کر دیں کہ مختصر لکھیں اور مطلوبہ موضوع پر لکھیں۔ لیکن مولانا آزاد کسی ہدایت کے پابند ہونے والے نہیں تھے۔ انھوں نے احوال کے جواب میں لکھا: ”میری طبیعت میں رکاوٹ نہ پیدا کرو۔ جو کچھ بے اختیار رقم سے نکل جاتا ہے بھیج دیتا ہوں، جمع کرتے جاؤ ہر حال میں فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔“

لیکن مرزا فضل الدین بھی مایوس ہونے والے نہیں تھے۔ وہ رانچی پہنچ گئے اور مقیم ہو گئے۔ مولانا آزاد رانچی میں نظر بند تھے۔ مرزا فضل الدین پندرہ سو سال ایسے مقررہ کر کے لکھ کر جن کے اندر مولانا آزاد کی زندگی کے تمام تفصیلات آجاتیں۔ انھوں نے مولانا آزاد سے ان معاملات کے بالتحریر جوابات کا احوال کیا لیکن مولانا آزاد نے اپنی شخصیت کو شاعرانہ اشارات کے مابین پردے کے اندر چھپایا اور اپنے وجود کو گویا ایک روحانی ہم تنایا اور ان کی مادی زندگی ایسی ہو گئی کہ موضوع کلام سے خارج ہو گئی مرزا فضل الدین

کچھ زمانہ ہو کر وہ ناکامیاب رہے۔ لیکن ہم یہ سمجھتے ہیں کہ مولانا آزاد نے جیسی صحافت جو یہی کہی ہے ایسی نہ لکھی جائے تو کس قدر غلط فہمی کا باعث ہو سکتی ہے تذکرہ دو جلدوں میں لکھا جانے والا تھا۔ مرزا فضل الدین کی فصل متشکک کی قطع برید اور طویل حاشیوں کی کاٹ چھانٹ بھی اس کو مختصر نہ کر سکی لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ دوسری بار کاشائے ہونا بہت بعید ہے تو انھوں نے خود نوشت سوانح عمری کا متناہر ہر جلد کے ضمیر کے طور پر شامل کر دیا۔ کوئی کتاب پیشہ کار کی خواہش کے اس قدر خلاف ہو سکتی ہے جتنا کہ تذکرہ ہے اور ایسا بھی شاذ ہی ممکن ہے کہ کوئی مصنف جس نے اپنے خیال اور قلم کو آزاد ملک پر اور ترقی اور تعلیم کے استقلال کا لحاظ چھوڑ دیا ہو۔ اس طرح ناگزیر کے دام میں آگیا ہو کہ وہ مسودہ پر نظر ثانی کر کے، سوا لوں کی جانچ کر کے اور پروف بھی نہ پڑھ سکے۔ جب دولت کتاب چھپ چکی تو مولانا کو اطلاع کی گئی کہ کیا ہو رہا ہے۔ انھوں نے بے اعتنائی سے کہا: ”لوگوں نے اپنی دل بھی اور ذرا غلطی کی یادگاریں چھوڑ دی ہیں۔ اپنی پریشان خاطر ی اور پرمانندگی طبع کی بھی ایک یادگار ہے تو بہتر ہے۔“ یہ غیر عمدہ آدمی ہے جس نے تذکرہ کو ان خاص کا ایسا موثر بیان اور مذہبی اور اخلاقی مسائل کا اس قدر پُر ہوش خاکرہ بنا دیا ہے اور اس ہی سبب سے ہے کہ اس سے مولانا آزاد کی شخصیت واقعی طور پر اس قدر منعکس ہوتی ہے کہ کسی صبح سے صبح سوانح عمری سے بھی ظاہر نہیں ہو سکتی۔ تذکرہ واقعی موضوع نہیں ہے۔ حمایت حق ہے جس کی تکمیل کے لئے مقرر تعلیم و فضل اور اخلاقی پُر زور اقتدار اور غیر معمولی قدرت کے طرز بیان سے کار فرمائی کی گئی ہے۔ مولانا آزاد اس سے بھی واقف ہیں کہ کس بیانات کی کمی کی طرف اشارہ کیا جاسکتا ہے اور وہ کہتے ہیں کہ وہ بالالادہ ہیں اور ان کا مقصد ان کے موضوع کی زیادہ موثر وقت ہے۔ ان کو اس کا بھی یقین ہو گا کہ بیانات میں جو غلطیوں نے اپنے ذوق سے کیا ہے وہ اک دل آویزی ہے اور ناظرین کو گرا کر نہ میں ناکام نہیں ہو سکتا۔

تذکرہ کہاں سے شروع ہوتا ہے؟ ابتداء میں جہاں مولانا آزاد اپنے خاندان کا مختصر ذکر کرتے ہیں اور اس استقلال پر غم کرتے ہیں کہ خاندان سے آدمی نہیں بنتا۔ اور ان میں تیر میں وہ اپنی سوانح عمری لکھنے ہیں۔ فی الحقیقت تذکرہ کو کما حقہ سمجھنا ممکن نہیں جب تک کہ اس کو اختتام سے شروع نہ کیا

آج کل دہلی (الہام بکس)

جائے۔ اس سے نہ صرف ان کا انداز فکر واضح ہو گا بلکہ ان کا زور بیان، روانی، ان کی اشاریت، ان کی آند و زبان کے زمین و آسمان کی خداوندی بھی وہ صرف ادبی اکتساب ہی نہیں ہے بلکہ وہ روحانی قوت ہے اور اس بچی کا نتیجہ ہے جو اس دنیا کی روشنی سے نہیں ہے۔ تذکرہ عمیق روحانی کیفیت مزاج کی تخلیق ہے اور اس ہی کیفیت مزاج کے اثر میں پڑھا جانا چاہیے۔

یہ غریب الدیار، عہد، وراثتائے عہد، بیگانہ خویش، و ملک پروردہ ریش، معمورہ دنیا و خواہرست کہ موسوم بہ احمد و محمد و ابی الکلام ہے ۱۸۸۸ مطابق ذوالحجہ ۱۳۰۵ ہجری میں ہستی عدم سے عدم ہستی میں وارد ہوا۔ او بہت حیات منتہم، الناس نیام، اذما تو فایتہوا۔

شروع شد و خواب عدم چم کشودیم دیدیم کہ باقیست شب فتنہ فزودیم والد مرحوم نے تاریخی نام ”فیروز بخت“ رکھا تھا۔ اور مرحوم ذیل سے ہجری سال کا استخراج کیا تھا جو ان بخت دہاں طالع، جو ان باحکام الشہد بخت کی فیروزی اور طالع کی ارجمندی، نیمہ عمر ملازمتوں اور ٹھکروں کی پامالی و در ماندگی میں بسر ہو چکی ہے۔ نیمہ عمر خوشایند باقی ہے دم لینے اور ستانے میں ختم ہو رہی ہے۔ نہ منزل مقصود کا پتر ہے نہ شاہراہ منزل پر قدم، جب پاؤں میں تیزی اور نہت میں جوانی تھی تو رہ فوری اور منزل طبعی کا ہدفازہ نہ کھاتا تھا اب پامالیوں اور اقدامیوں سے نہ قدم میں پامردی رہی نہ ہمت میں کار فرمائی تو طلب نے آنکھیں کھولیں اور غفلت نے کروٹ بدلی۔ راہ دور اور نشان منزل تم، کیشر زاد خالی اور مرد سامان کار ناپید، وقت چاچکا اور ہر آن و لحوا و لا مقصود سے دوری اور منزل مراد سے ہجوری بڑھتی گئی۔ اب قدم کی تیزی اور ہمت کی چستی واپس بھی مل جائے پھر بھی وہ دولت و وقت کب واپس مل سکتی ہے جو ٹپکلی؟ اور قافلہ امید کب پس ماندگان غفلت کی خاطر لوٹ سکتا ہے جو چاچکا؟

رقم کہ خاندان پاکشتم و محل نہاں شدانظر۔ ایک لمحہ غافل بودم و صد سالہ ماہم شد ماری فیروز بختی و جوان طامی کا معاملہ آج نہیں کل فیصل ہونے والا ہے یوم تبیض وجوہ و تود وجوہ۔ اصلی فیروز مندی وہاں کی فیروز مندی ہے۔ اور جوان بخت وہی ہے جو اس آنے والے دن آئینش میں پورا اترے نکل امبری منہم و میڈشان یغنیہ۔ اگر وہاں روح و ریحان و جنت النعیم

اگست ۱۹۵۵ء

عشق سے مراد عشق محدود و ناقص یعنی مجاز ہے۔ نہ کہ ملی الاطلاق، کیونکہ اس
اقتیاد سے تو اول دائرہ جو کچھ ہے عشق ہی ہے۔ تمام کائنات جتنی میں بجز اس
کے ہے اور کوئی؟ آسمانوں کا ستون ہے تو یہی ہے، زمین کا مدار و محور قمر
ہے تو اسی کے دم سے، دنیا میں جس قدر ظاہر ہے یہی ہے، جس قدر باطن
ہے اس کے سوا کچھ نہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ تمہاری نگاہ و بصیرت نا آشنا
سے ایک ہی حقیقت کو طرح طرح کے ناموں سے موصوم کر دیا ہو۔ کہتے ہی
پردے میں جو اسی کے نظری و کثرت بینی نے جمال حقیقت یگانہ و یک رنگ
پر طالی رکھے ہیں وہ

ایک چراغ مست و بین خانہ کا اہر تو ان ہر گامی نگرے، انکے ساختہ اند
بلاشبہ یہ بھی نموش تھی، لیکن اس نغزش کو کیا کہو گے جو محبوب کے قدموں پر
گرا دیئے، مقصود تو ساری باتوں سے اس تک پہنچا ہے۔ اگر نغزش دوستی
ہی رہنا بین جائے تو پھر کیوں نہ ہزار استقامتیں اس پر قربان ہوں، لاکھوں
ہوشیا ریاں اس پر سے بچھاؤں، گر لمبے خواہ زمیں سلطان دین، خاک پر
فرق قناعت بعد انہیں اصل یہ ہے کہ اس ماہ کا سارا عمارت قطع و وصل
اور شکست و پستکی پہ ہے اور قرب ایک منزل ہے جس تک پہنچنے کی راہ بند
ہی میں سے ہو کر نکلی ہے، یعنی ایک سے ملنے کے لئے سب کو چھوڑنا اور ایک
سے جڑنے کے لئے سب سے کوٹنا، اس دروازہ کا کھلنا اس پر موقوف ہے
کہ وہ تمام دروازے بند کر دے جائیں جو چہ کھول لئے تھے۔

وہ قبول نظر عشق ہزاراں شرط مست اول انعامیت رفتہ ندامت باشد

.....
"تو اب اصلی کام یہ ہوا کہ یہ ساری بندشیں کٹیں اور پرستش ماسواچی
اٹھ کی ساری زنجیریں ٹوٹیں۔ اس کے لئے وہی صوفیہ ہیں، یا تو کوئی ایسا
طاقت ور ہاتھ آدمہ عقدہ کشائی ہو کہ گئی گئی کر ایک ایک گرہ کھول دے۔
ایک کے بعد ایک، ساری زنجیریں کھلتی جائیں۔ یا پھر ایک تلوار چپکے جس کا
ایک ہی بھر پور ہاتھ چشم زون میں ساری بندشوں اور زنجیروں کو ٹکڑے
ٹکڑے کر کے رکھ دے، نہ تو گرہ کشائی پذیر ی، نہ زنجیروں کی صلہ شادی
کا انتظار۔ ایک سوکھی کوڑی کو جھلانے کے لئے ہزاروں تدبیریں کیجئے جب کہیں
آگ سے ڈھواں اٹھے۔ لیکن معلوم ہے کہ ہزاروں آشیانوں اور جرموں کے لئے
بجلی کی ایک ہی نظر شعلہ بار کافی ہوتی ہے۔

آگ کل دہلی (ایوان کلام ہند)

گفتہ چہ گو نہ می کشی و زندہ می کشی از یک نگاہ کشت، ہوا ہے و مگر دعا و

.....
"ہوس و عشق پر کیا موقوف ہے، کوئی درمیانی منزل ہو اگر قدم آگے
بڑھنے سے رک گئے تو وہ ہی منزل مبت ہے اور رہو اس کا پرستار، تسبیح امانی
و دوق پر شہری کی منزل کیوں نہ ہو.....

• چنانچہ الحمد للہ کہ اس منزل کے وقت نے بھی زیادہ طویل نہ کھینچا۔
ایک سال پانچ ماہ کے اندر اس کو چہ کے بھی تمام رسم و راہ ایک ایک کر کے
دیکھ ڈالے، کوئی گوشہ کوئی مقام نہ چھوٹا.....

"اس راہ کے رسم و آئین اگرچہ بے شمار ہیں لیکن ہر ہر کو دو مسکوں
میں سے ایک مسلک ضرور اختیار کرنا پڑتا ہے۔ یا قمری و یلین کی آوازی و
شورش یا شش کی خاموشی اور سوزش.....

• اور معلوم ہے کہ شعلوں کی طرح پھوٹنا آسان ہے مگر تورو کی طرح اندر
بی اندر شگن اور حفظ و ضبط کے سارے آداب و شرائط سے ہمہ برابر آشنا
عربان تنی خوش ست، دے زینہ گریست، دامان چاک چاک و گریباں دیدہ را

.....
اگر کسی نے عمر بدشت و جہان لاری کی ہو چکی ہو۔ یہاں ایک ایک گھڑی کا ایک
ایک لمحا ایسا گزر چکا ہے کہ سینکڑوں آہیں اندر ہی اندر پھینکی ہیں۔ ہزاروں شیشیں
سینہ کے اندر چلی ہیں، آنسوؤں کو آنکھوں کی وسعت ذلی تو دل کے گوشہ
ہی میں طوفانی اٹھاتے رہے.....

"اگرچہ اس معاملہ کا خاتمہ بظاہر ناکامی و مایوسی پر ہوا، لیکن فی الحقیقت
فتح و مراد کی ساری شادمانی اسی کامیابی میں پوشیدہ تھی.....

• وہی دنیا جس کے میکدہ خود فراموشی نے غفلت کے جام بھریا تھا
اپنے ہر جلوہ سے آنکھوں کو، اپنے ہر نغمہ سے کانوں کو مٹتی و سرشاری کی بیم
و غوٹیں دی تھیں۔ اب اس کا کوئی نہ کوئی چہرہ، ہوشیاری و بینش کا مرتع تھا
بعیرت و معرفت کا درس تھا۔ ذہن سے ذہن کو گرم گفتا مہیا یا، پتہ پتہ کو کھتے
مسطور دیکھا، پھولوں نے زبان کھولی، پتھروں نے اٹھ اٹھ کر اشارے
کئے، خاک پاواں نے اڑا اڑ کر گہرا فتنایاں کیں، آسمانوں کو بار بار اترنا پڑا تاکہ
معاویوں کا بھاب دیں، زمین کو کتنی مرتبہ اچھاننا پڑا تاکہ فضا آسانی کے تارے
توڑ لائیں، فرشتوں نے بازو تھامے کہ کہیں نمزش نہ ہو جائے۔ سورج پراخ

آگت شہزاد

نہ زیادہ کہیں ٹھوکر نہ لگ جائے۔ سب نے نقاب اتار دیے، سارے پردے چھٹی ہو گئے، سب کی ابروؤں میں اشارے تھے، سب کی آنکھوں میں حکایتیں جھری تھیں.....

• حالات، ابتداء سے جھجھک رہے، سب کے سب اس حالت سے یکسر متضاد تھے۔ جن تک بندہ سچی رسائی میں نہ آئی، قلع نظر اس معاملہ خاص کے عقائد، اعمال، عادات، اخلاقیات، فکر و نظر، طرز و روش، کوئی بات بھی تو ایسی نہیں ہے جس کو اپنے قدرتی حالات کے مطابق پاتا ہوں۔ پس اپنی تشنگی و تشنگی نہ تو کسی ہاتھ کی ممنون ہے نہ کسی زبان کی، نہ کسی خاندان کی، نہ تعلیم و تربیت ظاہری کی، جو کچھ پایا ہے صرف مارگہ و عشق سے پایا ہے۔ بستی و خیال طبعی عرف اُسی مُرشد فیض و ہادی طریق سے ملیں.....

• علم کا مدعا وہ اُسی نے کھولا، عمل کی حقیقت اُسی نے بتلائی، معرفت کے محیط اُسی کی زبان پر تھے، حقیقت کے خزانے اُس کے دستِ کرم میں تھے، شریعت کے حقائق کا وہی علم تھا۔ طریقت کے نشیب و فراز میں وہی رہبر تھا، قرآن کے حید اُسی نے بتلائے۔ سنت کے اسرار اُسی نے کھولے، نظر اُسی نے دی۔ دل اُس نے بنایا، کون سی شکل تھی جو اُس نے حل نہ ہوئی۔ کون سا اہم واقعہ تھا جو اُس کی سبھی ہوئی نظر سے نہ سلگ گیا؟ کون سی بیماری تھی جس کی وہاں اُس کے دارالشفاء سے نہ مل سکی؟.....

• ہاں۔ یہ فرد ہے کہ اگر کسی کو اوّل روز سے اپنے زہد و پاک کی خشک دامن پر نہ پہنچو تو ہم کو بھی اپنی اُس رندی اور ہوسناکی کی تردامنی کا کوئی شکوہ نہیں جس کی عین اکیس بائیس برس کی عمر میں دیکھ جنون شباب کی سرشتیوں کا اصلی موسم ہوتا ہے، دونوں ہاتھوں سے اس طرح پھوٹا کہ ایک نذرہ بھی باقی نہ چھوٹا۔ کوئی صاف ماہ پر دوڑا گیا ہے تو یہ اُس کی خوش نصیبی تھی لیکن ہم بھی اس کو بد نصیبی نہیں سمجھ سکتے کہ کتنی ہی دلدلوں سے پاؤں نکلے کتنی ہی بھڑائیوں میں دامن سنبھالا، کتنی ہی زنجیریں توڑنی پڑیں، دلوں، امیگوں، اُمیدوں، امتناؤں کے کھتے ہی دفترِ خود اپنے ہاتھوں سے جلنے پڑے۔ جب کہیں جا کر اس کو چھین دم لے سکے۔ جہاں آج اپنے آپ کو پار ہے یہی.....

یہ مسلمانوں کے مذہبی فکر کا ایک کار نمایاں ہے کہ پابندی مذہب اور تصوف میں مطابقت کر دی۔ اور مذہبی غلو جو شرعی پابندیوں کے اظہار

میں بطور زیادہ داخل ہو گیا تھا۔ اس کی اصلاح جوش ایمانی کی قدر و منزلت بڑھا کر کر دی، خدا کی نگاہ میں منفصل گنبد گھر کو، اُس غنا طہنہ شریعت سے، جس کی طاعت رسمی و دواچی ہو لیکن دل سرد ہو، اکثر زیادہ بلند مرتبہ مرحمت ہوا ہے۔ لیکن تذکرہ محض آزادی کی حمایت نہیں تھا۔ اس کے برخلاف، مولانا آزاد پابندی مذہب کی، اُن لوگوں کی پابندی مذہب کی جنہوں نے حق اور کلمۃ الحق کی زمانہ ساز فقیہوں اور غیر محتاط مصلیوں اور بے دین حکمرانوں کے مقابل میں حمایت کی، اپنے مخصوص زور و بیان سے تصدیق کرتے ہیں۔ وہ کسی طرفہ خیال کے پیرو نہیں ہیں۔ وہ قرآن کی یا شریعت کی کوئی خاص تفسیر پیش نہیں کرتے، ان کا خاص تعلق رحمت سے معلوم ہوتا ہے۔ اور ایسا خاص تعلق ظاہر ہوتا ہے کہ جس سے یہ مفہم ہوتا ہے کہ مسیح پابندی مذہب، رحمت سے مایوس عقیدہ لگی ہے۔

• تذکرہ مولانا آزاد کے خاندان کے مختصر حال سے شروع ہوتا ہے۔ تیسرے خاندان میں تین مختلف خاندان جمع ہوئے ہیں۔ اور تینوں خاندان ہندوستان و حجاز کے ممتاز بیوت علم و فضل اور اصحاب ارشاد و ہدایت ہیں سے ہیں۔ دینی عزت و جاہ کی اگرچہ اُن میں سے کسی نے خواہش نہیں کی لیکن دُنیا نے اپنی عزتوں اور شوکتوں کو ہمیشہ اُن کے سامنے پیش کیا اور کبھی انھوں نے قبول کیا، کبھی رد کر دیا۔

مولانا آزاد یہ تذکرہ، یہ ظاہر کرنے کے لئے کرتے ہیں کہ اُن کا یہ خیال نہیں ہے کہ کسی خاندان سے متعلق ہونا کوئی اعزاز و مہیا بات کی بات ہے۔ اُس کے بعد وہ شیخ جمال الدین (د۔ ۱۵۸۱) کا ذکر کرتے ہیں۔ جو اُن کے مادری اجداد میں سے تھے۔ اُس کے بعد وہ اُس زمانہ کا ذکر کرتے ہیں جس میں شیخ جمال الدین تھے وہ اکبر کا عہد تھا۔ اکبر نے مرتبہ خلافت و امامت کا ادعا کیا تھا۔ یہ زمانہ اختلاف ہی کا تھا۔ بلکہ اُس وقت خدیوہ مذہبی فساد مچا تھا۔ صوفی جو وحدت وجود کا عقیدہ رکھتے تھے، بھگت، جو لا فیریت کو مٹا دینا چاہتے تھے۔ صاحبانِ تہذیب، جو ہر چیز میں ہر جگہ ذہنی غذا کے جوہر دیکھتے۔ میاست پیشہ جو حکومت کی فروخت سے اتحاد کے لئے کوشاں تھے، عورتیں، جو خاندانی زندگی میں تقریبات اور مراسم کے اضافہ سے تنوع پیدا کرنا چاہتی تھیں۔ ان سب نے ایسی صورت حالات پیدا کر دی تھی جس سے معلوم ہوتا کہ گویا انسان اخلاقی احکام کی پابندی کے بغیر نہ سکتا۔

لیکن اس صورت حال میں جو لوگ اہل حق کا اڑہ کار بنے اور مذہبی وجہ سے اُن علماء کے مقابلہ میں جو اُس زمانہ کے حالات کو قائل رکھنا اپنا حق سمجھتے تھے۔ اپنے آپ کو خطرہ میں ڈالا۔ مولانا آزاد جس خاص قسم کا تذکرہ میں ذکر کرتے ہیں اُس میں حملہ کے بانی، زمانہ ساز علماء ہی تھے اور حاجی قلی سید محمد جون پوری تھے۔ سید محمد کے اوپر انہوں نے لگایا تھا کہ انھوں نے اپنے مہدی ہونے کا اعلان کر دیا ہے۔ یہ ملکاتوں کا ایک عقیدہ ہے کہ آفریقا میں قیامت سے پہلے امام مہدی ظاہر ہوں گے مخالفت کرنے والے علماء نے سید محمد کی تعلیمات کی مخالفت اور اُن کی اخلاقی اور مذہبی حیثیت کو دبانے میں اپنی تمام طاقت اور اثر صرف کر دیا۔ ظاہری مخالفت سید محمد کے مہدیت کے دعویٰ کی تھی۔ مولانا آزاد نہایت اہمیت سے بیان کرتے ہیں کہ اصل مقصد مخالفت سید محمد کے تجدیدی رجحان، دعوت کلمۃ الحق اور اسوۂ حسد حضرت رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی دعوت کو دبانے کا تھا۔

سید محمد کے اوپر انہوں نے لگایا کہ وہ ایسی باتیں کہتے ہیں جو میرا محض ہیں۔ اور اس سے مولانا آزاد کو یہ شکوکہ کرنے کا موقع ملتا ہے کہ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے مستقل کیفیت وجدان پر فائز کیا ہے وہ کس حد تک اپنے بیانات کے ذمہ دار ہیں اور جس آزادی بیان کے وہ مستحق ہیں وہ اُن کو ملنی چاہیے۔ یہاں مولانا آزاد کی کیفیت بھی واضح ہو جاتی ہے۔ اللہ دے لوگ اُس نفس سے بچانے جاتے ہیں جو اُن پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ اُس زمانہ کے مومنوں پر واجب ہے کہ اُن کے بیانات کو قطعی حقیقتات کا موضوع نہ بنائیں۔ بلکہ اُن کے بیانات میں جو کچھ حق ہو اُس کو اخذ کریں۔

مولانا آزاد کے نزدیک پابندی مذہب پر غزوہ و مباحات اور اعمال سے قائل نفرت ہے۔ وہ اپنی تمام اشتہار دہی کی قوت کو ایسے لوگوں کی بزدلی اور غلط مرتبت بیان کرنے میں صرف کرتے ہیں، جیسے شیخ علائی (دو۔ ۱۵۵۰) شیخ شاذلی، شیخ جمال الدین ابن عربی نے کلمہ حق کی حمایت کی اور زمانہ ساز علماء مثل مولانا عبد اللہ سلطان پوری اور شیخ عبدالنسی کی فاسقانہ اور تباہ کن حکمت عملی کی مخالفت کی۔

یہ دونوں علماء اُس طبقہ کے تھے۔ جس نے شریعت اسلامی میں غیر فاضل تاہریت، غلط اجتہاد اور پاکیزہ اخلاق کے اصولوں سے عدم توجہی کو داخل کر دیا۔ مولانا آزاد اُن ہی حالات کا اعادہ اور تکرار، اکبر کے زمانہ میں دیکھتے

ہیں۔ جو اس سے پہلے زمانوں میں اللہ والوں کو برداشت کرتا پڑے۔ جیسے امام حسین علیہ السلام، شیخ سعید ابن مصعب، امام مالک امام حنبل، امام ابو تیمیہ، وہ اپنے زمانہ میں شک و تذبذب اور بے دینی کی لعنت دیکھتے ہیں اور اُس کو ایسے شغف، سرخوشی اور کمال و ثبوت سے بیان کرتے ہیں کہ اُس کی مثال اردو ادب میں نہیں ہے۔ وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ وہ اعلیٰ حق کرنے والے ہندوستان میں اکیلے نہیں ہیں۔ بلکہ اُن شخصیتوں کے علاوہ جو ذکر آیا ہے۔ شیخ اسلامی (دو۔ ۱۵۴۰) شیخ حافظ (دو۔ ۱۵۷۰) شیخ احمد مرہندی اور شاہ ولی اللہ وغیرہ نے اس سے پہلے حمایت حق کی۔

ایقان کے سچے دہلوی کی تمام زندگی عمل صالح کے سچے وقف کرنے کی بدگامیوں سے مقابلہ کرنے کے عزم کی اور اللہ کے عفو و غم میں شرکت کرنے کی فروخت ہے۔ تذکرہ میں خاص طور پر اسلامی روایات کا ذکر ہے۔ اور یہ مولانا آزاد کے ارتقا کے خیال کا نسبتاً ایک غیر بچہ منزلہ ہے۔ جس میں اُن کی بعد کی تصنیف ترجمان القرآن کی عالم گیریت کم ظاہر ہوتی ہے۔ ان دونوں تصانیف کے درمیان یقیناً پندرہ بیس برس کا تفاوت ہے۔ یہ دونوں قطعاً مختلف حالات میں لکھی گئی ہیں یہ گفتگو ہو سکتی ہے کہ جس کیفیت مزاج میں تذکرہ لکھا گیا۔ اُس میں تبدیلی واقع ہو گئی ہو۔ مولانا آزاد کی سبک معرفت نے اس بات کو اُن پر واضح کیا کہ تصورات حق و صداقت میں نیک کام کرنے سے فراخ تر میدان کا شامل ہونا اور حافی فروخت ہے۔ اور اس نتیجہ نے اُن کا تصورات حق و صداقت اور زیادہ وسیع کر دیا ہو۔

لیکن واقعات ایک دوسرے رخ کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ مولانا آزاد میں تبدیلی نہیں ہوئی وہ مسلم رہنما سے ہندوستان کے سیاسی لیڈر نہیں بنے۔ تذکرہ سے اُس کیفیت مزاج کی تصویر نظر آ جاتی ہے۔ جس کیفیت میں وہ قوی تحریک سے نہایت موثر ہو گئے تھے کہ حق کی حمایت کریں اور اپنے ساتھ زیادہ سے زیادہ ایسے لوگوں کو شامل کریں جو اُن کی روحانی زبان سمجھتے ہوں اور عظیم اخلاقی روایات کی حمایت کرنے کے لئے طلب کے جا سکیں اُن کا تمام استدلال اپنے اندر وہ وعدہ مضمر رکھتا ہے۔ جو ترجمان القرآن کے اندر پورا ہوا، کلمۃ الحق کی تشریح اور تفسیر کا وعدہ، تنکھ و ادب و تعجبان القرآن ایک دوسرے کے متمم ہیں اور ترجمان القرآن کی روشنی میں تذکرہ سے تبلیغ عقیدہ کو، اپنے خطیبانہ طرز بیان میں پیش کر کے، عالم گیر مقبولیت اور رفعت حاصل کی ہے۔

مولانا آزاد - غبارِ خاطر کے آئینے میں!

ان میں سے ہر شخصیت میں اُن سے کہا جاسکتا ہے کہ
ع - نرن بالاکن کہ اور زانی ہنوز
ان خطوں میں مولانا کی انفرادیت نظر آتی ہے وہ آزاد ہونے کو
لکارتا ہے کہ مجھے لاکر تو دیکھ دوں مدد مند رکھتا ہے اور سوتا نہیں لذتِ غم
کے مزے لینا ہے اور پرے پرشکن نہیں آنے دنیا دہ تو یہ ہیں صیغہ واحد
غالب میں لکھنے لگا ہاں تو مولانا فانتے ہیں۔

جس قید خانے میں صبح ہر روز سگڑا ہوا جہاں شام
ہر روز پردہ شب میں چھپ جاتی ہو جس کی راتیں کبھی دنوں
کی قندیلوں سے جگمگاتے گنتی ہوں کبھی چاندنی کی حسنِ افریدیوں
سے جہاں تاب رہتی ہوں جہاں دوپہر ہر روز جگمگاتے شفقِ ہمدرد
نکھرے پرند ہر صبح و شام چپکے اُسے قید خانہ ہونے پر بھی
عیش و مسرت سے خالی کیوں کہ لیا جائے؟
اسی طرح سونے جاگنے کے معاملے میں لکھتے ہیں۔

”زندانیوں کے اس قافلہ میں کوئی نہیں جو محو غریب کی
معاذ میں میرا شریکِ حال ہو..... زندگی کی بہت سی باتوں
کی طرح اس معاملہ میں بھی ساری دنیا سے اُلٹی ہی چال میرے
حقہ میں آئی، دنیا کے لئے سونے کا جو وقت سب سے بہتر ہوا
وہی میرے لئے بیداری کی اصل پونجی ہوئی لوگ ان گھڑیوں
کو اس لئے عزیز رکھتے ہیں کہ خوابِ شیریں کے مزے لیں میں
اس لئے عزیز رکھتا ہوں کہ بیداری کی تلخ کامیابیوں سے لذتِ یاب

یوں تو پہلی صدی سے اب تک اردو میں خطوں کے کئی مجموعے شائع ہوئے
لیکن پہلی صدی میں غالب کے خطوط (مجموعے معنی اور عودِ ہندی) اور موجودہ
صدی میں مولانا آزاد کے مجموعہ خطوط (غبارِ خاطر) کو طرۂ امتیاز حاصل ہے
دونوں کا اندازِ نگارش جدا لیکن دونوں نے بات ہیں بات پیدا کی ہے۔ مولانا
کی زندگی غالب سے کہیں زیادہ ہرگز نئی اس لئے ان کے خطوط میں جو نکات
اور مسائل پائے جاتے ہیں وہ غالب کے ہاں نہیں پیر بھی غبارِ خاطر میں مولانا
نے سیاسیات کے تذکرہ سے گریز کیا ہے اگر کہیں اشارے ہیں تو اس انداز
میں کہ مکتوب الیہ سبہ جیسے غالب کے خطوط مختلف دوستوں، دشمنوں، شاہروں
اور شاگردوں کے نام ہیں مولانا کے خطوط صرف ایک ہی مثنیٰ کے نام یعنی صرف
غالب صدر یا درجنگ مکتوب الیہ ہیں۔ غالب نے گھر بیٹھے خطوط لکھے، مولانا کے
بیشتر خطوط جن پر غبارِ خاطر مشتمل ہے، قلمِ محوِ فکر کی نظر بندی کے زمانے
کے لکھے ہوئے ہیں یہ بھی ایک بڑا فرق ہے یہ خطوط مکتوب الیہ تک پہنچے نہیں
تھے لیکن مولانا کے دل کی تسلی ہو جاتی تھی گویا ان کی نوعیت میگزینِ دوست سے
ملتی ہے جہاں ایک گندھرب بادلوں سے بھرا طلب ہو کر اپنے دل کے جذبات
بیان کر دیتا ہے۔ مجھے خود بھی سنا یا فتنہ اور نظربندی کی حیثیت سے
جیلوں میں رہنے کا اتفاق ہوا ہے اور میرا یہ تجربہ ہے کہ جیل کی زندگی جیسے عام
طور پر بے چارگی کی زندگی سمجھا جاتا ہے۔ بڑی شدت کی زندگی ہوتی ہے یعنی
سیاسی قیدیوں اور نظربندوں کی طبیعت کے پورے پورے جیل میں کھٹے ہیں
مولانا اس نظربندی کی حالت میں اپنے اصل روپ میں نظر آتے ہیں۔ وہ نہ
وہ عام نظروں میں یا مولوی ہیں یا سیاسی ہتھیار پھر اس کے بعد وزیرِ تعلیم اور

ہوتا ہوں۔

خلق را بیدار با یہ بود نتاپ چشم من

دیں عجب کا دم کہی گریم کے بیداریت

ایک بڑا فائدہ اس حادثہ سے یہ ہوا کہ میری تنہائی میں اب کوئی

خلل نہیں ڈال سکتا میں نے دنیا کو ایسی براتوں کا شروع سے سوچ

ہی نہیں دیا وہ جب جاگتی ہے تو میں سو رہتا ہوں جب سو

جاتی ہے تو اٹھ بیٹھا ہوں۔

اس آخری جگہ سے گیت کے دوسرے اوصیائے کا یہ شلوک ذہن میں

آ جاتا ہے جو جاتا گا ندھی کے ولیف شام و سحر میں داخل تھا

یافت سرو بھوتا نام تسلیام جاگرت سینی

پیام جاگرت بھوتانی سافا پشتو منہ

دو جو تمام مخلوق کے سزاوت ہوتی ہے اس میں جوگی جاگتا ہے اور

جس میں تمام مخلوق جاگتی ہے اُسے رات دکھائی دیتی ہے۔ یعنی ان منتخباں کو نگار

کی 'سروشام' سے الگ بلکہ متضاد ہوتی ہے۔

اسی انفرادیت نے مولانا میں بے پناہ قوت بہاشت پیدا کر دی تھی

اسی کی طرف اشارہ کرتے ہیں: مرزا غالب نے رنج گراں نشیں کی شکایتیں

کھیں تھیں مہر گریز پائی شکایتیں کی تھیں۔

کبھی حکایت رنج گراں نشیں کھئے

کبھی شکایت مہر گریز پا کھئے

لیکن یہاں نہ رنج کی گراں نشیں یاں ہیں کہ کھوں نہ مہر کی گریز پائیاں ہیں کہ

مناؤں لہجے کی جگہ مہر کی گراں نشیں کا نوگر ہو چکا ہوں مہر کی جگہ رنج کی

گریز پائیاں کا تماشا بنی رہتا ہوں۔

سب سے سخت امتحان کا وقت مارچ۔ اپریل سلسلہ کا تھا مولانا کی گرفتاری

کے وقت بھی اُن کی اہلیہ بیمار تھیں مارچ میں حالت زیادہ خراب ہو گئی اور

اپہرین میں رحلت فرما گئیں اس دہمیا فی وقت میں جیل کے سپرنٹنڈنٹ اور

مولانا کے جیل کے ساتھیوں نے چاہا کہ کوئی سبیل نکالی جائے کہ مولانا فیضی

کا آخری دیکر لیں مگر مولانا کی طبیعت خیر نہ تھی اسے گوارا نہ کیا مولانا لکھتے ہیں:-

"جس وقت تار ملا اُس کے دوسرے دن سپرنٹنڈنٹ میرے

پاس آیا اور یہ کہا کہ اگر میں اس بارے میں حکومت سے کچھ

کہنا چاہتا ہوں تو وہ اسے فوراً لمبی بیچ دے گا۔ درمیان کی

پابندیوں اور مقررہ قاعدوں سے اس میں کوئی رکاوٹ نہیں

پڑے گی۔ وہ صحت حال بہت متاثر تھا اور اپنی ہمدردی کا

یقین دلانا چاہتا تھا لیکن میں نے اس سے صاف صاف کہہ

دیا کہ میں حکومت سے کوئی درخواست کرنی نہیں چاہتا پھر وہ

جو اہر لال کے پاس گیا اور اُن سے اس بارے میں گفتگو کی وہ

میرم کو میرے پاس آئے اور بہت دیر تک اس بارے میں

گفتگو کرتے رہے میں نے اُن سے بھی وہی بات کہہ دی جو سپرنٹنڈنٹ

سے کہہ چکا تھا۔ بعد کو معلوم ہوا کہ سپرنٹنڈنٹ نے یہ بات حکومت

بیسٹی کے ایجنٹ سے کہی تھی: غالب کا یہ شعر غالب سے زیادہ موہنا

کے کیر کیل پر صادق آتا تھا۔

تشنہ لب بر ساحل دیا بخشگی جاں دہم

گر بہ موج انتہا گمان چہیں پیشانی مرا

مولانا کے چند جملوں سے اُن کی اس انفرادیت کا اندازہ کیجئے۔

"وہ گماندار میں دکان لگاتے ہیں تو ایسی جگہ ڈھونڈ لے

کر لگاتے ہیں جہاں خریداروں کی بیوقوفی ہو میں نے جس دن

اپنی دکان لگائی تو ایسی جگہ ڈھونڈ کر لگائی جہاں کم سے کم

گاہکوں کا گذر ہو سکے

دو کوٹے مائیکسٹو دلی سے خرید و بیس

باقا خود فروشی ازاں سوئے دیگر رست

مذہب میں ادب میں سیاست میں فکر و نظر کی جام دا ہوں یہی

جس طرف بھی نکلن پڑا کسی راہ میں بھی وقت کے قانون کا

مناظرہ نہ سے سکا۔

بار فیضانہ زخود رفتہ مسرورست نہ دلہ

میرم مرائے جنوں حیف کرتہا کر دیم

جس راہ میں بھی قدم اٹھایا وقت کی منزلوں سے آشنا دور ہو گیا

کہ جب مل کے دیکھا تو گرد راہ کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا

اور یہ گد بھی اپنی ہی تیز رفتاری کی اڑائی ہوئی تھی۔

جہاں تک انسانی ادبیات کا تعلق ہے مولانا نے ۹ جنوری ۱۹۵۱ء

خط میں اس پر بحث کی اور اسے پڑھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ تجارتی ادب کتنے خیر ہے یہی نہیں بلکہ خطیبانہ ادب اور عوامی ادب کی حقیقت بھی کھل جاتی ہے۔ اس خط میں دنیا کی چند عظیم ہستیوں کے اندازہ فکر کا پورا جائزہ لیا گیا ہے وہ دنیا کے ادب میں قابلِ تہنہ اضافہ ہے۔

مذہبی وفاداری

مولانا مسلمان تھے خاندانی عالم تھے ترجمانِ قرآن فقہ و احادیث کے تمام رموز سے باخبر لیکن بااینہما وہ کڑکڑلاتے نہیں تھے۔ چنانچہ اکتوبر ۱۹۳۷ء کے خط میں اہلیات پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

”دنیا میں وحدتِ اوجود کے عقیدہ کا سب سے قدیم مرتبہ ہندوستان ہے غالباً یونان و اسکندریہ میں بھی یہی ہے یہ عقیدہ چچا اور مذہب افلاطون جدید نے جسے غلطی سے عربوں نے افلاطون کا مذہب خیال کیا تھا اس پر اپنی اشرافی عادات میں اعتبار کریں یہ عقیدہ حقیقت کے تصور کو ہر طرح کے تصوری تشخص سے مبرا کر کے ایک کامل مطلق تصور قائم کر دیتا ہے۔ اس تصور کے ساتھ صفاتِ شکل نہیں ہو سکتیں اور اگر ہوتی بھی ہیں تو تعینات و ظاہر کے اعتبار سے نہ کہ ذاتِ مطلق کی ہستی کے اعتبار سے، اس عقیدہ کا روشن سائنس اس کی ذات کے ہامے میں پہنچتا ہے اور کچھ نہیں کہہ سکتا کیونکہ اگر ہم اپنے اشارات کی پرچھاڑیں بھی اس پر پڑنے دیتے ہیں تو وہ ذاتِ مطلق مطلق نہیں رہتی، شخص اور فہم کے حدود سے آلودہ ہو جاتی ہے یا بالفاظِ فی نے دو معرعوں کے اندر سب کچھ کہہ دیا ہے۔

شکل حکایتِ ست کہ ہر ذرہ عینِ ادست

امانی تو ان کہ اشارت پر او گنست

یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کے اُپنشدوں نے نفیِ ثبات کی راہ اختیار کی اور تریپہر کی نیکی نیکی کو بہت دودھ تک لے گئے لیکن پھر دیکھئے کہ اسی ہندوستان کو اپنی پیاس اس طرح بجھانی پڑی کہ نہ صرف برہما (ذاتِ مطلق) کو ایشور (ذاتِ متصف و شخص) کی نمود میں دیکھنے لگے بلکہ تہر کی مورتی میں بھی تراش کر سامنے رکھ

دیں کر دل کے اٹکا ڈکاکوئی ٹھکانا تو سامنے رہے۔

کرے کیا کہہ میں بوسہ تبرہ تازہ سے آگے

یہاں تو کوئی صوفی بھی ہے واں لٹہ ہی لٹہ

مولانا کی تفسیرِ قرآن میں اُن کی مذہبی وفاداری اپنے بھرپور روپ میں نظر آتی ہے اس اعتبار سے ترجمانِ القرآن کا مقابلہ دیکھ کر تھک کر گیتا رہیہ سے کیا جاسکتا ہے یہ دونوں کتابوں کا گہرا مطالعہ کرنے والا حقیقی معنوں میں مذہبی آدمی ہو سکتا ہے فرقہ پرست کبھی نہیں ہو سکتا اسی خط میں مولانا نے آگے چل کر لکھا ہے۔ ”ہندوستان کے اُپنشدوں نے ذاتِ مطلق کو ذاتِ متصف میں اُتارتے ہوئے جن تنزلات کا نقشہ کھینچا ہے مسلمان، صوفیوں نے اُس کی تعبیرِ احدیت اور واحدیت کے مراتب میں دیکھی۔ اب ذرا ملاحظہ کیجئے کہ مولانا ایک کڑکڑلاتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ مولانا محمد مگر کے قلعہ میں جس کمرے میں نظر بند کئے گئے تھے اس میں چڑیاں بہت تھیں مولانا نے اُن میں سے چند کے نام بھی رکھے تھے جس کا نام ملا رکھا تھا اس کے متعلق لکھا کہ

”ایک چوڑا بڑا ہی تنہا مند اور جھگڑا لڑا ہے جب دیکھو نہ پاں فر فر چل رہی ہے اور مراٹھا ہو اور سید نہ تنا ہوا رہتا ہے جو بھی سامنے آجائے دودھ ہاتھ کئے بیٹھے نہیں رہے گا کیا بچاں کہ ہمسایہ کا کوئی چڑا اس محلہ کے اندر قدم رکھ سکے کئی شہ زوروں نے ہمت دکھائی مگر پیچھے ہی مقابلہ میں جیت ہو گئے جب کبھی فرش پر یا راجی شہر کی مجلسِ آراستہ ہوتی ہے تو یہ سرورسینہ کو جیشن دیتے ہوا اور دہنے بائیں نظر ڈالتا ہوا ذرا موجود ہوتا ہے اور اتنے ہی اُچک کر کسی بلند جگہ پر بیٹھ جاتا ہے۔ پھر اپنے شیوہ خاص میں اس قسملی کے ساتھ چوں چوں چوں چوں چوں چوں شروع کر دیتا ہے کہ ٹھیک ٹھیک تافانی کے داخلے کا نقشہ آنکھوں میں پھر جاتا ہے.... فرطیک اگر اس کا نام ملا نہ رکھتا تو اور کیا رکھتا اور جس چوڑے کا نام صوفی رکھا ہے اس کے صفات یوں بیان کرتے ہیں

”ٹھیک اس کے برعکس ایک دوسرا چوڑا ہے قرف لاشیا

بہ اندامِ ۱۱ سے جب دیکھئے اپنی حالت میں گم اور خاموش ہے

کال را کہ جرشہ فرشش باز نہ

بہت کیا تو کسی کبار ایک ہلکی سا فام چوں کی آواز نکال دی

اور اس تمام چوں کا بھی اٹھانہ غلط و سمن کا نہیں ہوتا بلکہ ایک ایسی آواز ہوتی ہے جیسے کوئی آدمی سر جھکا کے اپنی حالت میں گم چلا رہا ہو اور کبھی سر اٹھا کے پا کر دیتا ہو۔
 "تا قد بیدار شوی نار کشیدم و نہ
 عشق کا۔ بیت کہ بیاہ دفغان نیر کند
 دوسرے چٹسے اس کا یہ بچا کرتے دیتے ہیں گویا اس کی کم مٹنی سے عاجز آگئے ہیں۔ پھر اس کی زبان نکلتی نہیں البتہ نکلا ہوں پر کان لگائیے تو ان کی صدائے خاموش سنی جاسکتی ہے۔

تو نظر باز نہ ہو نہ تنہا فلک مست
 تو محض ہم نہ ہو نہ غموشی سخن مست

میں نے یہ حال دیکھا تو اس کا نام صوفی رکھ دیا "

چاء سگریٹ

کھانے پینے کے معاملہ میں گاندھی جی اور مولانا آزاد کے نظریوں میں بڑا اختلاف نظر آتا ہے گاندھی جی چوکھڑا اور دل کی بنی ہوئی چینی کو سفید زہر کہا کرتے تھے۔ لیکن مولانا نے چاء کی تعریف میں بائیس صفحے لکھ دیئے گاندھی جی نے شکر کی جگہ گڑا استعمال کرنے کو کہا ہے۔ لیکن مولانا کو اس بات پر تاسف آمیز حیرت ہے کہ بھار لال ایسا شخص گڑا کھانا پسند کرتا ہے۔ فوقیہ بیچ "بھار لال چوں کہ مٹھاس کے بہت شائق ہیں اس لئے غلو کا بھی بہت شوق رکھتے ہیں میں نے یہاں بزار کوشش کی کہ شکر کی نوعیت کا یہ فرق جو میرے لئے اس وجہ نمایاں ہے انھیں بھی محسوس کراؤں لیکن نہ کرا سکا اور بالآخر تنگ سر رہ گیا۔"

گاندھی جی سفید شکر کے اس لئے خلاف ہیں کہ اس کا غذائی جوہر نکل جاتا ہے لیکن مولانا یہ چاہتے ہیں کہ چاء کے لئے جو شکر جو وہ بطور کی طرح بے میل اور برف کی طرح شفاف ہو یعنی وہ معمولی چینی سے بھی مٹھاس نہیں کیونکہ ان کے نزدیک یہ دوبارہ شکر اگرچہ صاف کئے ہوئے دس سے بڑی ہے مگر پوری طرح صاف نہیں ہوتی اس غرض سے کہ مقدار کم نہ ہو جائے ، صفائی کے آخری مراتب چھوڑ دیئے جاتے ہیں، گاندھی جی اور مولانا آناؤد کا یہ اختلاف محض سطحی نہیں بات یہ ہے کہ گاندھی جی کا نظریہ حیات انادھی ہے

اور مولانا کا جمالیاتی، گاندھی جی سگریٹ کے بھی سخت خلاف ہیں۔ لیکن مولانا فرماتے ہیں:-

"میں نے چاء کی لطافت و شیرینی کو تمباکو کی تندی و تکی سے ترکیب دے کر ایک کیڑ مرکب پیدا کرنے کی کوشش کی ہے میں چاء کے پیلے گھونٹ کے ساتھ ہی متعلقہ ایک سگریٹ بھی مسلک کیا کرتا ہوں پھر اس ترکیب خاص کا نقشہ عمل یوں بجاتا ہوں کہ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد چاء کا ایک گھونٹ وں گا اور متعلقہ سگریٹ کا بھی ایک کش لیتا۔ ہوں گا۔"

اس معاملہ میں جب گاندھی جی اور مولانا کے نظریوں یا عمل کو سامنے رکھتے تو یہ نظر آتا ہے کہ پٹنٹ بھار لال نہرو کی روش و فوں کے میں ہیں۔ مولانا نے خود اس چاء اور سگریٹ کے بارے میں فرمایا ہے کہ آپ کہیں چاء کی عادت بجائے خود ایک علت تھی اس پر مزید علت ہائے نافرہام کا اضافہ کیوں کیا جائے۔ اس طرح کے معاملات میں امتزاج و ترکیب کا طریقہ کام میں لانا علتوں پر علتیں بڑھانا گویا حکایت بادہ و تریاک کو تازہ کر ہے۔ میں تسلیم کروں گا کہ یہ تمام خود ساختہ عادتیں بلاشبہ زندگی کی غلطیوں میں داخل ہیں لیکن کیا کہوں جب کسی معاملہ کے اس پہلو پر غور کیا جائے اس پر مطمئن نہ ہو سکی کہ زندگی کو غلطیوں سے یکسر معصوم بنا دیا جائے ایہ معلوم ہوتا ہے کہ اس روزگار خراب میں زندگی کو زندگی بنائے رکھنے کا کچھ نہ کچھ غلطیاں بھی ضرور کرنی چاہئیں۔"

اس پر بے ساختہ ہمارا ڈوشا کی وہ بات یاد آ جاتی ہے جو انھوں نے گاندھی جی کی شہادت پر کہی تھی کہ اس دنیا میں فردت سے زیادہ نیک بھی خطرناک ہے۔

توت حافظہ

مولانا نے جس طرح اپنی غلوں میں عربی، فارسی، اردو کے اثر و فکروں کو جا بجا نقل کیا ہے اس سے ان کے حافظہ کی داد دینی پڑتی ظاہر ہے کہ جیل میں تو ان کے پاس وہ کتابیں نہیں جن کے اشعار کئے گئے ہیں۔ لیکن مولانا نے اپنی یادداشت کے بل پر سوائے دیئے دیئے لوگ مانیہ تک نے جب گیتا رہا یہ جیل میں کسی تھی تو انھوں نے سوائے دیئے مگر سوائوں کی جگہ اس لئے چھوڑ دی تھی کہ جیل میں سوائوں پر

یہاں ہولیہ قوت حافظ مولانا کی ایک سوٹی طبع کا نتیجہ سمجھنا چاہیے۔ وہ
 ان لوگوں میں بھی پڑ سکوں رہ سکتے تھے اور سیاسی ہنگاموں میں بھی اپنی ادنیٰ
 انسانیت قائم رکھ سکتے تھے یہ بڑی بات ہے جو اس عالم آب و گل میں خاص خاص
 لوگوں کو حاصل ہوتی ہے۔ اشعار اور فقروں کا برمیل مواد لا جواب ہے۔ اگر
 کوئی جواب ملتا ہے تو وہ کٹھن دین دور کے آئینہ ادیب ڈارڈ اوہری کے یہاں
 پرور ماف لائف اور پتیزس آف لائف کے مختلف نئے مولانا فراتے ہیں۔

بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کوئی بات برسوں تک

حافظ میں تازہ نہیں ہوتی کسی کو سننے میں سود ہی ہے۔ پھر
 کسی وقت اچانک اس طرح جاگ اٹھے جیسے اسی وقت مٹنے
 نے کوڑکھول کر اندر لے لیا ہو، اشعار و مطالب کی یادداشت
 پس اس طرح کی واردات ارد پیش آتی رہتی ہیں۔ تیس چالیس
 برس پیشتر کے واقعات کے نقش کبھی اس طرح ابھرتے ہیں
 کہ معلوم ہوگا ابھی ابھی کتاب دیکھ کر اٹھا ہوں مضمون کے تحت
 کتاب یاد آجاتی ہے۔ کتاب کے ساتھ جلد، جلد کے ساتھ صفحہ
 اور نحو کے ساتھ یہ تمبین، کہ مضمون ابتدائی سطروں میں تقایہ
 و دمیانی سطروں میں نیز صفحہ کا رخ کہ دہنی طرف کا نغیا بائیں
 طرف کا۔

محقق

محقق کی دنیا میں بھی مولانا صعب دہل میں ہیں۔ قلم احمد نگر پہنچے تو
 بہت خوب ہیں وہاں کی ساری تاریخ بیان کر دی۔ چاہا کہ بیان کرتے پرکٹے
 تو اس کی تاریخ تمبین پیچھے کے طریقے سب اس انداز میں بیان کئے کہ چار
 ہینے والا بھی چولا ٹھٹ لے سکتا ہے۔ اگر اکتوبر کے خط اہلیات کا ذکر کرتے
 ہیں تو قدیم عقیدوں سے لے کر جدید تحقیقات تک کے حوالے دی گئی اور
 ان کی کش انداز میں پائے جاتے ہیں۔ وجہوں کے زمانہ سے لے کر انسانی
 لی تیسویں تک اس کی طبع رسا کی ہولانی نظر آتی ہے تمام تمدن ملکوں اور قوموں
 کے قدیموں کی کہانی چند سطروں میں بیان کر کے گویا دریا کو کوڑے میں بند کر دیا
 ہے۔ یہی کیفیت ہر دیکھنے والے کے خط میں ہے جس میں پانچویں صدی مملہ کی مرکز شدت
 و اس کے سیاسی اور علمی نتیجوں کا تذکرہ ہے۔

صاحب

محقق کی دنیا میں بھی مولانا صعب دہل میں ہیں۔ قلم احمد نگر پہنچے تو

بہت خوب ہیں وہاں کی ساری تاریخ بیان کر دی۔ چاہا کہ بیان کرتے پرکٹے

اس سے مولانا کی قوت بیان کا اندازہ ہوتا ہے۔ الفاظ کی دل کشی، واقعات
 کا مشاہدہ، ذاتی تجربہ، طبیعتوں کا جائزہ، غرضیکہ ان داستانوں میں ایک
 صاحب دل کا دل اور ایک صاحب نظر کی نظر دکھائی دیتی ہے۔ ایک فلسفی
 کس طرح قدرتی مناظر کو دیکھتا، اور ان کا تلف لیتا اور زمین کے ساتھ ان
 بیان کرتا ہے اس کا نمونہ شاید ہی اس سے بہتر نہیں مل سکے۔

چند فقرے

ان غلوں میں چند مد چند فقرے ہیں، خوف طوالت صرف دو پیر

کے جاتے ہیں۔

۱۔ جب لوگ کام ہو جوں اور خوش وقتوں کے پھول ہیں رہے
 تھے تو ہمارے حلقے میں لذتوں اور حسرتوں کے کانٹے آئے انھوں نے پھول
 چھوٹے اور کانٹے چھوڑ دیئے ہم نے کانٹے چھوٹے اور پھول چھوڑ دیئے۔

۲۔ یکسانی بجائے خود زندگی کی سب سے بڑی بے نمکی ہے۔ تبدیلی
 اگر چہ سکون سے اضطراب کی ہو مگر تبدیلی ہے اور تبدیلی بجائے خود زندگی
 کی ایک بڑی لذت ہوتی۔ عربی میں کہتے ہیں حمد خونو امیہ السکر، اپنی
 جموں کا ذائقہ بدستے رہو سر یہاں زندگی کا مزہ بھی انھیں کوس ملتا ہے یہ
 اس کی شیرینیوں کے ساتھ اس کی تنہیوں کے بھی ٹھونٹ لیتے رہتے ہیں۔

ایک سوال اور اس کا جواب

مولانا کی انفرادیت تنہائی پسندی، عذیت اور نفسیانہ رخ سے زندگی کو
 دیکھنے کی نظر کے ہوتے ہوئے قوی ہوتا ہے کہ وہ اتنے بڑے لیڈر کیسے بن گئے
 اس کا جواب ان کی مندرجہ ذیل عبادت کے آخر جملہ میں ہے۔

"نمانے کے بہت سے تجربے میرے لئے بیکار ہوئے، لوگ اگر میری طرف رخ پھیرتے
 ہیں تو بجائے اس کے کہ دل مگرمند ہو اور زیادہ منت گذار ہوئے لگتا ہے کیونکہ ان کا
 جو چرم لوگوں کو خوش حال کرتا ہے میرے لئے بسا اوقات ناقابل برداشت ہو جاتا
 ہے۔ اگر عوام کا رجوع و رجوع گمراہیوں کو میرے اختیار کی پٹن نہیں ہوتی،
 اضطراب و تکلف کی مجبوری ہوتی ہے۔ میں نے سیاسی زندگی کے ہنگاموں کو
 نہیں ٹھونڈا تھا یہی سی زندگی کے ہنگاموں نے مجھے ڈھونڈ ڈھونڈ نکالا۔"

اسی وجہ سے مولانا میں خلوت و راجن اور انجمن و خلوت کی کیفیت رہی بقول
 پیٹنٹ جو اہل حال تہذیب کے ایسا جامع کمالات شخص جس میں قدیم و جدید کی
 ادبی آمیزش ہو اور جس میں ماضی اور مستقبل کی اتنی صلاحیتیں ہوں اب پیدا
 ہونا مشکل ہے۔

محکم دلائل

محکم دلائل

تھے۔ ۲۔ پہلے کیوں مولانا کو خیال تھا کہ ڈاکٹر منٹو دار پر پلا جاسے اور جس کی سیر کی جائے۔ ایک پہلے پاگئی۔ موٹر میں پڑا اور مولانا کے ساتھ میں، قاضی نورالامام اور ڈاکٹر منٹو کی طرف سے بیٹھے۔ موٹر میں پڑی۔ ڈاکٹر منٹو دار پر کھٹکتے سے ۳۵۔ ۴۰ میل کے فاصلے پر ہے۔ موٹر ڈاکٹر منٹو کی طرف سے جاری تھی، دفعتاً ڈک ٹی، کوئی ٹراپی ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر منٹو نے پوری کوشش کی مگر سب سود۔ آخر اعلان کر دیا موٹر چل نہیں سکتی۔ ہم لوگ کھٹکتے سے بہت دور ایک آواز جگہ پر تھے۔ ۱۵۔ ۲۰ منٹ چل کر ایک ریلوے اسٹیشن پر پہنچ سکے تھے۔ آخر جانا ہی پڑا۔ مگر یہ اسٹیشن چھٹی لان کا قلابری کو فٹ ہوئی تھیں کرتے تو کیا کرتے۔ جمہوری کے ایسے موقوفوں پر مولانا اپنے آپ کو کنبھال کے بیٹھ بن جاتے تھے جیسے کوئی پریشانی نہیں ہے اور ملافت و طوائف کے زخمت ہونے والے خزانے کھل جاتے تھے

مگر ہم ایک کورہ مقام میں تھے اور چھوٹی ریلوے کے اسٹیشن سے سابقہ قلعہ طور پایا تھا کہ سندھ پر پہنچ کر کھانے پینے کی فکر کریں گے۔ مگر اب ہم سندھ سے دور یہاں تھے۔

یوں تو بھوک نہیں لگتی لیکن معلوم ہو جائے کہ کھانے کا سامان کونسی نہیں تو بھوک ٹوٹ پڑتی ہے۔ اب ہم بہت بھوکے تھے۔ ڈاکٹر منٹو انیس کی عمر ۸۹۔ ۹۰ سے کیا کم ہوگی۔ سب سے زیادہ بھوک میں مبتلا ہی تھے۔ خود مولانا بھی بھوکے تھے مگر نہ ہر کیے کرتے۔ اسٹیشن پر کسی قسم کا کوئی کھانا نہ تھا۔ اب ہم کریں تو کیا کریں۔ بڑی مارو سی سے دو چار تھے۔ ۵۰ فٹ ایک رز کا نوہا ہوا سر پر ڈھری اٹھائے۔ ہم سب اس پر ٹوٹ ہی تو پڑے۔ مرنے مولانا اپنی جگہ پر کھڑے مسکراتے رہے۔ لوگ آندوائی تو بالکل کپے آروں نکلے۔ ڈاکٹر صاحب خوشی سے چیخ اٹھے۔ پوری لوگ مسرید لگ گئی۔ میں نے عرض کی لیکن یہ بچے، مرد آپ کھائیں گے کیسے دانت کہاں ہیں و ڈاکٹر صاحب نے فرمایا۔ چبانے بیز ہی تھکتے جیسے جابٹھ گئے۔ مولانا اس منظر سے پورا لطف اٹھا رہے تھے۔ مگر آخر بھوکے تو تھے ہی، مردوں پر وہ وہ دانت مارے کہ آج تک یاد ہے۔ مرد و چٹ کرنے سے کچھ تسلی ہو گئی۔ مگر ریل آئے کا نام ہی نہیں لیتی تھی۔ مگر یہ سخت تھی اور ہم پیٹنے سے

شروع مگر مولانا پر اس آفت کا ذرا اثر نہ تھا۔ پہلوں پر پھیل کر تے چلے جاتے تھے اور جب مجید ہوتے تو مناسب موقع کوئی تاویلی دعا قوسٹانے لگتے یا پھر کلام اللہ کی کسی آیت پر موقی ٹانے لگتے۔

۳۔ واقعہ ہے کہ معصیت کے اس زمانے میں مولانا کی زندگی اور دنیا کی دیکھ کر میں عش عش کیا کرتا تھا۔ حیرت ہوتی تھی کہ اس شخص میں کیسی قوت ہشتا ہے، خدا پر کیسا بے حجاب بھروسہ ہے۔ آدمی معصیت میں ہی پہچانا جاتا ہے اور مولانا پر معصیت میں خواہ کتنی ہی بڑی رہی ہو، مرفرازی رہے۔ ایک ایسی ایک مٹھکھیز واقعہ اس وقت تک نہیں لکھ سکے ہوں کہ آفت ڈاکٹر منٹو کے لئے گھڑی آئی اور ہم سوار ہو گئے۔ چونی کی چال چل کر ریل نے ہمیں کھٹکتے کے معانات خیر پور میں اتار دیا۔ ہر چند تلاش کرتے رہے کوئی ٹیکسی نہ ملی۔ اب شام ہو رہی تھی جمہور ٹریم گاڑی میں ٹھہرنا پڑا۔ مولانا ٹریم کی بیچ کے بالکل کنارے اس طرح بیٹھے تھے کہ آج بیکارہ تھے۔ کسے بالکل تیار ہیں۔ بیٹھے نہیں میں یوں سمجھے کہ بیچ پر ٹکے ہوئے تھے اور گھبرا کر ہر طرف دیکھتے جاتے تھے کہ کسی کی نگاہیں تو نہیں پڑ رہی ہیں۔ یا اصل تم سم تھے۔ ایک اسٹینڈ آف اور ٹریم ٹھہر گئی۔ ایک دو مسافر داخل ہوئے ٹریم ابھی حرکت میں نہیں آئی تھی کہ ایک مسافر نے زور سے فریاد مارا، "اسٹیشن پر مولانا ساتھ ہی ڈاکٹر منٹو کے چوٹا شروع کر دیا۔ اب مولانا کی حالت ایسی ہو گئی جیسے تپ دق کا کوئی بیمار آخری مرتلے میں ہو۔ چہرہ بالکل سفید، ہونٹ جیسے پوسے، آنکھیں نیچی کسی تدوین تلخ ہے جس میں اس آفت ناگہانی معصیت فرمایا۔ "بیٹھ جاؤ میرے بھائی۔" پھر مجھے بڑی بے بسی کی نظروں سے دیکھا۔ میں تو مراقبہ آشنایا تھا ہی، اٹھ کھڑا ہوا اور ٹریم کی دسی زور سے کھینچ کر پوری طاقت سے گھنٹی بجاتا شروع کر دی۔ ایک آدھ منٹ کے اندر ٹریم رک گئی۔ ہم سب اتر پڑے اور مولانا نے فرمایا۔ "سخت کوفت اٹھانا پڑی، ہم ٹیکسی کا منتظر کریں گے۔" ٹیکسی جلد مل گئی اور ہم گھر پہنچ گئے۔ مگر اس داستان کا چرچا مولانا نے ہمیں نہ بتایا خاص دفع سے جاری رکھا۔ اتنا ہنسایا اتنا ہنسایا کہ اب کہہ نہ سکتا ہوں کہ



مولانا آزاد جیاستا گاندھی کی چٹاپر
- ۲۱ ستمبر ۱۹۴۱ء



مولانا ابوالکلام آزاد اور ڈاکٹر رادھا کرشنن
(اگست ۱۹۴۰ء)



صدر کانگریس مولانا آزاد شملہ کے سیشن ہول میں (۲۲ جون ۱۹۴۰ء) پانچ شب
(پشتون محمد اجمل صاحب)



مولانا آزاد جے پور کانگریس میں
(دسمبر ۱۹۴۰ء)

۱۲۱
 ۱۲۲
 ۱۲۳
 ۱۲۴
 ۱۲۵
 ۱۲۶
 ۱۲۷
 ۱۲۸
 ۱۲۹
 ۱۳۰
 ۱۳۱
 ۱۳۲
 ۱۳۳
 ۱۳۴
 ۱۳۵
 ۱۳۶
 ۱۳۷
 ۱۳۸
 ۱۳۹
 ۱۴۰
 ۱۴۱
 ۱۴۲
 ۱۴۳
 ۱۴۴
 ۱۴۵
 ۱۴۶
 ۱۴۷
 ۱۴۸
 ۱۴۹
 ۱۵۰
 ۱۵۱
 ۱۵۲
 ۱۵۳
 ۱۵۴
 ۱۵۵
 ۱۵۶
 ۱۵۷
 ۱۵۸
 ۱۵۹
 ۱۶۰
 ۱۶۱
 ۱۶۲
 ۱۶۳
 ۱۶۴
 ۱۶۵
 ۱۶۶
 ۱۶۷
 ۱۶۸
 ۱۶۹
 ۱۷۰
 ۱۷۱
 ۱۷۲
 ۱۷۳
 ۱۷۴
 ۱۷۵
 ۱۷۶
 ۱۷۷
 ۱۷۸
 ۱۷۹
 ۱۸۰
 ۱۸۱
 ۱۸۲
 ۱۸۳
 ۱۸۴
 ۱۸۵
 ۱۸۶
 ۱۸۷
 ۱۸۸
 ۱۸۹
 ۱۹۰
 ۱۹۱
 ۱۹۲
 ۱۹۳
 ۱۹۴
 ۱۹۵
 ۱۹۶
 ۱۹۷
 ۱۹۸
 ۱۹۹
 ۲۰۰
 ۲۰۱
 ۲۰۲
 ۲۰۳
 ۲۰۴
 ۲۰۵
 ۲۰۶
 ۲۰۷
 ۲۰۸
 ۲۰۹
 ۲۱۰
 ۲۱۱
 ۲۱۲
 ۲۱۳
 ۲۱۴
 ۲۱۵
 ۲۱۶
 ۲۱۷
 ۲۱۸
 ۲۱۹
 ۲۲۰
 ۲۲۱
 ۲۲۲
 ۲۲۳
 ۲۲۴
 ۲۲۵
 ۲۲۶
 ۲۲۷
 ۲۲۸
 ۲۲۹
 ۲۳۰
 ۲۳۱
 ۲۳۲
 ۲۳۳
 ۲۳۴
 ۲۳۵
 ۲۳۶
 ۲۳۷
 ۲۳۸
 ۲۳۹
 ۲۴۰
 ۲۴۱
 ۲۴۲
 ۲۴۳
 ۲۴۴
 ۲۴۵
 ۲۴۶
 ۲۴۷
 ۲۴۸
 ۲۴۹
 ۲۵۰
 ۲۵۱
 ۲۵۲
 ۲۵۳
 ۲۵۴
 ۲۵۵
 ۲۵۶
 ۲۵۷
 ۲۵۸
 ۲۵۹
 ۲۶۰
 ۲۶۱
 ۲۶۲
 ۲۶۳
 ۲۶۴
 ۲۶۵
 ۲۶۶
 ۲۶۷
 ۲۶۸
 ۲۶۹
 ۲۷۰
 ۲۷۱
 ۲۷۲
 ۲۷۳
 ۲۷۴
 ۲۷۵
 ۲۷۶
 ۲۷۷
 ۲۷۸
 ۲۷۹
 ۲۸۰
 ۲۸۱
 ۲۸۲
 ۲۸۳
 ۲۸۴
 ۲۸۵
 ۲۸۶
 ۲۸۷
 ۲۸۸
 ۲۸۹
 ۲۹۰
 ۲۹۱
 ۲۹۲
 ۲۹۳
 ۲۹۴
 ۲۹۵
 ۲۹۶
 ۲۹۷
 ۲۹۸
 ۲۹۹
 ۳۰۰
 ۳۰۱
 ۳۰۲
 ۳۰۳
 ۳۰۴
 ۳۰۵
 ۳۰۶
 ۳۰۷
 ۳۰۸
 ۳۰۹
 ۳۱۰
 ۳۱۱
 ۳۱۲
 ۳۱۳
 ۳۱۴
 ۳۱۵
 ۳۱۶
 ۳۱۷
 ۳۱۸
 ۳۱۹
 ۳۲۰
 ۳۲۱
 ۳۲۲
 ۳۲۳
 ۳۲۴
 ۳۲۵
 ۳۲۶
 ۳۲۷
 ۳۲۸
 ۳۲۹
 ۳۳۰
 ۳۳۱
 ۳۳۲
 ۳۳۳
 ۳۳۴
 ۳۳۵
 ۳۳۶
 ۳۳۷
 ۳۳۸
 ۳۳۹
 ۳۴۰
 ۳۴۱
 ۳۴۲
 ۳۴۳
 ۳۴۴
 ۳۴۵
 ۳۴۶
 ۳۴۷
 ۳۴۸
 ۳۴۹
 ۳۵۰
 ۳۵۱
 ۳۵۲
 ۳۵۳
 ۳۵۴
 ۳۵۵
 ۳۵۶
 ۳۵۷
 ۳۵۸
 ۳۵۹
 ۳۶۰
 ۳۶۱
 ۳۶۲
 ۳۶۳
 ۳۶۴
 ۳۶۵
 ۳۶۶
 ۳۶۷
 ۳۶۸
 ۳۶۹
 ۳۷۰
 ۳۷۱
 ۳۷۲
 ۳۷۳
 ۳۷۴
 ۳۷۵
 ۳۷۶
 ۳۷۷
 ۳۷۸
 ۳۷۹
 ۳۸۰
 ۳۸۱
 ۳۸۲
 ۳۸۳
 ۳۸۴
 ۳۸۵
 ۳۸۶
 ۳۸۷
 ۳۸۸
 ۳۸۹
 ۳۹۰
 ۳۹۱
 ۳۹۲
 ۳۹۳
 ۳۹۴
 ۳۹۵
 ۳۹۶
 ۳۹۷
 ۳۹۸
 ۳۹۹
 ۴۰۰
 ۴۰۱
 ۴۰۲
 ۴۰۳
 ۴۰۴
 ۴۰۵
 ۴۰۶
 ۴۰۷
 ۴۰۸
 ۴۰۹
 ۴۱۰
 ۴۱۱
 ۴۱۲
 ۴۱۳
 ۴۱۴
 ۴۱۵
 ۴۱۶
 ۴۱۷
 ۴۱۸
 ۴۱۹
 ۴۲۰
 ۴۲۱
 ۴۲۲
 ۴۲۳
 ۴۲۴
 ۴۲۵
 ۴۲۶
 ۴۲۷
 ۴۲۸
 ۴۲۹
 ۴۳۰
 ۴۳۱
 ۴۳۲
 ۴۳۳
 ۴۳۴
 ۴۳۵
 ۴۳۶
 ۴۳۷
 ۴۳۸
 ۴۳۹
 ۴۴۰
 ۴۴۱
 ۴۴۲
 ۴۴۳
 ۴۴۴
 ۴۴۵
 ۴۴۶
 ۴۴۷
 ۴۴۸
 ۴۴۹
 ۴۵۰
 ۴۵۱
 ۴۵۲
 ۴۵۳
 ۴۵۴
 ۴۵۵
 ۴۵۶
 ۴۵۷
 ۴۵۸
 ۴۵۹
 ۴۶۰
 ۴۶۱
 ۴۶۲
 ۴۶۳
 ۴۶۴
 ۴۶۵
 ۴۶۶
 ۴۶۷
 ۴۶۸
 ۴۶۹
 ۴۷۰
 ۴۷۱
 ۴۷۲
 ۴۷۳
 ۴۷۴
 ۴۷۵
 ۴۷۶
 ۴۷۷
 ۴۷۸
 ۴۷۹
 ۴۸۰
 ۴۸۱
 ۴۸۲
 ۴۸۳
 ۴۸۴
 ۴۸۵
 ۴۸۶
 ۴۸۷
 ۴۸۸
 ۴۸۹
 ۴۹۰
 ۴۹۱
 ۴۹۲

71

جہان شاہ
 خیرا خیر دے . دعا کرتا ہوں . اور شکر گزار ہوں .
 کہ پیشینہ پر چند ملک کا جو شہر میں رہتا تھا اسے اب بھی ہند
 پر چھوڑ گئے اور انہیں بھجھ گئے . اسکا نام دارن خود ان پر
 لپیٹ ہے . ان کا دارن پر ہے . حوران ہے خیروں کو اپنا
 آرم کا رہتا ہے . - دوسرے ملک میں رہتا تھا
 مولانا یہ ملایا اور دیکھا جا ب ہوں . اس کا نام
 نو ہوا سلام توں . چاروں طرف سے لڑائیں بہت ہوئی تھیں
 اور دشمن سے ملاقات ہوئی تھیں . حوران کے شہر اسکی !

①
 (۱) "موتوں کے حجب کا اظہار ہے۔ اور
 موت کے بعد، دیکھ تو آئیں غفلت اور غفلت۔ موت
 کے بعد جس غفلت نامہ میں شریعت دیکھ۔ موت کے بعد کی غفلت
 اس کی جگہ نکال دیتے۔
 موت ۱۰۱۔ موت نامہ۔ "چند ہندو بہت سے آئے ہیں
 "موت کے جگہ" چند ہندو بہت سے آئے ہیں شریعت نکال دیتے۔
 ابو الکلام

[illegible]



مولانا آزاد ۱۹۳۴ء میں

- ۱۔ غلام رسول ہستہ کے نام
- ۲۔ ایم اے ذکریا نیجا گپوری کے نام (پیشکریہ محمود واجد)
- ۳۔ ۵۰۴۔ ۶ بی بی اعلیٰ کے نام



اور اس آیت اپنی نظروں سے گزرنا
 دیکھ کر اس کے نام سے بھی اسے
 بیت فروش کر دیا کچھ میں نہیں
 اور اس کا دھڑا کہ ایک ہی وقت
 زمین میں اور اس کی دھڑا کہ ایک ہی
 دھڑا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس کا کلمہ

اور اس کا کلمہ

دیکھ کر اس کے

OFFICE-SECRETARY FOR 1941

President

ASHA KARAN AZAD

Treasurer

VALLABHJI PATEL

General Secretary

J. B. KARNATAK

भारतीय कांग्रेस समिति

सचिव महा, १९४१

की अध्यक्षता कर रहे हैं

श्री वल्लभजी पटेल

ALL INDIA CONGRESS COMMITTEE

SHARAD BHAWAN, १९४१

میں نے اس آیت کو دیکھا ہے
 اور اس کے نام سے بھی اسے
 بیت فروش کر دیا کچھ میں نہیں
 اور اس کا دھڑا کہ ایک ہی وقت
 زمین میں اور اس کی دھڑا کہ ایک ہی
 دھڑا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس کا کلمہ



اوپر دائیں: مولانا آزاد ہاتھ کا ندھی سے کسی نئے پرچہ
فرما رہے ہیں

اوپر بائیں: مولانا ابوالکلام آزاد بہشتیت مسجد،
آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے تاجپتی اجلاس میں
مشرکین ہیں ہاتھ کا ندھی کے ساتھ
ہندوستان چھوڑ دو کی قاری داد منظور ہوا
دائیں: مولانا آزاد: چندت جواہر لال نہرو
وزارت تعلیم کے انٹرن کے ساتھ
نیچے: مولانا آزاد پارلیمنٹ ہاؤس کے سٹرل ہال
انٹرنیشنل کونسل برائے یونیسکو کے افتتاح
جلسے میں صدارتی تقریر فرما رہے ہیں۔



سردار ایم۔ این۔ مسعود

نرپالہ سنگھ، چندت جواہر لال نہرو، ڈاکٹر کرپا، مرزا آزاد



مولانا آزاد پارلیمنٹ ہاؤس کے سٹرل ہال میں انٹرنیشنل کونسل برائے یونیسکو کے افتتاح جلسے میں صدارتی تقریر فرما رہے ہیں۔

مولانا آزاد کا ایک خط

قلما جگر

۱۱- اپریل ۴۳ء

آنچہ دل از شکراں می سوخت بیم مجبور

آفرانے ہری گردوں بہ آں ہم سفت

صیتی کرم

اس وقت صبح کے چار نہیں بچے ہیں بلکہ رات کا پچھلا صفحہ شروع ہو چکا ہے۔ دس بجے حسب معمول لیٹر پریٹ گیا تھا لیکن آنکھیں نیند سے کھلتی نہیں ہوئیں۔ ناچار آٹھ بیٹھا، گھر سے میں آیا، مدھنی کی اور اپنے اشنا میں روپ گیا۔ پھر خیال ہوا قلم اٹھاؤں اور کچھ دیر آپ سے باتیں کر کے جی کا رعبہ ہکا کر دوں۔ ان آٹھ بیٹوں میں جو یہاں گزر چکے ہیں۔ یہ چھٹی رات ہے جو اس طرح گزر رہی ہے اور نہیں معلوم ابھی اور کتنی راتیں اس طرح گزر رہی گی۔

دماغ پر تلک و دل پر پائے ہسرتیں

چگونہ حرفت زلم دل کجا دماغ کجا

جیسی بڑی کی طبیعت کئی سال سے طویل تھی۔ ام عریں حبیب ہیں مٹی میں متید تھا تو اس خیال سے کہ میرے لئے تشویش خاطر کا موجب ہو گا۔ مجھے اطلاع نہیں دی گئی۔ لیکن دماغ کے بعد معلوم ہوا کہ یہ تمام

دماغ کم و بیش حالات کی حالت میں گزرا تھا۔ مجھے قید خانہ میں اس کے خطوط ملتے۔ ہے۔ ان میں ساری باتیں ہوتی تھیں لیکن اپنی بیماری کا کوئی ذکر نہیں ہوتا تھا۔ دماغ کے بعد خاکروں سے مشورہ کیا گیا تو ان سب کی رائے تبدیل اب دہوا کی ہوئی اور وہ راپنچی چلی گئی۔ راپنچی کے قیام سے بظاہر فائدہ ہوا تھا۔ جولائی میں واپس آئی تو صحت کی مددنی چہرہ پر واپس آ رہی تھی۔ اس تمام زمانے میں میں زیادہ تر سفر میں رہا۔ وقت کے حالات اس تیزی سے بدل رہے تھے کہ کسی ایک منزل میں دم لینے کی مہلت ہی نہیں ملتی تھی۔ ایک منزل میں ابھی قدم پہنچا نہیں کہ دوسری منزل سامنے نمودار ہو گئی۔

صد بیا باں بجز شنت و دگرست و پیش ست

جولائی کی آخری تاریخ تھی کہ میں تین ہفتہ کے بعد کلکتہ واپس ہوا اور پھر چار دن بعد آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس میں بیٹھنے کے لئے روانہ ہو گیا۔ یہ وہ وقت تھا کہ ابھی طوفان آیا نہیں تھا مگر طوفانی آثار ہر طرف اٹھنے لگے تھے۔ حکومت کے ارادوں کے بارے میں طرح طرح کی افواہیں مشہور ہو رہی تھیں۔ ایک افواہ جو خصوصیت کے ساتھ مشہور ہوئی یہ تھی کہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس کے بعد درکنگ کمیٹی کے تمام ممبروں کو گرفتار کر لیا جائے گا اور ہندوستان سے باہر کسی غیر معلوم مقام میں بھیج دیا جائے گا۔

اگست ۱۹۴۷ء

جائے گا۔ یہ بات بھی جانی جاتی تھی کہ ریٹائی کی غیر معمولی حالت نے حکومت کو غیر معمولی اختیار دے دئے ہیں اور وہ ان سے ہر طرح کا کام لے سکتی ہے۔ اس طرح کے حالات پر مجھ سے زیادہ ذہینا کی نظر ڈال کر تھی اور اس نے وقت کی صورت حال کا پوری طرح اندازہ کر لیا تھا۔ ان چار دفوں کے اندر جو میں نے دو سفر ہوں کے درمیان بسر کئے ہیں اس قدر کاموں میں مشغول رہا کہ کہیں آپس میں بات چیت کرنے کا موقع بہت کم ملا۔ وہ میری طبیعت کی افتاد سے واقف تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس طرح کے حالات میں ہمیشہ میری خاموشی بڑھ جاتی ہے اور میں اپنے نہیں کرتا کہ اس خاموشی میں غلط پڑے۔ اس لئے وہ بھی خاموش تھی لیکن ہم دونوں کی یہ خاموشی بھی گویائی سے خالی نہ تھی۔ ہم دونوں خاموشی وہ کر بھی ایک دوسرے کی باتیں سن رہے تھے اور ان کا مطلب اچھی طرح سمجھ رہے تھے۔ ۳۰ اگست کو جب میں ہسپتال کے لئے روانہ ہونے لگا تو وہ صاحب معمول دروازہ تک خدا حافظ کہنے کے لئے آئی۔ میں نے کہا اگر کوئی نیا واقعہ پیش نہیں آگیا تو ۳۱ اگست تک واپسی کا قصد ہے۔ اس نے خدا حافظ کے سوا اور کچھ نہیں کہا۔ لیکن اگر وہ کہنا بھی چاہتی تو اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتی تھی جو اس کے چہرہ کا خاموشی اضطراب کہہ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں خشک تھیں مگر چہرہ اٹکھا رہا تھا۔

خود را بمیل پیش تو خاموش کردہ ایم

گزشتہ پچیس برس کے اندر کتنے ہی سفر پیش آئے اور کتنی ہی مرتبہ گرفتاریاں ہوئیں لیکن میں نے اس درجہ اندر وہ خاطر اٹھے کسی نہیں دیکھا تھا۔ کیا یہ جذبات کی قوت کمزوری تھی جو اس کی طبیعت پر غالب آگئی تھی؟ میں نے اس وقت ایسا ہی خیال کیا تھا لیکن اب سوچتا ہوں تو خیال ہوتا ہے کہ شاید اسے صورت حال کا ایک جھول احساس ہونے لگا تھا۔ شاید وہ محسوس کر رہی تھی کہ اس زندگی میں یہ ہماری آخری ملاقات ہے۔ وہ خدا حافظ اس لئے نہیں کہہ رہی تھی کہ میں سفر کر رہا تھا۔ وہ اس لئے کہہ رہی تھی کہ خود سفر کرنے والی تھی۔

لے گرفتاری کے بعد جو بیانات اخباروں میں آئے ان سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ افراد ہیں پہلے اصل ذہین، سیکرٹری، آف سیٹ، دہشت گردانے کی ہی رائے تھی کہ ہمیں گرفتار کیے مشرقی افریقہ بھیج دیا جائے، اس فرض سے بعض اختلافات کر بھی لئے گئے تھے لیکن پھر رائے بدل گئی اور بالآخر یہ پایا کہ قلمدانہ ان کے ذہنی توانائی کے ماتحت رکھا جائے اور ایسی سختیاں عمل میں لائی جائیں کہ ہندوستان سے باہر بھیجے کا جو مقصد تھا وہ یہیں حاصل ہو جائے۔

آج کل دہلی (ابوالکلام)

وہ میری طبیعت کی افتاد سے بھی طرح واقف تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس طرح کے موقعوں پر اگر اس کی طرف سے ذرا بھی اضطراب طبع کا اظہار ہو گا تو مجھے سخت ناگوار گزرے گا اور عرصہ تک اس کی طبیعت ہمارے تعلقات میں باقی رہے گی۔ ۱۴ دسمبر میں جب پہلی مرتبہ گرفتاری پیش آئی تھی تو وہ اضطراب خاطر نہیں رکھ سکی تھی اس میں عرصہ تک اس سے ناخوش رہا تھا۔ اس واقعہ نے ہمیشہ کے لئے اس کی زندگی کا ڈھنگ بدلا دیا اور اس نے پوری کوشش کی کہ میری زندگی کے حالات کا ساتھ دے۔ اس نے صرف ساتھ ہی نہیں دیا بلکہ پوری ہمت اور استقامت کے ساتھ ہر طرح کے ناخوش گوار حالات برداشت کئے۔ وہ دائمی حیثیت سے میرے اندر وقفا میں شریک تھی اور عملی زندگی میں رفیق و مددگار۔ پھر کیا بات تھی کہ اس موقع پر وہ اپنی طبیعت کے اضطراب پر غالب نہ آسکی؟ غالباً یہی بات تھی کہ اس کے اندر ذہنی احساسات پر مستقبل کی پرچائیں پڑنا شروع ہو گئی تھی۔

گرفتاری کے بعد کچھ عرصہ تک ہمیں عزیزوں سے خط و کتابت کا موقع نہیں دیا گیا تھا۔ پھر جب یہ روک ہٹائی گئی تو، استمبر کے مجھے اس کا پہلا خط ملا اس کے بعد برابر خطوط ملنے لگے۔ چونکہ مجھے معلوم تھا کہ وہ اپنی بیماری کا حال لکھ کر مجھے پریشانی خاطر کرنا پسند نہیں کرتے گی۔ اس لئے گھر کے بعض دوسرے عزیزوں سے حالت دریافت کرتا رہتا تھا۔ خطوط یہاں عموماً تاہم تاریخ کتابت سے دس بارہ دن بعد ملتے ہیں۔ اس لئے کوئی بات جلد معلوم نہیں ہو سکتی۔ ۱۵ فروری کو مجھے ایک خط ۲ فروری کا میجا ہوا ملا جس میں لکھا تھا کہ اس کی طبیعت ابھی بہتر ہے۔ میں نے تار کے ذریعہ مزید صورت حال دریافت کی تو ایک ہفتہ کے بعد جواب ملا کہ کوئی تشویش کی بات نہیں۔

۲۳ مارچ کو مجھے پہلی اطلاع اس کی خطرناک حالات کی ملی۔ گورنمنٹ ہسپتال نے ایک ٹیلی گرام کے ذریعہ سپرنٹنڈنٹ کو اطلاع دی کہ اس مضمون کا ایک ٹیلی گرام اسے کلکتہ سے ملا ہے۔ ہمیں معلوم ہو ٹیلی گرام گورنمنٹ ہسپتال کو ملا وہ کس تائید کا تھا اور کتنے دنوں کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا کہ مجھے یہ خبر پہنچا دینی چاہیئے۔

چونکہ حکومت نے ہماری قید کا عمل اپنی دانست میں پوشیدہ رکھا ہے اس لئے ابتدا سے یہ طریقہ عمل اختیار کیا گیا ہے کہ نہ تو یہاں سے کوئی ٹیلی گرام باہر بھیجا جائے نہ باہر سے کوئی آسکتا ہے کیونکہ اگر آئے گا تو ٹیلی گراف آفس ہی کے ذریعہ آئے گا اور اس صورت میں آفس کے لوگوں پر راز کھل جائے گا۔ اس پابندی کا نتیجہ ہے کہ کوئی بات کتنی ہی جلدی کی ہو لیکن تار کے ذریعہ نہیں بھیجی جاسکتی۔ اگر

یہی ہیں جو تو اسے لکھ کر پرنٹنگ مل کو دے دینا چاہتے۔ وہ اسے خط کے ذریعہ بھی بھیجے گا وہ اسے احتساب کے بعد اسے آگے روانہ کیا جاسکتا ہے۔ خط و کتابت کی نگرانی کے لحاظ سے یہاں قیدیوں کی دو قسمیں کردی گئی ہیں۔ بعض کے لئے صرف بیسی کی نگرانی کافی سمجھی گئی ہے۔ بعض کے لئے ضروری ہے کہ ان کی تمام ڈاک وہی جائے اور جب تک وہاں سے منظور دی نہ مل جائے آگے نہ بڑھائی جائے۔ چونکہ یہی ڈاک دوسری قسم میں داخل ہے اس لئے مجھے کوئی ٹیڈ ایک ہفتہ سے پہلے نہیں مل سکتا۔ اور نہ میرا کوئی ٹیڈ ایک ہفتہ سے پہلے کلکتہ پہنچ سکتا ہے۔

یہ کار جو ۲۳۰ پیج کو یہاں پہنچا تو جی خط دمزد (COD) میں لکھا گیا تھا۔ سپرنٹنڈنٹ اسے حل نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اسے فوجی ہیڈ کوارٹر میں سے لیا گیا۔ وہاں اتفاقاً کوئی آدمی موجود تھا اس لئے پورا دن اس کے حل کرنے کی کوشش میں نکل گیا۔ رات کو اس کی حل شدہ کاپی مجھے مل سکی۔

دوسرے دن اخبارات آئے تو ان میں بھی یہ معاملہ آچکا تھا۔ معلوم ہوا ڈاکٹروں نے صورت حال کی حکومت کو اطلاع دے دی ہے اور جواب کے منتظر ہیں۔ پھر بیماری کے مستحق مبالغوں کی روزانہ اٹلاعات نکلنے لگیں۔ سپرنٹنڈنٹ روز ریڈیو میں سننا تھا اور یہاں بعض رفقاء سے اس کا ذکر کر دیتا تھا۔

جس دن کار ملا اس کے دوسرے دن سپرنٹنڈنٹ میرے پاس آیا اور یہ کہا کہ اگر میں اس بارے میں حکومت سے کچھ کہنا چاہتا ہوں تو وہ اسے فوراً بیٹھی بھیج دے گا اور یہاں کی پابندیوں اور مقررہ قاعدوں سے اس میں کوئی رکاوٹ نہیں پڑے گی۔ وہ صورت حال سے بہت متاثر تھا اور اپنی ہمدردی کا اظہار دلاتا چاہتا تھا لیکن میں نے اس سے صاف صاف کہہ دیا کہ میں حکومت سے کوئی درخواست کرنی نہیں چاہتا۔ پھر وہ جواہر لال کے پاس گیا اور ان سے اس بارے میں گفتگو کی۔ وہ سرپر کو میرے پاس آئے اور بہت دیر تک اس بارے میں گفتگو کرتے رہے۔ میں نے ان سے بھی وہی بات کہہ دی جو سپرنٹنڈنٹ سے کہہ چکا تھا۔ بعد کو معلوم ہوا کہ سپرنٹنڈنٹ نے یہ بات حکومت میں ہی کے ایسے ہی کہی تھی۔

جو بھی خطرناک صورت حال کی پہلی خبر ملی میں نے اپنے دل کو ٹوٹنا شروع کر دیا۔ ان کے نفس کا بھی کچھ عجیب حال ہے۔ ساری عمر اس کی دیکھ بھال میں بسر کر دیتے ہیں۔ پھر یہ عمر حل نہیں ہوتا۔ میری زندگی ابتداء سے ایسے حالات میں گزری کہ طبیعت کو ضبط و انقیاد میں لانے کے متواتر موقعے پیش آتے رہے اور جہاں تک ممکن تھا ان

سے کام لینے میں کوتاہی نہیں کی۔

تاہم مترسم بود ز دم چاک گرمیاب
شرمنگی از حسرتہ پیشینہ خادم

تاہم میں نے محسوس کیا کہ طبیعت کا سکون مل گیا ہے اور اسے قابو میں رکھنے کے لئے جلد جہد کرنی پڑے گی۔ یہ جلد جہد دماغ کو نہیں مگر جسم کو تھکا دیتی ہے۔ وہ اندر ہی اندر گلے لگاتا ہے۔

اس زمانے میں میرے دل و دماغ کا جو حال رہا میں اسے چھپانا نہیں چاہتا۔ میری کوشش تھی کہ اس صورت حال کو پورے مبرہ سکون کے ساتھ برداشت کروں۔ اس میں میرا ظاہر کامیاب ہوا لیکن شاید بالخصوص ہو سکا۔ میں نے محسوس کیا کہ اب دماغ بناوٹ اور نمائش کا وہی پارٹ کھیلنے لگا ہے جو احساسات اور انفعالات کے ہر گوشہ میں ہم ہمیشہ کھیلا کرتے ہیں اور اپنے ظاہر کی طرح نہیں بننے دیتے۔ سب سے پہلی کوشش یہ کرنی پڑی کہ یہاں زندگی کی جو روزانہ معمولات طہرائی جا چکی ہیں ان میں فرق آسنے نہ پائے۔ چائے اور کھانے کے چار وقت ہیں جن میں مجھے اپنے کمرے سے نکلنا اور کمروں کی قطار کے آخری کمرہ میں جانا پڑتا ہے۔ چونکہ زندگی کی معمولات میں وقت کی پابندی کا منٹوں کے حساب سے عادی ہو گیا ہوں اس لئے یہاں بھی اوقات کی پابندی کی رسم قائم ہو گئی اور تمام ساقیوں کو بھی اس کا ساتھ دینا پڑا۔ میں نے ان دنوں میں بھی اپنا معمول بدستور رکھا۔ ٹھیک وقت پر کمرہ سے نکلنا رہا اور کھانے کی میز پر بیٹھنا رہا۔ جو کہ ایک قلم بند ہو چکی ہے لیکن میں چند لمحے حلق سے آتا رہا۔ رات کو کھانے کے بعد کچھ دیر تک صحن میں چند ساقیوں کے ساتھ نشست رہا مگر قیامی اس میں بھی کوئی فرق نہیں آیا۔ جتنی دیر تک وہاں بیٹھتا تھا جس طرح باتیں کرتا تھا اور جس قسم کی باتیں کرتا تھا وہ سب کچھ بدستور ہوتا رہا۔

اخبارات یہاں بارہ سے ایک بجے کے اندر آیا کرتے ہیں۔ میرے کمرے کے سامنے دوسری طرف سپرنٹنڈنٹ کا دفتر ہے۔ سیلرواں سے اخبار لے کر سیدھا میرے کمرہ میں آتا ہے۔ جو بھی اس کے دفتر سے نکلے اور چلنے کی آہٹ آتا شروع ہوتی ہی دل و دماغ لگتا تھا کہ نہیں معلوم آج کیسی خبر اخبار میں لے گی لیکن میں فوراً چونک اٹھتا۔ میرے صوفے کی پیٹھ دوواڑہ کی طرف ہے۔ اس لئے جب تک ایک آدمی اندر آ کے سامنے کھڑا ہو جائے میرا ہمسروہ دیکھ نہیں سکتا۔ جب جیلر آتا تھا تو میں حسب معمول سرکراتے ہوئے اشارہ کرتا کہ اخبار لیٹل پر رکھ دے۔

اور پھر کہنے میں مشغول ہو جاتا گویا اخبار دیکھنے کی کوئی جلدی نہیں۔ میں اعتراض کرتا ہوں کہ یہ تمام ظاہریاں دکھاوے کا ایک پارٹ تھیں جسو مانعہ مخروہ زاد احساس کیسٹا رہتا تھا اور اس نے کیسٹا تھا کہ کہیں اس کے ماضی صبر و وقار پر پہلے حالی اور پریشانی غامری کا کوئی رجحان نہ لگ جائے۔

بدیہ یارب دے کیس صورت ہے جان تمی خواہم
اکلاخرہ ۹۔ اپریل کو زہر غم کا یہ پالہ بریز ہو گیا۔

فاقت خاتون درین قنداق!

۲۰ بے سیرٹنٹ نے گورنمنٹ میں ایک تاجر اور کیا جس میں حادثہ کی خبر دی گئی تھی۔ بعد کو معلوم ہوا کہ سیرٹنٹ کو خبر ریڈر کے ذریعہ صبح ہی معلوم ہو گئی تھی۔ اور اس نے یہاں بعض دفعہ اس کا ذکر بھی کر دیا تھا۔ لیکن مجھے اطلاع نہیں دی گئی۔

اس تمام عرصہ میں یہاں کے رفقاء کا جو طریقہ عمل رہا اس کے لئے میں ان کا شکر گزار ہوں۔ ابتدا میں جب حالات کی خبریں آنا شروع ہوئیں تو قدرتی طور پر نہیں پریشانی ہوئی۔ وہ جانتے تھے کہ اس بارے میں جو کچھ کر سکے ہیں کریں۔ لیکن جو ہنسی انہیں معلوم ہو گیا کہ میں نے اپنے طریقہ عمل کا ایک فیصلہ کر لیا ہے اور میں حکومت سے کوئی درخواست کرنا پسند نہیں کرتا تو پھر سچے غامری نے اختیار کر لی اور اس طرح میرے طریقہ کار میں کسی طرح کی مداخلت نہیں ہوئی۔

اس طرح ہماری پچیس برس کی ادا دہائی زندگی ختم ہو گئی اور موت کی

دیوار ہم دونوں میں حائل ہو گئی۔ ہم اب بھی ایک دوسرے کو دیکھ سکتے ہیں مگر اسی دیوار کی اوٹ سے۔

مجھے اب چند دنوں کے اندر برسوں کی راہ چلنی پڑی ہے۔ میرے عزم نے میرا ساتھ نہیں چھوڑا۔ مگر میں محسوس کرتا ہوں کہ میرے پاؤں شل ہو گئے ہیں۔

خافل خم ذرا دے آہ چارہ نیست

زیر دہزناں کو بردل آگاہی زند

یہاں احاطہ کے اندر ایک پورانی قبر ہے۔ نہیں معلوم کس کی ہے؟ جب سے لایا ہوں سیکڑوں مرتبہ اس پر نظر پڑ چکا ہے۔ لیکن اب اسے دیکھتا ہوں تو ایسا محسوس ہونے لگتا ہے جیسے ایک نئے طرح کا انس اس سے طبیعت کو پیدا ہو گیا ہو۔ کل شام کو دیر تک اسے دیکھتا رہا اور متمم بن نوریہ کا مرثیہ جو اس نے اپنے بھائی مالک کی موت پر لکھا تھا بے اختیار یاد آ گیا۔

لقد لاهمی هذا ليقول عیسیٰ الہکا
فقال ابکی مکی قبر دایمہ
فقلت لہ ان الشجایعیت الشجایا
فدفع فخذنا کلہ فقبولہ

اب تلم دکتا ہوں۔ اگر آپ سنتے ہوئے تو بول اٹھتے

سودا خد کے واسطے کر قلمہ محترم

اپنی توفیقاً لکھی میرے شانہ میں

دُعا (مطرح)

فاقتہ السنۃ الثالثہ

جو ربط باب انسان کی غذا جسمانی کا یہ سبب کچھ سامان رکھتا ہے کیونکہ ممکن ہے کہ اس کی روحانی غذا کا انتظام نہ کرے۔

یہ روحانی غذا کیا ہے۔ یہ ہدایت و سعادت انسانی کی دعوت الہیہ ہے جس کے لئے فی الحقیقت روح انسانی جھوکی پیاسی ہوتی ہے۔ اور جس طرح جسم حیوانی قوتوں کی جھوک اور پیاس کے بعد بے کراہد مغطرب ہو کر غذا کو پکا کرتا ہے اسی طرح ضلالت کی شدت اور ہدایت کا فقدان بھی روح انسانی کو ایک معنوی جوع و عطش میں مبتلا کر دیتا ہے اور وہ اپنی زندگی کے لئے اپنی غذا کو دیکھنے اور پکارتے لگتی ہے۔ پس وقت آتا ہے کہ اس حکیم علی الاطلاق اس فاطر الارض و السموات اس مدبر الامر و الاشیاء اور اس مسبب الاسباب حقیقی کی دیوبست ظاہر ہوتی ہے جس نے انسان کی حیات جسمانی کے لئے تمام دنیا کو طرح طرح کے اغذیہ و ثمرات کی بخشش سے ایک خواہجہ کرم بنا دیا ہے۔ اس کا دستِ مخفی غذائے روحانی کا بیج پوتا ہے اور اپنی نشو و نما سے اسے یکایک سرطنت و بالاقامت بنا دیتا ہے۔ پھر اس کی سعادت و ہدایت کی نعمتوں سے زمین کے بڑے بڑے ٹکڑے بھر جاتے ہیں اور اس بخشش کی دعوت سے ارض الہی گونج اٹھتی ہے۔

(اسپائل ۱۳ جولائی ۱۹۱۳ء)

آہ مولانا ابوالکلام آزادؒ

جس کی زبان کا حرفِ معرفت، لہزہ جاس نوٹے راز دفترِ علم و رہنمائی، لُک ب لُک قلم سے جس کے باز
 شانِ حیات جس کی حق اوجِ شرف سے سرفراز عرشِ کمال و فضل تھا جس کا مقام، امتیاز
 نشاۃِ تازہ جس نے دی قوم کو وہ ابوالکلام

یامِ حسینِ قدس تھا جس کی حیات کا مقصد
 پیکرِ عزت و شرف، منہ پر غلٹ و جلال پیشِ نظرِ منظرِ فردِ ایک مرتبِ جمال
 خازنِ فضل و علم و فن، خاتمِ دانش و کمال قاسمِ بادۂ کھن، ساقیِ دورِ اہلال
 اُمّ الخلیفہ وہ تو بے فروغ مصلحتیں ہے آج
 پیرِ مٹاؤں کے بحر میں یزیدِ مٹاؤں حزیں ہے آج

حیفِ خموش ہو گیا بارغِ ادب کا عندلیب اٹھ گیا ہند کا امام سو گیا قوم کا خطیب
 اب نہ اٹھے گا مشترک ایسا مفکر و لویب حق کا مہاجرِ جلیل، دین کا منادی و نقیب
 فکرِ جدید و طرزِ فکر کا وہ محقق کتاب
 جس کے صحیفہٴ کلام کا نہیں دہر میں جواب

ایک حرمِ رازِ حق اس کی کتابِ زندگی فکر و نظر سے محقق بلندا اس کی جنابِ زندگی
آج کہاں ہے وہ بریں اس کا جوابِ زندگی آہ بریں کے قلم گسیا اب وہ صاحبِ زندگی
بکھرے ہوئے ہیں چار سو لعل و جواہرِ گمال

اس کے ماثرِ نہنہ ، اس کے مظاہرِ گمال

اس کا قلم جب اُٹھ گیا لالہ و گل کھلا دیا شعروادب کے پھول سے صحنِ درق سجا دیا
شاہدِ فکر و راز کے رخ سے حجاب اُٹھا دیا جلوہ رنگ رنگ سے گل کردہ جگمگا دیا
عقدہ کشائے فکر و راز چہرہ طرازِ علم و فن

فیض سے جس کے تازہ نقادانش و فکر کا چین

آہ وہ ملکِ خوش نگاہ لالہ طبراز و لالہ کار جس کا نوشتہء حسیں ایک میحفہ بہار
جس کی نگارِ شبِ جمیل شعروادب کا شاہ کار ایک حدیقہء کمال جس کا ہر اک خطِ خبار
اس کا "حبیب" سے کلام اس کا "صدیق" خطاب

نامہ شوق کی زبور، النہد و شعری کی کتاب

علم و ہنر کا آجدار، خسر و کشورِ قلم بدیرِ معانی و علوم، صدیرِ معارف و حکم
لوگِ قلم سے گل طراز، نغز نگار و خوش رقم جس کا کمالِ مقبرِ حبس کا کلام محترم

قوم کو جس پر ناز تھا ہاں وہ زحیم محترم

ایک حکیم ویدہ و در ایک حکیم طویرِ فن

سبحی فرنگ کا اسیر، قائدِ صاحبِ منیر جس کے ثباتِ عزم کی طق نہیں کوئی نظیر
لہجہ بلند کا فیض، فکر و دماغ کا امیر تھا جو وطن میں کل تلک ننیم امور کا امیر

کچھ حد میں گوشہ گیر ہو گیا آہ اب وہی

اس کے الم میں سرنگوں کیوں ہو پر جم شہی

اسوہ یوسفی کی نذر جس کی حیات حق تمام حق کے لئے علم و محن جس کا تھا منصب مقام

شکر و رضا کی سرخوشی جس کا شمار تھا دمام ماروس سے سرفراز، قید محن سے شاد کام

میر جمیل کی ادا جس کی حق شان امتسیان

عفو و کرم سے دل نواز، جو دوستم سے بے نیاز

اُہ کہاں ہے آج اس شانِ فہیم کی مثال طبعِ کریم کی مثال خلقِ عظیم کی مثال

اب دُٹھے گی ہند میں ایسے زحیم کی مثال ایسے فریس دیدہ و دایسے حکیم کی مثال

آج ہے بے فروغ فیضِ بزمِ وطن ترے بنیر

بزمِ وطن ہے مغلِ حرمی و محن ترے بنیر

اس کی حیات کو تھا آہِ قلبِ حق سے یہ غلہ بے خبر مقام ہے ہند میں حق کا قافلہ

فکر و شعور سے تہی جس کا ہے عزم و عہد ندمِ حیات سے فراہ آہ ہے جس کا شغلہ

پہل خطاب سے دیا جس نے سلام کا جواب

سود کلام سے دیا حسنِ کلام کا جواب

جس نے کیں تازہ سقیقِ سرگشی غمت کی حق کے خلاف بے پناہ معرکہ جہاد کی

اُہ وہ گرم جوشیاں ملت کم سواد کی اُہ وہ شانِ مبروہ شکر بندہ حق ہند کی

گالیاں سن کے بھی ملاں لبِ پدعائے خیر حق

عفو و کرم کی کل متاع یعنی منشا بر غیر حق

اب نہ اُٹھے گا عارفِ دین حجاز پھر کبھی اُہ ابوالکلام سا واقعہ راز پھر کبھی

ہو گا نہ عذیبِ من تمہ طراز پھر کبھی دفترِ علم و معرفت ہو گا نہ باز پھر کبھی

اُہ نہ جانی اس کی قدر ملت کم شناس نے

مسلم کم سواد نے اُمتِ ناپاس نے

مولانا ابوالکلام آزاد ایک نادر روزگار شخصیت

ماثران گرہ از زلف یار باز گنجد
شبے خوش است۔ یہ اس قصہ اش و لادکنید

وہ نقوش مدح نہیں ہوتے بلکہ زیادہ اہستہ رہتے ہیں مولانا کا تعلق
عظیم المرتبت انسانوں کی اسی آخری صف سے تھا اور ایسے انسان زمانہ کے
دور گزر جانے کے بعد ہی عرصہ شہود پر جلوہ آرا ہوتے ہیں۔ خواہ سنائی نہ
اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا تھا۔ جب کہا تھا کہ:-

دور با باید کہ تا یک مرد حق پیدا شود
بایزید اندر خاساں باو میں اندر قوی

نادر روزگار شخصیت

یقیناً مولانا ایک نادر روزگار شخصیت کے مالک تھے اور ایسے لوگوں
اوصاف و خاص کسی ایک وجود میں بہت ہی کم جمع ہونے میں انہوں نے
زندگی کے اتنے دائروں میں انتہائی بلند مقام حاصل کیا جس کا ہر شکل
ہے اور ان میں سے کسی ایک دائرے میں ویسی بلندی حاصل کر لینا بڑے
سے بڑے انسان کے لئے بھی واقعی فرما مان ہو سکتا ہے۔ علم و نفس
حقائق دین، اخلاص و حکمت، شرف و ادب، تصنیف و تالیف، تقریر و خطابت
اخبار نویسی و صحیفہ نگاری، سیاست و حکمرانی، عرض کو ن سادہ اثر اور کو ن
سلطہ ہے جس میں ان کی رنگی ابتلا ہی سے سب کے نزدیک ثابت و مسلم
ذہنی اور راجح تک اس کی تصدیق و توثیق ذہنی رہی ہے، عربی، فارسی، انگریزی
اور ہندو میں علوم کا شاید ہی کوئی قابل توجہ مطبوع یا مخطوط و کیاب ذخیرہ ہو،

مولانا کے متعلق بہت کچھ کہا جا چکا ہے بلکہ کہا جا سکتا ہے۔ بہت
کم بڑے آدمی ہیں، جن کے متعلق ان کی زندگی میں اتنی کتابیں شائع ہوئی
ہوں جتنی مولانا کے متعلق شائع ہوئیں۔ جب تک روز و شب کا سلسلہ دور
جاری ہے بہت کچھ لکھ جائے گا، تاہم حقیقت حال پر نظر رکھی جائے تو یہی
کہنا پڑتا ہے کہ ابھی تک کچھ بھی نہیں لکھا گیا۔

معا، چنانکہ توئی، ہر کے کہا داند
ہ نقد طاقت خود سے کنفادت مالک

انسانوں کے درجے

عظیم الشان انسانوں کے مقامات و مدارج ہیں۔ جو اس بناء پر مبنی
ہوتے ہیں کہ زمانی اور مکانی اعتبار سے ان کے دائرہ اثر و وسعہ کی کیا کیفیت
رہی، بعض افراد خاص اسباب کی بناء پر شہرت پا لیتے ہیں اور ان میں مقام
شہرت پر قائم رہنے کے جو ہر موجود نہیں ہوتے۔ بعض کو قدرت عزت و احترام
کی روح گاہوں پر پہنچا دیتی ہے۔ لیکن وہ اپنے مخصوص ماحول سے باہر کوئی
قابل ذکر حیثیت حاصل نہیں کر پاتے نیز ان کی قدروں کو زمانی اعتبار سے
چنداں یا عیداری نصیب نہیں ہوتی۔ بعض اوقات یہ خاک و الہ تیرہ و تاملی
تخصیصوں کی جلوہ گری سے بھی زیب و زینت پاتا ہے۔ جو زبان و مکان کے
درجہ قلب پر اپنی عظمت کے گہر سے نقش ثبت کر جاتی ہیں۔ میل و نہاد کے

ان کی نظر سے مگر رچکا تھا اور اس ذخیرے کی ہر متقی اقتداء تھی ان کے عزیز و
حفظہ ضبط میں محفوظ نہ تھی۔ لوگوں نے مختلف کتابیں پڑھیں اور ان کے وہ
مطالب ذہن میں چلائے جو انہیں پسند آئے۔ مولانا کے حافظے میں نہ محض تمام
مطالب ہی محفوظ تھے بلکہ مشہور مصنفوں کے اسلوب پر بھی حدود و گہری نظر تھی۔
جب اس موضوع پر گفتگو کرتے تو ایسے حقائق بیان فرماتے جو اس فن میں درجہ
اختصاص حاصل کرنے والوں کی زبان سے بھی بہت کم سنے گئے۔ حیرت اس
بات پر ہوتی تھی کہ یہ کمال انہوں نے کیوں کر حاصل کر لیا۔

حیرت انگیز کمالات

عربی تو بہر حال ان کی مادری زبان تھی اور حیات مستعار کے ابتدائی
دس سال انہوں نے مکرملہ میں گوارے تھے۔ لہذا اسے اہل زبان کی طرح
بولنے پر قوی و بہتر سمجھا جاتا ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ وہ فارسی بھی تازہ وار و
ایزخ و زور کے امتلاز میں بولتے تھے بہتر ایرانی طرز کا آئی کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ وہ
ایسی زبان فرانسیسیوں کی طرح بولتا تھا یہاں تک کہ اسے پردے میں بجا یا جانا تو کوئی
سچ نہ سکتا کہ فرانسیسی نہیں ایرانی بول رہے ہیں۔ چنانچہ ایک مرتبہ مولانا کو ایک ترک مہمان سے
فارسی میں باتیں کرتے سنا تو حیران رہ گیا۔ گفتگو میں اہل زبان کی سی روانی
کے علاوہ تلفظ کی لطافت اور لہجہ و بزم کی ملائمت کا وہی رنگ تھا جو خوش
ذوق ایرانیوں کا خاصہ ہے۔

علوم میں ہمہ گیر سی

پھر مختلف انسانوں کی طبیعتوں کو مختلف علوم سے مناسبت ہوتی ہے
اور انہیں میں وہ درجہ کمال حاصل کر لیتے ہیں۔ مولانا کی طبیعت کو ہر علم سے
مناسبت تھی۔ دین و مذہب، تاریخ و سیر، فلسفہ و حکمت، شعر و ادب،
علم الاسماء، آثار قدیمہ اور خدا جانے کس کس دائرہ علم و فن میں وہ یگانگی
کے درجے پر فائز تھے۔ یہاں تک کہ طب کی تعلیم بھی باقاعدہ پائی تھی اور دوسرے
علوم کے علاوہ طب بھی پڑھتے رہے جو کتاب ایک مرتبہ نظر سے گزر جاتی
تھی۔ اس کے تمام مطالب ذہن میں محفوظ ہو جاتے تھے۔ عربی، فارسی اور
اردو شعرا کے تذکرے اور دواویہ انہوں نے بالکل ابتدائی دور میں دیکھے
ہوں گے۔ شاید ہی کوئی اچھا اور قابل توجہ شاعر ہو جو انہیں یاد نہ تھا۔ ہم لوگوں
نے جن جن شعرا کے محض نام سن سکے تھے اور ان کا کلام کبھی نہیں دیکھا۔ ان
سلا کے اپنے خیال کے مطابق اسے دیکھنے کے قابل نہ سمجھا۔ مولانا کی تصانیف میں

ان کے اشعار بھی جا بجا ملتے ہیں۔ کبھی کبھ میں ذرا یاد آئے انہیں یہ تمام ذخیرے
دیکھ جانے کا وقت کب ملا اور ہزاروں گراں قدر کتابوں کے مطالعے سے
اتنی فرصت کیوں کر سیر آگئی کہ ان کتابوں کو بھی نظر سے گزرا لیا۔ جن کے وجود
تک سے اہل علم بے خبر رہے۔ پنجابی زبان کی ایک کتاب پٹی روٹی ہے جس
میں دینی مسائل سوال و جواب کے انداز میں بحث کی گئی ہے۔ قیام امرت سر
کے محدثان میں انہوں نے وہ کتاب بھی پڑھ لی تھی۔

غیر معمولی حافظہ

صلاحیت حفظ و استعمار کے لحاظ سے وہ قدرت کا ایک عجیب و
عزیم نشان تھے۔ بے تکلف کہا جاسکتا ہے کہ جو کچھ پڑھتے تھے، دماغ کے
مختلف خانوں میں ترتیب سے چھپتے جاتے تھے۔ برخلاف ضرورت کے وقت
خود بخود کھل جاتا اور جو شے چاہتے اٹھا لیتے۔ تذکرہ انہوں نے صرف حافظہ
کی بناء پر مرتب فرما دیا تھا۔ بعد میں چند کتابیں منگوا لیں تاکہ اطمینان فرما لیں
جو کچھ لکھا ہے اس میں کہیں غلطی تو نہیں ہوئی۔ اس کتاب کی دو جلدیں تھیں۔ مرحوم
فضل الدین احمد مرزا نے صرف ایک جلد چھاپی اور مولانا ابھی رپائی میں نظر بند
ہی تھے کہ مرزا صاحب کلکتہ پہنچ کر اپنے وطن پنجاب چلے آئے اور دوسری
جلد بھی سامنے آئے۔ پھر ان کا انتقال ہو گیا اور سب تلاش کے باوجود دوسری
جلد کا کوئی سراغ نہ مل سکا۔

اسی طرح ایک عربی دوست نے بتایا کہ جس زمانے میں مولانا "وکیل"
کے لٹے پڑے تھے۔ طباطبائی مرحوم کی شرح دیوان غالب میں انہوں نے سادہ
اوقات گلو اسلئے تھے اور ان پر مختلف شعروں کی شرح لکھتے جاتے تھے۔ ایک نیم
نے وہ سنہ مولانا کے علم کے بغیر اٹھا لیا اور تقسیم ہند کے وقت تک وہ محفوظ
تھا تقسیم کے ہنگاموں میں وہ قدر آتش ہو گیا۔
خدا کی خاص نعمت

"غبارِ خاطر" پہلی مرتبہ لاہور میں چھپی تھی اور میں اس کی نگرانی پر مامور
تھا۔ ایک مکتوب میں اپنے محسن احمد نگر کے حالات بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔
"اسی احمد نگر کے معرکوں میں عبدالرحیم خان خاناں کی ہماری
کا وہ واقعہ پایا ہوا جس کی سرگزشت عبدالباقی ہمسایہ ندی۔
(صاحب آثارِ رحیمی) اور مصباح الدولہ (صاحب آثارِ لامر) نے
نہیں سنائی ہے۔ جب احمد نگر کی مدد پر بیجا پور اور گوگلکندہ

کی وجہ سے بھی آگئیں اور خان خاں کی تھیں استعداد فوج کو سہل جی کی طاقت و فوج سے ٹکراتا پڑا معدودہ خان و دیوئے نے پوچھا تھا چنیس انہو سے و درپیش و فتح آسانی اگر حادہ ثر و دہدہ جاتے نہیں دہید کہ شمار دیا، ہم، خان خاں نے جواب دیا تھا۔ زیر مشہ۔

میں نے فارسی کا یہ فقرہ پڑھا تو احساس ہوا کہ فتح آسانی، اچھی فارسی معلوم نہیں ہوتی، ممکن ہے اصل میں فتح آسان نے فتح آسان نہیں ہو۔ میری گوارش کے جواب میں مولانا نے گلے سے لکھا۔

"دولت خان وہی کا مقولہ بعض حافظے سے کھا ہے لیکن

اس میں فتح آسانی ہی ہے۔ بین حالات ایسی ہے کہ سرداران کی بناء پر فتح کی امید نہیں کی جاسکتی۔ آذان کی مدد ہی سے جو قوم آسان نے ہرگز نہیں ہو سکتا.... اگرچہ دماغ مطمئن تھا۔ خیال ہماروں کی بات ہے۔ اصل مقام نکال کر دیکھ لوں۔ چنانچہ آثار لامہ میں مقام مل گیا اور دولت خان وہی کا مقولہ ٹھیک ٹھیک وہی نکلا جو حافظہ میں محفوظ رہ گیا تھا۔ طبیعت خوش ہوئی کہ تیس برس تک دماغ نے اس مقولے کی پوری حافظت کی تھی اور ایک لفظ بھی ادھر ادھر نہیں ہوا تھا۔

کون اس حافظہ کو خدا کی خاص نعمت تسلیم کرنے میں تامل کرے گا جس نے تیس برس میں ایک معمولی فقرے کا ایک لفظ بھی ادھر ادھر نہ ہونے دیا۔ ہر دائرے میں متعلق قدیس

اسے بھی چھوڑ بیٹے اور یہ دیکھئے کہ ہر دائرے میں انھوں نے مستقل قدیس تاریخیں۔ جن کا کوئی سرائے ان سے پیشتر کسی دائرے میں نہیں ملتا۔ اگر میں اس بارے میں تفصیلات پیش کروں تو ایک دفتر تیار ہو جائے تاہم ایک دو شایبہ پیش کے بغیر مدعا حاض نہیں ہو سکتا۔

"ابلال" سے پیشتر تمام برآمد و رسائل (الاماشا اللہ) امراد و اس سے عاتقی رقوم نے لینا فرما سب نہ سمجھتے تھے بلکہ قیمت کا اشتہار چھاپا جاتا تھا و ہر اور دوسرے نے زیادہ رقم لکھی جاتی تھی۔ شاید اس لئے کہ ان کے درجہ امتیاز میں کوئی خلل نہ آئے۔ "ابلال" نکلا تو اس کا پہلا ہی نمبر دیکھ کر ایک شہید صاحب بیادمت نے خاص رقم کا چیک مولانا کے پاس بھیج دیا۔ ساتھ ہی لکھا کہ ہر بیسے اتنی رقم باقاعدہ پہنچی رہے گی۔ سال بھر کے لئے تو وعدہ بھیجئے

اس کے بعد بھی اخبار اپنے پاؤں پر کھڑا نہ ہو سکا تو یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ سیرجی اور خود داری۔

مولانا نے شکر ہے کے ساتھ چیک واپس کر دیا اور لکھا۔

"ہم سب جس قدر کام اپنے ذمے لے لے رہے ہیں۔ وہ روئے کے بل، پبلک کی قدر دانی اور دوسرے قوم کے جو دسٹا کے بڑے پر نہیں بلکہ صرف اس کے فضل اور توفیق کے اقتدار پر جو اپنے دروازے کے ساتلوں کی فریادیں جب ایک مرتبہ سنو لیا ہے تو پھر دوسروں کی پوچھٹوں پر کبھی نہیں بھیجتا۔"

پھر فرمایا۔

"ہم اس بات میں سودا سے نفی کے لئے نہیں بلکہ تلاش نیاں و نقصان میں آئے ہیں۔ مدد تمہیں کے نہیں بلکہ نفرت و دشنام کے طلبگار ہیں۔ عیش کے پھول نہیں بلکہ غلش و اضطراب کے کانٹے ڈھونڈتے ہیں۔ دنیا کے زور و تسلیم کو تو ان کرنے کے لئے نہیں بلکہ خود اپنے تئیں تو ان کرنے کے لئے آئے ہیں۔ ایوں کی اعانت کر کے آپ کا جی کیا خوش ہوگا۔"

آخر میں تحریر فرماتے ہیں

"پھر یہ بھی معلوم نہیں کہ آپ کا یہ عطیہ کس مقصد سے ہے؟ اگر آپ مجھے خریدنا چاہتے ہیں تو یہ رقم ایک گراں قدر قیمت ہے۔ میں تو اپنی قیمت جس گھاس کی ایک ٹوکری کو بھی گراں سمجھتا ہوں۔... ہاں اگر اس سے میری دانستہ اور میرا غیر خریدنا مقصود ہو تو یہ ادیب صاحب عرض ہے کہ ان خوف نازہ ملنے شافی کی تو کیا حقیقت ہے، اکوہ نور اور تحت طاؤس کی دولت بھی بچ کر لیجئے۔ تو آج آپ کی پوری ریاست کے اس کی قیمت کے آگے بھیجیں۔ یقین کیجئے کہ اسے تو سوائے شاہنشاہ حقیقی کے اور کوئی نہیں خرید سکتا اور وہ ایک مرتبہ فرید چکا۔"

کم از کم اعداد اخبار نویسی میں میرے علم کے مطابق غلطی خود داری کی یہ پہلی صدائے حق تھی جس نے اس اخبار نویسی کے معیار کو آسان پر پہنچایا۔

"ابلال" کی ضمانت کا واقعہ

طلب ضمانت کا غیر مقدم "ابلال" سے پیشتر کبھی کسی اخبار نے نہ کیا تھا۔

اہل ہند سے ملاقات میں دہلی دار کی ضمانت مانگی گئی تو مولانا نے پہلے یہ فرمایا کہ نہ جس تامل کیا۔ جب اطراف ملک سے بچے و بچے خطوط ان کی خدمت میں پہنچنے لگے تو ۶ ستمبر ۱۹۴۷ء کی اشاعت میں یہ خبر شائع کی اور اس کا عنوان رکھا۔
”اہل ہند سے عشق“ ساتھ ہی فرماتے ہیں:-

”انسان صرف کام کے لئے بنایا گیا ہے۔ جس اس کو چاہیے کہ اپنے کام میں معروف رہے۔ یہ بہت ہی اعلیٰ نصاب کی اور چھوٹی باتیں ہیں کہ لوگوں کا اس کے متعلق کیا خیال ہے اور حکام وقت اسے کیا سمجھتے ہیں۔“

اس شخص میں یہ اصول پیش کر دیا کہ حق و صداقت کے لئے کامیاب و منصوبہ ہونا لازم ہے۔ باطل سے ساتھ مذہبی طاقتوں کا کتنا ہی ساز و سامان ہو اور وقتی کامیابیاں اسے خواہ کتنا ہی مغرور کر دیں لیکن بالآخر وہ خاسروں کا مرد ہے گا۔
آفریں سمجھتے ہیں کہ ۶ ستمبر کو دہلی دار کی ضمانت طلب کی گئی تھی۔ جسے وہ نہ تک داخل کرنے کی ہمت تھی، لیکن سواری کو داخل کر دی گئی۔

”ضمانت کا بعد یہ تو اسی تاریخ سے یہ طور ایک سرکاری امانت کے طور پر رکھ دیا گیا تھا۔ جس دن اہل ہند پریس کا ابتدائی سامان خریدنے کے لئے ہم نے دوپہر نکالا تھا۔ پچہ ہے کہ اس امانت کی حفاظت کرتے کرتے ہم آگے گئے تھے اور اب تو وقت آگیا تھا اگر کوئی مانگنے کے لئے نہ آتا تو ہم خود ہی پیش کرنے کے لئے آگے بڑھتے..... بڑی فکر تھی کہ جب عروج قیمت سے ضمانت کی پہلی منزل بھی ملے نہیں ہوتی تو آئندہ کی فکر کے لئے ہمیں وقت کیسے ملے گا؟“

قول فیصل

ایسی بے شمار قدیں مولانا نے ہر دائرے میں قائم کیں اور ان سے پیشتر ہماری قومی زندگی میں ان کا کوئی نشان موجود نہ تھا۔ وہ دہلی دار میں مسلسل ترک موالات گرفتار ہوئے تھے۔ اور وقت کے قومی فیصلے کے مطابق انھوں نے بھی دوران مقدمہ میں عدالت سے تعاون نہ کیا تھا۔ البتہ آخر میں ایک بیان داخل کیا تھا جو قول فیصل کے نام سے مشہور ہوا۔ یہ آج بھی موجود ہے۔ چند دستاویز میں چھوٹے بڑے ہزاروں افراد گرفتار ہوئے تھے اور بے شمار لوگوں نے تحریری بیانات دیئے تھے۔ مگر کوئی بیانات قول فیصل کا درجہ حاصل

نہ کر سکا بدین آزادی کے خلاف مقدمے ہر ملک میں چلے اور اکثر نے بیانات بھی دیئے۔ میرے علم کے مطابق آرٹ لینڈ کے قائد آزادی سابرٹ ایڈلٹ کا بیان بہت پرزور اور پرتاثر مانا جاتا ہے۔ لیکن قول فیصل کے مقابلے میں بھی وہ بالکل بے کیف معلوم پڑتا ہے۔ مولانا نے اس میں حقیقتِ حالی واضح کی، آزادی کے لئے ہر حد و جہد کا اقرار کیا۔ بلکہ کہا میں اس جرم کا ارتکاب بہت پہلے سے کر رہا ہوں اور اسے اپنا پیدائشی حق قرار دیا۔ پھر اپنا یہ یقین بھی واضح کر دیا کہ حق کامیاب ہو گا اور باطل اپنی ظاہری قوت کے باوجود منہمک نہ کئے گا۔ دنیا جانتی ہے کہ حالات نے مولانا کے اسی یقین کا ساتھ دیا۔ خدا کی سنت کبھی نہیں بدلتی، قدرت کے مقرر کئے ہوئے اصول کی کار فرمائی میں کبھی تغیر نہیں ہوا۔ لیکن یہ بول بول لینا ایک چیز ہے اور اس کا فرمائی پر چٹانوں سے بھی بدرجہا زیادہ مستحکم ایمان و یقین کی روح سے معمور ہونا بالکل دوسری چیز ہے

مقام دعوت کے تقاضے

”اہل ہند“ کے ابتدائی دور میں بعض اصحاب کو یہ احساس پیدا ہوا کہ مولانا کا لبہ جو ذرا سخت اور درشت ہے۔ ممکن ہے ”اہل ہند“ کی جلدوں کا مطالعہ کرتے وقت اب بھی بعض اصحاب کو یہ احساس پیدا ہو۔ اس غلط فہمی سے محفوظ رہنے کے لئے مولانا کے مقام دعوت اور وقت کے عام حالات کو پیش نظر رکھ لینا ضروری ہے۔ وہ آزادی اور حق پرستی کی دعوت لے کر اٹھے تھے۔ ”اہل ہند“ اس دعوت کا ذمہ دار تھا۔ دائمی کا مقام اس امر کا متقاضی ہوتا ہے کہ اپنی ہر بات کو عوام کے دلوں میں اتار دے۔ وہ صرف دماغوں کو اپیل نہیں کرتا بلکہ دماغوں سے کہیں بڑھ کر اس کی اپیل دلوں سے متعلق ہوتی ہے۔ اس زمانے میں عام طور پر بے حس پائی جاتی تھی۔ ہر طرف جمود نظر آتا تھا۔ حکومت کا رعب دلوں پر چھایا ہوا تھا۔ ذی و سائل اور ذی رتبہ افراد کے لئے ایک خاص احترام کی فضا موجود تھی۔ خواہ ان کا مسلک مشرب راہ حق سے کتنا ہی جٹا ہوا تھا۔ مولانا کے لئے ایک دائمی حق کی حیثیت میں صورت حال کو منقلب کئے بغیر چارہ نہ تھا۔ اسی ضرورت نے انھیں ایک ایسے لب و لہجہ پر مجبور کیا جو درشت نہیں البتہ حد درجہ بے باک و ظہور تھا۔ دعوت حق کو کامیاب بنانے کا احسن طریقہ یہی تھا کہ وہ نہایت ہر اس انگیزہ اقتادات کو زیادہ سے زیادہ محبوب و دل پذیر بنا دیتے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں

سے نفق و سود کو ٹھکرایا اور فقہان و زبیاں سے پیار کی دعوت دی۔ پھولوں
پامال کیا اور کاتوں سے محبت کرنے کی صدا بلند کی۔ اس وقت اہل ملک کو
قربانی کے لیے تیار کرنا منظور تھا اور قربانی کی دعوت گل ہاسوں کے ذریعے
سے کبھی پروان نہیں پرواھی۔

شانِ استقامت

مولانا کے ایمانی و یقینی کی طرح ان کی رسلے کو بھی جنگی کا بلند ترین
درجہ حاصل تھا۔ وثوق سے نہیں کہا جاسکتا کہ انھوں نے ملک کی آزادی
کے لیے کب اپنے ذہن میں ایک مستقل نقشہ تیار کر لیا تھا۔ اسپتال کے
پہلے بزرگے اکتے جیسے ہیں ایک اشارہ کیا ہے کہ مشرق کے موسم سرما میں ان
کی چشم بیدار۔ سنہ ایک خواب دیکھا تھا۔ دنیا کے سامنے ان کے نقشہ عمل
کے اجزائے مشرق میں آئے یعنی جو پورے گرم انھوں نے اٹھارہ سال کی عمر
میں تیار کیا تھا اس پر چوبیس سال کی عمر میں عمل شروع کیا۔ اس وقت سے
آزادی حاصل کرنے تک پچیس سال گزر گئے، سینکڑوں اکابر کی رائیں
بدلیں۔ اسی کے مسالک و مشابہ میں تغیر پیدا ہوا لیکن مولانا نے جو راستہ
مشق دیں اختیار کیا تھا۔ اس پر وہ برابر انتہائی دلجمعی سے قائم رہے یہاں
اس راستے پر بحث کا کوئی سوال نہیں، اصل سوال یہ ہے کہ وہ جہاں ایک
مرتبہ چٹان کی طرح جم گئے وہاں سے ایک آہ بھی روم اور نہ ہونے۔ زندگی
کی عذیب ترین متاع ہر دل عزیز ی ہے جسے قربان کرنے کے لیے انسان بہ آسانی
تیار نہیں ہوتا۔ یہ متاع عذیب نہیں ہوا ان کے ابتدائی مراحل ہی میں اس پیمانے پر
مل گئی تھی۔ جس کا ایک حصہ بھی اکثر اصحاب کے نزدیک سرمایہ فربہ کہ حاصل
حیات ہوتا ہے اور یہ ہر دل عزیز ی ایسی نہ تھی جیسی سیاسی جگاموں کے دوران
میں پھولوں کے باروں، جلوسوں اور نعروں کی شکل اختیار کر کے میڈروں
کے دھڑو پیش ہوتی رہی۔ مولانا کی ہر دل عزیز ی دلوں کی تڑپ کا جزو و بن گئی
تھی۔ یہ گراں بہا متاع انھوں نے اپنی رائے کی پختگی اور اپنے مسالک کی استقامت
کے سوا کسی بے دریغ نثار دی۔ اپنے علم و فکر کے مطابق مٹی کی خاطر اس
بے نظیر حصے، اس بے مثال ہمت اور اس بے دریغ قربانی کا نمونہ کہاں مل
سکتا ہے؟

علم و عمل کا تاجدار

عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ جن لوگوں کو علم و نظر میں تاجدار ی مسطانی

کا مرتبہ مل جاتا ہے۔ وہ عمل و عزمیت کے میدان میں کم تر ہی کوئی ممتاز درجہ
حاصل کرتے ہیں۔ کتابوں کے مطالعے اور غور و فکر میں انہماک عموماً قوت عمل
پر ناخوشگوار اثر ڈالتا ہے۔ مولانا علم و عمل دونوں کے تاجدار تھے۔ انھیں دونوں
دائرہ میں مسطانی کا تاج نصیب ہوا اور آج فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ وہ علم
میں بڑے تھے یا عمل میں، انھوں نے مدت العمر قوم کو عزمیت کی دعوت دی
اور یہ دعوت خوش مذا الفاظ، دل نشیں تحریرات یا پڑھنا تیر خطابت تک محدود
نہ تھی بلکہ ایسے قلب کی گہرائیوں سے اٹھی ہوئی دعوت تھی۔ جس کے متحرک خون کا
ہر قطرہ عزمیت کی عبادت سے نمود تھا۔ انھوں نے جو اونچی سے اونچی بات
کہی۔ اس پر اونچے سے اونچے کا عمل کا نمونہ پیش کیا۔ ایسے یگانہ افراد ہر فضا
میں تربیت نہیں پاتے اور ایسے گراں مایہ گو ہر خاک سے نہیں اٹھتے
غالب کیا خوب کہا گیا ہے۔

علم پر رخ پر گرد کہ جگر سے غصہ
چوں من از دودہ آتش نفاں بر خیزد
مضمون ہے قصہ و ادا بہت لمبا ہو گیا۔ سچ ہے:-
ہیں عشق است بر خود چیدہ چلوں اتل وند
کھے از معنی یک حرف صد دفتر نے ساند

استقامت اور بے نیازی

ماہم مولانا کی ایک نادر خصوصیت کا ذکر کر کے بغیر اسے ختم نہیں کر سکتا
یہ ان کی شان بے نیازی تھی۔ اسپتال کے دور اور ہی میں دنیا نے نسیم کر
لیا تھا کہ علم و فطرت میں ویسا آدمی صدیوں سے پیدا نہیں ہوا اور فقیہ مندوں
کا ایک وسیع حلقہ ان سے وابستہ ہو گیا تھا۔ بارہا ان سے التجاؤں کی گیشیں
کہ اپنے صانع مرتب فرما دیجئے اور اپنے علوم و معارف کی مستقل حفاظت کا
بندوبست کر دیجئے انھوں نے ایک سے زیادہ مرتبہ نیاز مندوں کی التجاؤں
کو شرف پذیرائی بھی بخشا۔ پھر ہر یکم، ہر منصوبہ اور ہر اداہ ان کی بے نیازی کی
نزد ہو گیا۔ وہ تھوڑی دیر کے لیے بھی ایک جگہ اطمینان سے بیٹھ جاتے تو
علوم و معارف کا ایک یگانہ حلقہ قائم کر سکتے تھے اور یہ حلقہ ان کی نگرانی میں
علمی کارناموں کے ایسے انبار لگا سکتا تھا۔ جن کی کوئی مثال اس وقت تک
سامنے نہیں آئی اور خود ان کے معارف بھی بہترین طریق پر اشاعت پا سکتے
تھے مگر انھوں نے اپنی ذات کو ہمیشہ سب سے آخر میں رکھا۔ یہ استقامت

یہ بے نیازی تمام نیاز مندوں کے لئے ہمیشہ رنج و قلق کا سامان بنی رہی۔
 معلوم ہوتا ہے وہ طے کے بیٹھے تھے کہ اگر انھوں نے علم و عمل کی کوئی قابل
 ذکر متاع چھوڑی ہے تو زمانہ خود اسے محفوظ کرے گا۔ اگرچہ اسے محفوظ کر
 دینے کا وقت کتنی صدیوں کے بعد آئے گا اگر ایسی کوئی متاع نہیں چھوڑی تو
 پھر اس کی حفاظت میں چند لکے بھی صرف کرنا قدرت کی عطا کی ہوئی مہلت
 کا ضیاع ہوگا۔

نذر خیر

میں اپنے علم و نظر کی بے باکی کو سامنے رکھتے ہوئے اس بلند مرتبہ
 شخصیت کے تعلق کچھ لکھنے کا اہل نہ تھا۔ چند محوسات و مشاہدات تھے، جو
 بے اختیار زبانِ قلم پر آ گئے۔ یہ بے رنگ اور بے خوشبو پھول ہیں۔ جنہیں
 رامیں میں سمیٹ کر مولانا کی بارگاہِ عظمت و جلال میں حاضر کیا ہوں۔ ایک
 بے نوا فقیر سلطانِ علم و عمل کی قدم گاہ میں اور کیا نذر پیش کر سکتا ہے؟
 خدا کرے یہ نذر خیر شرف قبولی سے محروم نہ رہے۔ اس ذکر کو مرزا غالب
 کے ایک شعر پر ختم کرتا ہوں جس کی روایت فروز تابدلی ہے۔

روحی الہادی

يُغْفِرُكَ اللَّهُ

قطرہ تاریخ وفاتِ حضرت آیات امام اہلند حضرت مولانا ابوالکلام آزاد نور اللہ مرقدہ

اُٹھ گیا آزاد ذی فضل و کمال	ہوئی سنسان بزمِ سوز و ساز
چشمِ ناکام تماشاے جمال	گوشِ محروم مسدائے دلِ لال
چھپ گیا علم و ادب کا آفتاب	اُگئی شامِ بلا محشر طراند
جنگِ آزادی کا دمِ مرجھری	سمر زہی ہند کو تھا جس پہ ناز
تھا غریبوں کا انیس دھم گدار	درد مندین وطن کا چارہ ساز
تھا سراپا درد وہ عالی تبار	پسبیکِ اخلاق تھا وہ پاک باز
اس کا دل تھا محرمِ رازِ حیات	دور ہیں مٹی اس کی چشمِ امتیاز
رحلتِ آزاد کی صبحِ طلال	سے کے آئی ہے شبِ بھر دروازہ
اس کی فرقت میں ہیں آنکھیں غمگین	ہے نمایاں پر یہ دھاسے دل گناہ
و قف ہمیشہ جاوداں ہو اس کی روح	مے اسے جنتِ خدا سے بے نیاز

یہ ہے روحی اس کی تاریخ وفات

نہ پر تربت اب ہے جو خوابِ ناز

۱۹۵۸ء

۷۹

پندہا دند محسن ہمیشہ گنا سے بود
 اندر میں دیر کہیں سے کردہ آتشے بود
 مرزا غالب ہندوستان کے یگانہ تاجدار محسن تھے۔ مولانا علم و عمل دونوں
 کے یگانہ تاجدار تھے۔ مرزا بھی گناہ نہ تھے اور مولانا کے بارے میں بھی
 کسی کو گناہی کا دوسرہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن مرزا نے اپنے مقام کی برتری اور
 اس کے شایانِ شان قدر شناسی سے محرومی کے باعث اپنے آپ کو گناہ
 کہنا پسند کیا تو اس پر تعجب نہ ہونا چاہیے۔ بالکل یہی حالت مولانا کی سمجھیے۔
 زمانہ جس طرح غیر معلوم ماضی سے گردش میں ہے۔ اسی طرح غیر معلوم
 مستقبل میں بھی گردش کرتا رہے گا۔ عام لوگ بھی پتہ نہیں لگاتے۔ میں گئے اور
 بلند مرتبہ شخصیتوں کے جلوہ کا دروازہ بھی بند نہ ہوگا۔ لیکن ہم غیرہ ذوقی کے
 جس عہد سے گزر رہے ہیں اسے مد نظر رکھتے ہوئے کیا امید ہو سکتی ہے
 کہ مولانا کے پایے کی یا ان سے ملتی جلتی شخصیت پھر پیدا ہوگی؟ اس کا شائبہ
 کی کوئی بھی شے ذہن کی دسترس سے باہر نہیں۔ بقول عرف استاد کے
 ہے۔

اگست ۱۹۵۸ء

آج کل دہلی دارالکلام ہنس

ترجمان القرآن

مولانا ابوالکلام آزاد نے اردو ادب کے عین میں حسن انشا و بیان کے جو پھول کھلائے ہیں، یوں تو وہ سب ہی سدا بہار ہیں لیکن متعلق تعنیف کی حیثیت سے قرآن مجید کی تفسیر ترجمان القرآن مولانا کی تمام علمی اور ادبی تقریروں میں شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے۔ قلم کی توانائی، اجتہاد و فکر، وسعت منظر و مطالعہ اور جذبہ تحقیق و تدقیق، مولانا کی یہ وہ خصوصیات ہیں جو ان کی ہر علمی اور ادبی تقریر میں نظر آتی ہیں لیکن مولانا کی یہ خصوصیات اس کتاب میں جا بجا نمایاں ہیں اور اس بنا پر اردو زبان کے علمی ذخیرے میں اس کو امتیازی مقام حاصل ہے۔

عربی، فارسی اور اردو میں سیکڑوں تفسیریں لکھی جا چکی ہیں لیکن ان کا عام رنگ یہ ہے کہ ایک آیت کی تشریح و توضیح میں یا اس سے مستخرج احکام کے بارے میں متعین مفسرین کے جو مختلف اقوال منقول ہیں ان سب کو نقل کرتے چلے جاتے ہیں اور ساتھ ہی ان اقوال میں سے ہر ایک کی دلیل بھی بیان کر دیتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اگر باب علم ان سے استفادہ کریں تو گمراہی۔ لیکن عام لوگوں کا دماغ ان میں الجھ کر رہ جاتا ہے اور قرآن کا جو مقصد ہے یعنی کسی حقیقت کو دلہن لیں کر کے اس کا یقین پیدا کر دینا وہ حاصل نہیں ہوتا۔ علاوہ ازیں ہر مفسر کو تشویش کرتا ہے کہ وہ فقہ یا علم الکلام کے جس مسلک سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کو قرآن کی آیات سے ثابت کرے۔ اور دوسرے مسلک کے لوگوں کی تردید میں اس سے استدلال کرے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قرآن کی تفسیر میں تاویل و توجہیر کا ایک ایسا باب کھل جاتا ہے کہ قرآن کی حریمیت، اس کی جامعیت اور اس کی سچے قید و بند قیامات محدود ہو کر رہ جاتی ہیں اور قرآن فقہی اور کلامی بحثوں کا میدان بن جاتا ہے۔ مولانا نے اس عام روش کے خلاف بالکل ایک نیا طریقہ اور نیا

اسلوب اختیار کیا ہے جو قرآن کی حریمیت کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔ مولانا عربی زبان اور اس کے اسالیب بیان، صحابہ کرام کے اقوال اور قدما مفسرین کی تشریحات و توضیحات کی روشنی میں کامل غور و خوض کے بعد قرآن کی آیت کا ایک مطلب بتیسی کر لیتے ہیں اور اس کو کمال قوت و بلاغت کے ساتھ بیان کر دیتے ہیں۔ اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ قاری کھنڈہن میں اضطراب و کشمکش کی کوئی کیفیت پیدا نہیں ہوتی اور قرآن کے حقائق و مطالب دل میں اترتے چلے جاتے ہیں۔

عام تفسیروں کی ایک دوسری خصوصیت یہ ہے کہ ان میں بقول مولانا کے "وضعیت پائی جاتی ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ زمانے کی رفتار کے ساتھ ساتھ جو علوم و فنون پیدا ہوتے رہتے رہتے اور عام انسانی افکار و خیالات پر ان کی معرفت مضبوط ہوتی رہی قرآن کی تفسیر میں بھی اس کے اثرات نمایاں ہوتے رہے۔ چنانچہ امام فخر الدین رازی کی مشہور تفسیر کبیر کی نسبت کہنا پڑا کہ اس میں منطقی، فلسفی و حکمت علم الکلام وغیرہ سب کچھ ہے مگر قرآن نہیں ہے۔ ہمارے زمانے میں اس کی سب سے بڑی شکل معرکہ علامہ جوہر علی شاہ کی ضخیم تفسیر ہمارا قرآن ہے جس نے قرآن کو سائنس کے علوم و فنون کا ایک ذخیرہ بنا دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ منیت و اصاحت قرآن کی اس سادگی اور فطرت کے بالکل خلاف ہے جو اس کی ہر ہر آیت میں نمایاں ہے۔ قرآن اگرچہ عقل کو نظر انداز نہیں کرتا لیکن اس کا عام طریقہ استدلال وجدانی ہوتا ہے جس کو ہر شخص خواہ عالم ہو یا جاہل محسوس کرتا ہے اور اسی وجہ سے کئی دہائیوں سے اور اصلاح کا وہ عقیدہ حاصل ہو سکتا ہے جس کے لئے دنیا میں بغیر آگے نہ رہے اور جس کے لئے خود قرآن کا نزول ہوا۔ اس سلسلے میں مولانا کا کمال یہ ہے کہ ایک طرف تو اس فطرت اور سادگی کا سرچشمہ ہاتھ سے نہیں جانے دیتے

دوران کے اسلوب بیان کی نمایاں خصوصیت ہے اور دوسری جانب جہاں کہیں قرآن کی تاریخی حقیقت کو بیان کرنے کے لئے سائنٹیفک طریقہ استعمال کی ضرورت ہوتی ہے وہاں تحقیق و تدقیق اور بحث و نظر کا حق ادا کر دیتے ہیں چنانچہ ان میں دو افریقہ نامی جن شخصیت کا ذکر کیا ہے اس کے بارے میں کافی اختلاف ہے کہ یہ کون شخص تھا؟ اگر مفسرین کا یہ خیال ہے کہ ذوالفریج مراد سکے مقدونی ہے۔ ایکس مولانا نے ان تمام آراء کے برخلاف بڑی تحقیق اور کاوش کے بعد ثابہ شدہ نتخافات جدیدہ اور پھر طوطی قرآن کے بیان کی روشنی میں یہ ثابت کیا ہے کہ مراد ایرانی کا حلیم المرتبت بادشاہ کیسرو ہے۔ مولانا نے اس بحث میں ایک بلند پایہ مہذب کا مدول لایا ہے۔ اسی طرح خدا کی ذات و صفات پر سورۃ فاتحہ کی تفسیر میں جو کلام کیا ہے وہ جس طرح انسانی فطرت و وجدان کو اپیل کرتا ہے فلسفہ کے طلباء اور علماء کو بھی متاثر کرتا ہے۔ مولانا قرآن کی اصل فطرت اور سادگی اور اس کی وحدانیت کے ساتھ فلسفہ و سائنس کا پیوند اس خوش اسلوبی کے ساتھ لگاتے ہیں کہ وہ شخصیت کا رنگ غالب نہیں ہونے پاتا اور وجدان کی بیداری کے ساتھ عقل کی تسکین کا بھی سامان ہوتا ہے۔

ان چیزوں سے قطع نظر عام تفسیروں میں ایک نقص یہ ہے کہ ان میں معمولی معمولی اور فردی باتوں پر بہت زور دیا جاتا ہے۔ لیکن جہاں تک قرآن کی اہم اور بنیادی تعلیمات کا تعلق ہے جن کا رابطہ عام انسانی اجتماع و تمدن سے ہے ان پر یا تو کلام ہی نہیں کیا جاتا۔ یا کلام کیا بھی تو محض سرسری اور فحشی۔ جس سے قرآن کا بڑا مقصد فوت ہو جاتا ہے اور اس کا خطاب ایک قوم یا ایک جماعت کے ساتھ مختص ہو کر رہ جاتا ہے۔ مثلاً وحدت ادیان۔ اور دوسرے مذاہب اور انہی اہمائی کتابوں کی تصدیق۔ قرآن کی ایسی اہم اور بنیادی تعلیم ہے جس کو اس نے بار بار مختلف طریقوں سے بڑے شہ و مد کے ساتھ بیان کیا ہے۔ لیکن عام مفسرین نے اس پر زیادہ اکتفا نہیں کیا اور جہاں کہیں ایسی آیات آئی ہیں ان پر سرسری طور سے گزر گئے ہیں۔ متاخرین میں غالباً حضرت شاہ ولی اللہ الہادی پٹنہ شخص ہیں جنہوں نے جہاں اکتفا کیا ہے وہاں اور دوسری کتابوں میں اس حقیقت کو زیادہ اہم اور اہم قرار کیا ہے اور ان کے بعد مولانا ابوالکلام آزاد دوسرے بزرگ ہیں جنہوں نے اس بحث پر نہایت مدلل، واضح اور پُر زور کام کیا ہے اور اس سلسلے میں دین کی اصل حقیقت، عہد بعد اس کا ارتقاء، شریعت و منہاج کا فرق، دین اور شریعت کا باہمی تعلق، دوسرے مذاہب ان کے بائیں ادیان کی

آسمانی کتابوں کے تعلق قرآن کا نقطہ نظر اور اس سلسلے میں پیغمبر اسلام کی عام دعوت اور انسانیت عام کی فلاح و بہبود کا اصل راز۔ ان تمام مباحث پر مولانا نے زور قلم کمال بلاغت اور وسعت فکر و نظر کا حق ادا کر دیا ہے۔ اس بحث کو پڑھ کر سائنس محسوس ہوتا ہے کہ قرآن اس پروردگار عالم کا کلام ہے جس کی لولہ بیت اور پروردگاری ہر انسان اور ہر شخص کے لئے ہے اور وہ کسی خاص ایک گروہ کے ساتھ مخصوص نہیں۔ قرآن فرقہ بندیوں اور گروہ سازیوں کو توڑنا چاہتا ہے نہ کہ ان میں اور اضافہ کرنا۔ وہ ایمان اور اعمالی صالحہ کی طرف جو دعوت دیتا ہے وہ ایک ایسی انلی اور بادی حقیقت ہے جو ہر مذہب کی بنیاد ہے اس لئے اس کا کام دین کو دین ہے نہ کہ فعل کر دین۔

چنانچہ مولانا اسلام کے لفظ کی تشریح بھی اسی وحدت ادیان کی روشنی میں اس طرح کرتے ہیں :-

”اس نے قرآن لے، دین کے لئے الاسلام کا لفظ؛ اسی لئے اختیار کیا ہے کہ اسلام کے معنی کسی بات کے مان لینے اور مان بڑا کرنے کے ہیں۔ وہ کہتا ہے، دین کی حقیقت یہی ہے کہ خدا کے جو قانون سادات انسان کے لئے مقرر کیا ہے اس کی ٹھیک ٹھیک اطاعت کی جائے۔ وہ کہتا ہے۔ یہ کچھ انسان ہی کے لئے نہیں ہے بلکہ تمام کائنات جتنی اسی اصل پر قائم ہے۔ سب کے بقا و قیام کے لئے خدا نے کوئی کوئی قانون عمل مقرر کیا ہے اور سب اس کی اطاعت کر رہے ہیں۔ اگر ایک لمحہ کے لئے بھی روگردانی کریں گا خدا کو دہم برہم ہو جائے۔ . . . وہ جیہ کہتا ہے ”الاسلام کے سوا کوئی دین اللہ کے نزدیک مقبول نہیں تو اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ دین حقیقی کے سوا جو ایک ہی ہے اور تمام رسولوں کی مشترک تعلیم ہے انسانی ساخت کی کوئی گروہ بندی مقبول نہیں۔“

(ترجمان القرآن ج ۱ ص ۲۰۸-۲۰۹)

مولانا نے اس بحث کے آخر میں ایک پُر نکاتہ پیدا کیا ہے۔ مجھ کو یاد نہیں پڑتا کہ کہیں کسی اور جگہ میری نظر سے گزرا ہو۔ یہ سب کچھ لکھنے کے بعد خود سوال کرتے ہیں کہ :-

”جب قرآن کی دعوت کا یہ حال تھا تو پھر خراس میں اور اس کے مغربی میں وجہ نزاع کیا تھی؟ ایک شخص جو کسی کو بُرا نہیں کہتا

صوبہ کرنا اور سب کی تنظیم کرنا ہے اور ہمیشہ ای ہی باتوں کی
تفصیل کرتے رہے جو سب کے یہاں مافی ہوئی ہیں۔ کوئی اس سے
ٹھہرے تو کہیں ٹھہرے؟ اور کہیں لوگوں کو اس کا ساتھ دینے سے
انکار ہو؟

اس سوال کو قائم کرنے کے بعد خود ہی اس کا جواب اس طرح دیتے ہیں:-
"اصل یہ ہے کہ بیروان مٹا جب کی مخالفت اس لئے نہ تھی
کہ وہ (قرآن) انہیں مجتہد تاکہوں ہے بلکہ اس لئے تھی کہ مجتہد
یکوں نہیں؟ ہر مذہب کا پیرو چاہتا تھا کہ قرآن صرف اسی کو
تھا کہ باقی سب کو مجتہد نہ۔ اور چونکہ وہ یکساں طور پر سب
کی تصدیق کرتا تھا اس لئے کوئی بھی اس سے خوش نہیں ہو
سکتا تھا۔"

یہ جو کچھ عرض کیا گیا اس سے افزاء ہو سکتا ہے کہ مولانا نے تفسیر میں جو
کچھ لکھا ہے اس کا ذہنی پس منظر کیا ہے؟ اب سوال یہ ہے کہ یہ ذہنی پس منظر
خود بخود دین گیا یا اس کی تعمیر میں چند خارجی مؤثرات و عوامل کا دخل ہے؟
اصل یہ ہے کہ انیسویں صدی کا نصف آخر اور بیسویں صدی کا شروع ایک
ایسا دور ہے جس میں عالم اسلام نے فکری اور ذہنی طور پر ایک نئی گردش
لی ہے اس کے اسباب سیاسی بھی ہیں اور علمی بھی۔ دنیا کے عام تمدنی حالات
بھی ہیں اور علوم جدیدہ کا ارتقاء بھی! اسی نئی گردش کا نتیجہ تھا کہ مصر میں
صفی محمد عبدہ اور سید رشید رضا پیدا ہوئے اور ہندوستان میں شبلی اؤ
مرسید۔ مولانا اہل کلام کی سوانح عمری سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ایک
طرف تو مولانا میں خود اجتہاد فکری کی کمی نہیں تھی اور دوسری جانب وہ سید
رشید رضا اور سرسید مؤرخانِ دہلیوں کی تحریروں سے کافی متاثر تھے اور ان کا
یکڑت مطالعہ کرتے تھے۔ چنانچہ اگر کوئی شخص سید رشید رضا کی تفسیر المنار
اور مولانا کا ترجمان القرآن ایک ساتھ مطالعہ کرے تو اسے صاف نظر آئے گا
کہ ایک ہی سانچے میں ڈھلے ہوئے دو ذہن ہیں جو دو مختلف زبانوں میں اظہار
مطلب کر رہے ہیں۔

متوسلین میں مولانا حافظ ابن تیمیہ اور حافظ ابن قیم سے کافی متاثر
ہیں۔ اہللال اور اہل بلاغ کے ذہن میں مولانا کے قلم سے جو ذہنی تحریریں
نکلیں ان میں یہ رنگ کافی نمایاں نظر آتا ہے۔ لیکن مولانا کے علوم و بیانات و اشعار

اور قدت و بلاغت کلام کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے خواہ کوئی فکر یا خیال
کہیں سے لیا ہو لیکن اس کو اس بسط و تفصیل سے اور مدلل و برہنہ بیان
کریں گے کہ اس فکر کے بانی اور موجد وہی نظر آئیں گے۔

شروع شروع میں جب مولانا کی کتاب "ترجمان القرآن" چھپ کر آئی تو
جیسا کہ پہلے سے توقع تھی۔ جہاں عام طور پر اس کو ماعتوں کا تہ لیا گیا اور سرائیکی
مسلمانوں کے ایک طبقے میں اس پر سخت تنقید اور مذمت چینی مچی ہوئی۔ جو لوگ چار پنج
صدیوں سے اجتہاد فکری سے محروم ہو کر تقلید محض اور جمود فہمی کی زندگی بسر کر رہے
ہوئے ان میں مولانا اہل کلام آزادانہ ایسے جہت فکری کا پیدا ہو جانا ان کے بیجاں کا
باعث ہی ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ترجمان القرآن پر تنقیدیں ہوئیں اور بہت دنوں
تک اخبارات اور رسائل میں یہ سلسلہ چلتا رہا۔ اگر ان تمام تنقیدوں کا تجزیہ کیا
جائے تو ان تنقیدوں کا حاصل صرف یہ دو چیزیں ملیں گی۔

۱۔ مولانا نے قرآنی حقائق کا بیان اور آیات کی تفسیر میں بالکل قرآنی اسلوب کی
پیروی کی ہے یعنی جہاں قرآن میں کوئی حقیقت مطلق ہے مولانا نے بھی اس کو
اس طرح بیان کیا ہے اور جو حقیقت متعین بیان کی گئی ہے مولانا نے بھی اس کی
رعایت رکھی ہے اس اسلوب سے ان لوگوں کی قسطنی تو ہو جاتی ہے جو قرآن کو
نقبتہ و کلام کی فرقہ بندیوں سے بلند بالا ہو کر پڑھتے ہیں لیکن مین و ماحول پر فہمی
مکاتب خیال کا اس قدر غلبہ ہے کہ وہ ان سے الگ ہو کر کسی بات کو سوچ ہی
نہیں سکتے۔ ان کو یقیناً مولانا کے اسلوب و زاویہ نظر سے اختلاف ہونا چاہیئے۔
۲۔ دوسرا اعتراض یہ تھا کہ مولانا نے تفسیر راہِ مراۃ سے کام لیا ہے جس کی
حدیث میں مذمت آئی ہے لیکن یہ اعتراض بھی صحیح نہیں ہے کیونکہ جہاں تک
مولانا کی تفسیر کے مآخذ کا سوال ہے ان کی نسبت مولانا نے خود لکھ دیا ہے کہ:-
"پہلے اس کی تفسیر صحابہ و تابعین کی روایات میں ڈھونڈو۔

پھر بعد کے مفسروں کی طرف رخ کرو اور دونوں کا مقابلہ کرو
صاف نظر آئے گا کہ صحابہ و سلف کی تفسیر میں معاملہ بالکل واضح
تھا۔ بعد کی دقیقہ بینیوں نے اسے کچھ سے کچھ بنادیا اور اجمالاً لجاؤ
پیدا ہو گئے۔"

اس عبادت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نے جو کچھ لکھا ہے اس کی
اصل صحابہ و سلف کے ہاں ضرور موجود ہے اور محض ایجاد و بدعہ نہیں ہے۔
جہاں تک تفسیر راہِ مراۃ کا تعلق ہے خود مولانا اس کے متعلق لکھتے ہیں:-

”اشکال و مرالح کا بڑا دروازہ تفسیر یا لہرائے سے کھل گیا جس کے اندریشہ سے صحابہ و سلف کی روحیں لرزتی رہتی تھیں“
 ایک تفسیر یا لہرائے سے مولانا کی مراد کیا ہے؟ اس کو بھی مولانا کی زبان سے سن لیں تاکہ مولانا کا نقطہ نظر سمجھنے میں کوئی گنجلک باقی نہ رہے۔ فرماتے ہیں:-
 ”تفسیر یا لہرائے کا مطلب سمجھنے میں لوگوں کو کمزوریاں ہوتی ہیں۔ تفسیر یا لہرائے کی مانند سے مقصد یہ تھا کہ قرآن کے مطالب ہمہ علق و بعیرت سے کام نہ لیا جائے۔ کیونکہ اگر یہ مطلب ہوتا ہے تو قرآن کا درس و مطالعہ ہی بے سود ہو جائے۔ حالانکہ خود قرآن کی کمالیہ ہے کہ اول سے آخر تک تعلق و تفکر کی دعوت ہے اور ہر جگہ مطالبہ کرتا ہے کہ اخلاقیات پر برونی التفوان اعلیٰ علیٰ قلوبنا تعافا لھا دراصل تفسیر یا لہرائے میں رائے لای معنی میں نہیں ہے بلکہ رائے مصلوہ شارع ہے اور اس سے مقصد ایسی تفسیر ہے جو اس لئے دیکھنے کو خود قرآن کیا کہتا ہے بلکہ اس لئے دیکھنے کو ہمارے کوئی مہلکی ہوئی رائے کیا چاہتی ہے اور اس طرح قرآن کو کچھ مان کر اس کے مطابق کر دیا جاسکتا ہے۔“

اس بنا پر مولانا کو متداول اور مردوج تفسیروں سے جو شکایت ہے وہ یہ ہے کہ
 ”جس مقام کی تفسیر میں متعدد اقوال موجود ہوں گے وہاں اکثر ایسی قول کو ترجیح دیں گے جو سب سے زیادہ کمزور اور اسیلے حل ہو گا۔ جو اقوال نقل کر رہے ہیں ان میں بہتر قول موجود ہو گا۔ لیکن اس کو نظر انداز کر دیں گے۔“

مولانا کی سند و بالا عباراتوں سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ ان میں اللہ ستر تفسیر میں جو راہوں کا اختلاف ہے اس کا معنی کیا ہے؟ اس بنا پر اگر بعض حلقوں میں مولانا کی تفسیر پر نکتہ چینی ہوئی تو وہ ہرگز خلاف قرآن اور علیٰ تعجب نہیں ہے۔ ترجمان التفسیر ان قرآن مجید کی تفسیر ہی ہے اور ترجمہ ہی۔ اب تک آپ نے جو کچھ پڑھا وہ تفسیر سے متعلق تھا۔ اب چند باتیں ترجمہ کی نسبت سن لیے۔ یہ ظاہر ہے کہ ایک زبان سے کسی دوسری زبان میں ترجمہ کرنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ جو لوگ اصل زبان سے واقف نہیں ہیں وہ ترجمہ کے ذریعہ اس عبارت کا معنوم و مطلب سمجھ جائیں۔ مگر عام طور پر قرآن کے جو تراجم

امد میں پائے جاتے ہیں ان سے یہ مقصد حاصل نہیں ہوتا۔ کیونکہ یہ تراجم لفظی بلکہ تحت اللفظی ہیں اور ان سے مقصد اخذ کرنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔ اس قسم کے تراجم کے برخلاف مولوی نذیر احمد دہلوی نے ترجمہ قرآن میں دقت کی بولی بھولی کو اس درجہ دخل دیا کہ بعض مقامات پر قرآن کی سہیلگی اور ثقافت پر مدح ہو گئی۔ لیکن مولانا نے نہ وہ راہ اختیار کی اور نہ یہ بلکہ ایک طرف تو قرآن کی عظمت اور اس کی ثقافت کا بھرپور خیال رکھتے ہیں اور ایسا کوئی لفظ نہیں آئے دیتے جو قرآن کے مرتبہ و ثقافت سے فروتر ہو اور دوسری جانب ترجمہ کی ترتیب اس طرح قائم کی ہے کہ وہ اپنی وضاحت میں کسی کا متاع نہیں۔ ایک عالم کی طرح ایک عام اردو خواں بھی اس سے پوری طرح استفادہ کر سکتا ہے۔ پھر مولانا نے صرف ترجمہ پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ جا بجا نوٹوں کا بھی اضافہ ہے۔ جن میں مطالب قرآن کی تفسیر و توضیح کی گئی ہے۔ قرآن میں جو مطلب یا جو حکم مہمل تھا اس کی تفصیل لکھی ہے تاکہ قرآن کا اصل مطلب سمجھنے میں کوئی دشواری نہ ہو اور جہاں جہاں قرآن کے کسی مطلب کو واضح کرنے کے لئے دلائل و شواہد کی ضرورت تھی وہاں دلائل و شواہد لکھے ہیں۔ اس طرح یہ ترجمہ عجائبات خود مستقل افادیت کا حامل ہے۔ اگر کوئی شخص تفسیر کا مطالعہ نہ بھی کرے تو تفسیر ترجمہ اور اس پر جو نوٹس ہیں ان کی مدد سے قرآن کے مطالب کو سمجھ سکتا ہے۔

پھر ترجمہ اور تفسیر اور یہی ہیں بلکہ مولانا کے علم مذہبی مضامین کی ایک نمایاں خصوصیت جس پر شاید عام لوگوں کی نظر نہیں پڑے کہ ان سب میں مولانا کا اسلوب بیان ہی ہے جو قرآن کا ہے۔ یہی حکیمانہ ہونے کے ساتھ ساتھ خطیبانہ بھی ہے۔ اس میں وہ بھی ہے اور وہ عید بھی۔ تبشیر بھی ہے اور انداز بھی۔ کہیں وہ نیم جاں فرما ہے اور کہیں برق صافہ لگتا۔ اس لئے قدقی طور پر اس کا اثر ہوتا ہے اور قاری میں وہی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ مولانا کا یہ طرزِ ادب اسلوبِ بیان ان کے مذہبی مضمون میں نمایاں ہے لیکن جہاں تک خاص ترجمان القرآن کا تعلق ہے تو یہ شراپ و آتش بلکہ ساقی ہو گئی ہے اور اس لئے غالب کا یہ شعر اس پر پوری طرح صادق آتا ہے:-

ذکر اس پری دشمن کا اور پیریاں اپنا
 ہو گیا رقیب آخر جو تھا راز و ادا اپنا

امامِ اہلِ سنت کی یاد میں

کون یہ آخر شب بزمِ سحر سے اٹھا نالہ دردِ دل اہلِ خبر سے اٹھا
 لئے کس وقت بھی شمعِ نہاں غارِ عشق شعلہ غمِ نفسِ یادِ سحر سے اٹھا
 کلن ہے محرمِ اسرارِ مشیت، لیکن اعتبارِ آج دعاؤں کا اثر سے اٹھا
 ہو گئے قافلہ اشکِ رداں میں شامل یارِ اندوہ نہ جیلِ لعل و گہر سے اٹھا
 عظمتِ منبر و محرابِ جمع کی جاتی ہے کون خلوتِ کدہ فکر و نظر سے اٹھا
 تا فلک، سلسلہِ محمدی و الم طاری ہے جس طرف آنکھ اٹھی دردِ ادھر سے اٹھا
 سن لیا جب کہ جدائی ہے یہاں شرطِ وصال حشرِ خودِ اشکِ بدایاں نزدیک سے اٹھا
 علم ہے شاید پناہاں کا حجابِ اکبر نماں یہ پردہ بھی رحمتِ حسنِ نظر سے اٹھا
 مسعودِ شیتے آنکھوں سے لگایا اس کو کوئی ذرہ جو تیری راہِ گز سے اٹھا
 تو نے تمکینِ خودِ ذوقِ جنوں کو بخشی ایک الزامِ کہنِ عشق کے سر سے اٹھا

مرگ سے راز کھلا تیری دل آرائی کا

اک نیا دور ہے یہ تیری مسیحا کا

مولانا آزاد کے فکر و نظر کی چند جھلکیاں

”ہندوستان چھوڑ دو“ والی تحریک سے کچھ دنوں قبل کا واقعہ ہے جب کہ جاپانی فوجیں ہندوستان کا دروازہ کھٹکھٹا رہی تھیں اور یہ اندیشہ ہوتا تھا کہ ان کی یلغار سے ہندوستان شاید ہی محفوظ رہ سکے۔ کانگریس ورکنگ کمیٹی کے اراکان مع صدر کانگریس مولانا ابوالکلام جہل میں تھے۔ ایسے وقت گاندھی جی نے ایک اخباری بیان میں یہ خیال ظاہر کیا کہ اگر جاپانیوں نے ہندوستان پر حملہ کیا تو ان کا مقابلہ بھی کانگریس عدم تشدد کے ساتھ کرے گی۔

اس وقت مولانا آزاد نئی سنٹرل جیل الدہ آباد میں ایک مختصر سے یارڈ میں نئے جس میں صرف چار-کوٹھریاں اور ایک ورانڈا تھا۔ ایک کوٹھری میں مولانا آزاد اور جیہیہ میں ڈاکٹر کاٹھو، کیشو دیو مالویہ اور راقم الحروف رکھے گئے تھے جب گاندھی جی کا مذکورہ بالا مذکورہ اخبارات میں آیا تو مولانا آزاد کا اضطراب قابلِ دید تھا وہ ہم سے بار بار کہتے تھے: ”میرے بھائی! یہ تو کانگریس کی پوزیشن ہے ہی نہیں۔ یہ گاندھی جی نے کیسے کہہ دیا۔“ پھر فرماتے تھے کہ کانگریس نے تو جاپانیوں کے مقابلہ کے لئے عدم تشدد کا کوئی فیصلہ نہیں کیا۔“ مجھ مولانا کے وہ سب فقرے یاد نہیں جو وہ روز بروز زبان پر لاتے تھے۔ مگر مطلب یہ تھا کہ کانگریس کے لئے عدم تشدد کوئی مذہبی عقیدہ نہیں ہے بلکہ صرف ایک پالیسی ہے جو اس نے برہانہ کے اقتدار سے آزاد ہونے کے لئے اختیار کر رکھی ہے یہ ضروری نہیں کہ جاپانیوں نے مقابلہ میں بھی عدم تشدد کا حربہ موثر سمجھا جائے اتفاق سے میری اور مولانا کی کوٹھریوں کے درمیان ایک مستقل دروازہ کھلا تھا جس کے باعث ہر وقت ایک دوسرے کی حالت آنکھوں کے سامنے رہتی تھی۔ جب مولانا وائٹسے میں غم و غصہ کا اظہار کرنے کے بعد اپنی کوٹھری

تحریک خلافت کے دور میں مولانا ابوالکلام آزاد کی رفاقت حاصل ہوئی۔ جیل کی زندگی میں ایک عرصہ تک ان کے ساتھ ہم نوار وہم پیالہ رہنے کا موقع ملا اور بار بار ان سے بحث و گفتگو کا بھی فرض حاصل رہا۔ ان ملاقاتوں اور مذاکروں میں یہ حقیقت مجھ پر ثابت ہو گئی کہ مولانا جیہیہ نے فلسفہ کے قابل تھے۔ ایک مقالہ میں خود انھوں نے یہ الفاظ لکھے: ”درحقیقت یہ ایک قانون حیات بعد المات ہے جو کائنات کی ہر شے پر طاری ہے۔“ وہ اکثر قرآن کی یہ آیت پیش کیا کرتے تھے۔ ”عزیز الحق من الموت“۔ ”عزیز الحق من الموت“ سے نہایت اور نہایت سے توجہ پر کرتا ہے۔ اس غلط فہمی کی روشنی میں یہ کہنا مشکل نہیں ہے کہ مولانا آزاد کی موت دراصل ایک نئی زندگی کا پیش خیمہ ہے۔

ہرگز نیرد آن کو دش زندہ شدہ عشق ثبت است بر جبریدہ عالم و وام ما وہ عمر ما یہ آیت بھی اہتمام کیا کرتے تھے۔ الحمد للہ الذی احیانا بعد امواتنا۔ سبقرین اس اللہ کے لئے ہے جس نے ہمیں زندگی دی لیکن اس کے ہمہ جہت تھے، اس لحاظ سے مولانا کی وفات کے بعد اگر ان کی زندگی کے حالات تحریر و تقریر ہیں اس طرح پیش ہوتے ہیں جو قوم میں نئی روح پیدا کریں تو ان کی وفات کے بعد کسی ہم یہ سمجھ سکتے ہیں کہ وہ زندہ ہیں اور طمعت خلق کا رول ادا کر رہے ہیں۔ ایسے لوگوں کی تعداد کافی ہے جو مولانا ابوالکلام کے حالات بیان کرنے میں فصاحت اور بلاغت کے دریا بہار ہے ہیں اور نفسیاتی انداز میں لطیف نکات پیش کر رہے ہیں لیکن اس مختصر مقالہ میں مجھے چند نکات سادہ الفاظ میں بیان کرنے ہیں تاکہ خواص کے ساتھ عوام بھی ان سے سبق حاصل کر سکیں

میں داخل ہوئے تو میں اپنی کوٹھری سے اُن کے خطاب کا دل چسپ نظارہ کر رہا تھا۔ وہ کوٹھری میں نہایت بے قرار تھے۔ وہ بار بار یہی کہتے کہ گاندھی جی یہ بالکل غلط بات کہہ دی۔ ایک بار اپنی کوٹھری سے مجھے مخاطب کر کے بولے: "گاندھی جی کی بھی عجیب حالت ہے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ وہی ہماری مشکلات باعث ہو جاتے ہیں اور پھر وہی ہماری مشکلات کا حل بھی ہوتے ہیں۔"

اس کے بعد مولانا کی سیاسی زندگی کا ایک اور پہلو نظر آیا۔ انھوں نے کوشش کی کہ ایک تو ریل سے اہلکاروں میں ہر طرف خلافت قانونی طریقوں سے اسکتی تھی۔ اسی زمانہ میں دو کانگریسی کارکن ایک دیکھ اور ایک اسکوٹی ٹیچر نے مل کر سوچا پچھتے تھے کہ انھوں نے جیل میں سیاسی لیڈروں کو خفیہ خط و کتابت کرنے کی کوشش کی تھی اور مشہور یہ تھا کہ یہ لیڈر بھی مولانا آزاد ہی تھے۔ یہ مسئلہ اُس زمانے کا کانگریسی کارکنوں میں مختلف فیہ تھا کہ جیل میں جانے کے بعد جیل کے انوں اور ڈسپن کی پابندی کی جاسکتی تھیں۔ مولانا آزاد اُس گروپ میں تھے جن کے نزدیک خفیہ خط و کتابت کی آمد و رفت اگر وہ انقلاب کے لئے ہوتی بانہ سے۔ چنانچہ جب میں رہا ہونے لگا تو مجھے بھی ایک خط خفیہ طریقہ سے ہرے جانے کا حکم ہوا تھا مگر میرے مولانا کو اور کوئی آسان ذریعہ مل گیا اور میں اس خطرناک خدمت سے محروم رہا۔

ہر کیف جب مولانا اس فکر میں تھے کہ گاندھی جی تک اپنا پیغام پہنچائیں اور اُن کی غلطی پر تائب کریں کہ غریبی کو گاندھی جی الٹا بانڈنشین دے رہے ہیں جہاں ملا میو ریل اسپتال کا افتتاح فرمائیں گے نیز مولانا سے ملاقات کے لئے جیل میں بھی آئیں گے۔

گاندھی جی اور مولانا کی یہ ملاقات جیل میں ہونے والی تھی وہاں میں بھی سے کوئی موجود نہ تھا۔ مگر گاندھی جی نے ملاقات کے بعد فوراً ہی ایک نظریہ اخبارات کو دیا جس میں بتایا کہ پیسے انڈیوی میں جاپانیوں کے مقابلہ میں عدم تشدد کا حربہ استعمال کرنے کا جو خیال میں نے ظاہر کیا تھا وہ میرا ذاتی عقیدہ تھا کانگریس کو دیند نہیں تھا۔ کانگریس ورکنگ کمیٹی کو اپنے فیصلہ اختیار ہے اور وہ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ جب دوسرے روز گاندھی جی یہ بیان میں نے پڑھا تو مولانا سے دریافت کیا کہ کیا آپ نے گاندھی جی سے یہ نیابیان دلایا ہے۔ مولانا نے فرمایا کہ ہاں میں نے اُن کو کہ تو جو ملاقاتی تھی اس واقعہ سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ مڑ جناح کا یہ الزام کتنا غلط

تھا کہ مولانا آزاد کانگریس کے یا ہندوؤں کے "شوہنائے" ہیں۔ ایک طرف تو گاندھی جی کی انصاف پسندی پر روشنی پڑتی ہے۔ دوسری طرف ثابت ہوتا ہے کہ مولانا آزاد کو کانگریس میں خاص اقتدار حاصل تھا اور وہ کانگریس کے منہج اقتدار اور دعایات کے ذریعہ دست محافظ تھے۔

نئی جیل کی زندگی میں مولانا نے چند کچر بھی ہماری درخواست پر دے دی تھیں۔ دوسرے بار دس سے بھی سیاسی قیدی ان میں شریک ہونے کے لئے آجاتے تھے۔ بعض رفیقوں کے مشورہ پر میں نے ان کچروں کی بنیاد پر ایک طویل مقالہ بھی لکھا تھا جس پر خود مولانا نے جگہ جگہ ترمیم و اضافہ کیا تھا۔ ایک جگہ میں نے "اسلامی کچر" کا جملہ استعمال کیا۔ میں اسطرح میں مولانا نے اپنے قلم سے لکھ دیا۔ بشرطیکہ اسلام جیسے عالمگیر مذہب کا کوئی کچر ہو۔ اس پر میں نے جب مولانا سے گفتگو کی تو یہ پایا کہ اُن کی رائے میں اسلام کا کوئی مخصوص کچر نہیں ہے۔ مختلف ممالک کے لوگوں کے مختلف کچر ہوتے ہیں اور مختلف زمانوں میں کچر بدلتے رہتے ہیں مگر ان مختلف ممالک کے لوگوں اور مختلف زمانوں کے لئے اسلام ایک ہی رہتا ہے۔ لہذا اسلام کا کوئی مخصوص کچر نہیں ہو سکتا۔ وہ یہ بھی فرماتے تھے کہ کچر ایسا نعرہ ہے جس کی کوئی تعریف نہیں کی جاسکتی اور مختلف ملکوں میں مختلف مفکرین نے اس کا ہتھیار مختلف مسمیٰ میں کیا ہے۔

نئی جیل میں یہ عجیب بات میں نے پائی کہ مولانا صبح سے شام تک حرف انگریزی کی کتابوں کا مطالعہ کرتے تھے۔ حرف صبح کے چار بجے ترجمان اخبار کا قائل سے کر بیٹھے اور اُس کے بعض مسائل پر غور کرتے تھے۔ اُس کے بعد اُن کے مطالعہ میں داخلہ دوسرا خطے، گوٹے اور متعدد سیاسی لیڈروں کے سوانح حیات پڑھتے تھے۔ بعض کتابیں ایسی بھی تھیں جن سے حرف بی۔ پی۔ ایم۔ نے کی قابلیت والے آدمی فائدہ اٹھا سکتے تھے۔ مجھے شک ہوا کہ مولانا کی انگریزی کی قابلیت اتنی ہے کہ ایسی ادق کتابیں سمجھ سکیں۔ اپنا شک رفع کرنے کے لئے اُن کتابوں میں سے بعض کے مسائل پر میں نے مولانا سے سوالات کئے۔ مولانا نے جو جواب دیئے اُن سے معلوم ہوا کہ حرف اخبار نے وہ کتابیں پڑھی اور سمجھی ہیں بلکہ اُن مسائل سے متعلق دوسری بھی بہت سی انگریزی کتابوں کا مطالعہ کر چکے ہیں۔ فہم مضامین کے اعتبار سے اُن کی قابلیت ایم۔ اے سے زیادہ تھی لیکن انگریزی میں گفتگو بالکل نہیں

کر سکتے تھے۔ ایک بار جیل میں انگریز حاکم (غالبا ڈپٹی مشرقی) بھیجا تھا۔ وہ مولانا سے انگریزی میں بات کرنا تھا تو مولانا سمجھ تو جیتے تھے مگر جواب اردو میں ہی دیتے تھے۔ بعد میں مولانا نے انگریزی بولنے کی بھی کچھ مہارت پیدا کی تھی مگر اس قدر کہ بے تکلف بات چیت کر سکیں میرا خیال ہے کہ مولانا کو انگریز کا بولنے میں صرف اس سے تکلف تھا۔ تحریر و تقریر میں بولندہ معیار ان کے پیش نظر رہتا تھا اسے گفتگو میں قیام نہیں رکھ سکتے تھے۔ اسی سے مولانا نے شاعری ترک کر دی تھی۔ وہ فی المبدأ شعر کہتے تھے۔ بونہایت سچے بھی ہوتے تھے۔ لیکن مولانا کے اعلیٰ معیار پر پورے نہیں اترتے تھے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ جو اعلیٰ معیار انھوں نے قیام کیا تھا اس کے مطابق وہ شعر نہیں کہہ سکتے تھے لیکن ایسے شعر کہنے کے لئے جتنی فرصت و کار تھی وہ انھیں کبھی حاصل نہیں ہوئی۔ جمیوراً انھوں نے شاعری کا شوق ترک کر دیا۔

شعر و شاعری کا ذکر آگیا تو ایک واقعہ اور بھی لکھ دوں، مولانا کی نہیں خوشبو کو آئیں جس کے باعث ان کا مطالعہ بند ہو گیا۔ معمول یہ تھا کہ میں اور وہ صبح چار بجے اٹھتے مولانا اپنے ہاتھ سے چائے تیار کرتے اور پیچھے کے بچہ فرد ہر دس۔ دو دو کوپ چائے پنی کر ہم الگ ہو جاتے اور اپنا اپنا مطالعہ شروع کر دیتے لیکن سبب انھیں ڈکھے۔ مگر تو کسی تو صبح تک انوں میں گڑ جاتی اور کبھی میں اپنی کوٹھری میں چلا آتا اور مولانا تھا کچھ سوچتے یا عموماً شاعر پڑھتے رہتے۔ ایک روز چائے کے بعد جب میں اپنی کوٹھری میں آکر مطالعہ میں مشغول ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ مولانا اپنی کوٹھری میں چہل قدمی کرتے جاتے ہیں، سگریٹ کے دھوئیں چھوڑتے جاتے ہیں اور میری غول کا یہ شعر بکی آواز سے موسے موسے کر گاتے جاتے ہیں۔

عہد جوانی روز رو کاٹا پیری میں نہیں انکھیں موند

یعنی رات بہت تھکے جا گئے صبح ہوئی آرام کیسا

اور پرتا چکا ہوں کہ دونوں کوٹھریوں کی پوزیشن ایسی تھی کہ درمیان میں متعلق درگھلا ہوا تھا اور مولانا کی ایک لنگ کے لئے میں نماشاں تھا۔ مولانا کو زندگی میں میری غول پڑھتے دیکھا تو سوچا شاید مجھے دیکھ کر مولانا آزادی سے اپنے جذبات کا مظاہرہ نہ کر سکیں لہذا میں پٹنگ پریسٹ گیا گویا کہ سودا ہوں۔ مگر قریباً ایک گھنٹہ تک نیم باز آنکھوں سے یہ تماشا دیکھتا رہا کہ مولانا ہر اکڑ غول کے اشتعال پڑھتے تھے اور جب مذکورہ بالا شعر پڑھتے تو غول

اس کی رٹ لگاتے اور وجد میں آ جاتے۔ متعلق کو بھی بار بار دہراتے۔ میرے دین و مذہب کو کیا پوچھو ہو تم ان نے تو قشتہ کیچھا، دیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا مولانا کی آنکھیں کیا دکھے آئیں کہ میرا نصیب جاگ اٹھا کیونکہ صبح کا مطالعہ تو بند ہو گیا تھا مگر چائے کا دور ضرور اپنے وقت پر چلتا تھا اس کے بعد کہ مولانا کی گل افشائیاں صبح تک جاری رہتی تھیں اگرچہ اندو ز باقی میں گل افشانی کا عاودہ کبھی بڑے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے مگر میں اصلی معنی میں استعمال کر رہا ہوں۔ بلا مبالغہ بھول جھرتے تھے۔ کاش کہ اللہ تعالیٰ مجھے وسعت داناں بھی بخشا۔ خیر! جتنا بھی مل گیا اس کے لئے شکر ادا نہیں کر سکتا۔ اگر اس گفتگو نے جھگڑائی کے مختلف پہلو دیکھے ہوں تو سو ڈیڑھ سو صفحات لکھنے کے بعد بھی یہی کہتا رہوں گا۔

۴ کچھ اور چاہیے وسعت مریاں لکھو

جیل کی زندگی میں مولانا کے تبرعے، لطیفے اور پسند و نفاق مخفی کے متعدد موافق ملتے تھے۔ دو وقت کھانے کی میز پر، ایک وقت نشست کے ساتھ، اور ایک بار شام کو پانچ بجے کی چائے پر، علاوہ بریں جب اخبارات پڑھ چکے تھے تو اس، مذکی خروں پر بھی راستے زنی ہوتی تھی۔ پھر شام کو ہم لوگ بیڈ منٹن کھیلتے اور مولانا کتاب لے کر وائڈ سے میں بیٹھتے اور کھلاڑیوں کو داد دیتے۔ کبھی شرط لگے جم جاتی تھی۔ دو ایک شاطر دوسرے یا رڈوں سے بھی آ جاتے تھے۔ مگر عموماً میں ایک طرف ہوتا اور سب مل کر کچھ مات بیٹے کی ناکام کوشش کرتے۔ میرے مقابل پر تو ڈاکڑ کا بٹو یا کرشن کانت مالویہ بیٹھتے تھے مگر چالیں بتاتے ہیں مولانا بھی شریک ہوتے تھے۔ میں سب کو مات دیا کرتا تھا لیکن ایک روز مجھ سے ایسی غلطی چال میں ہو گئی کہ ڈاکڑ کا بٹو نے مات کر دیا۔ بس پھر کیا تھا مولانا نے بساط الٹ دی اور فرمایا کہ میں اب حافظ جی کو مات ہو گیا اب نہیں کھیلتے اور دوسرے یا رڈوں میں بھی شاطروں کو خبر مجھو ادتی کہ حافظ جی کو مات ہو گیا "جیل میں تاش بھی ہوتا تھا مگر مولانا اس میں کمی دی بھی نہیں لیتے تھے۔

مولانا ابو اسکلام آزادی کی اس زندگی کا نقشہ پیش کرتے ہوئے چند اظہار اس بانک کے متعلق لکھ دینا ضروری ہیں جس میں مولانا کو قید کیا گیا تھا اور جہاں حسن اتفاق سے مجھے مولانا کی مات کی معیت نصیب ہوئی تھی یعنی منٹو

جیل الہ آباد کے مقامات میں بہت دیریں جیل ہے۔ اس کے اندرونی وسیع رقبہ کے ایک گوشہ میں چار کوٹھریوں کے گرد احاطہ کی دیوار بنا کر وہ بانک بنائی ہے جس میں مولانا آزاد کو رکھا گیا تھا۔ اسے جیل کے قیدی سمجھا جاتا ہے۔ یہاں اس سے کہہ سکتے ہیں کہ اس میں ان قیدیوں کو رکھا جاتا تھا جن کو پھانسی کا پروگرام تھا۔ ان کوٹھریوں میں بہت کم جگہ ہے۔ ان پر مار پڑتی تھی تو یہ کتنا بھی پیچھے اور چھلے کتوں کی طرح چلاتے مگر دوسری بانکوں تک آزاد پہنچتے تھے اس لئے بانک کا نام سمجھا جاتا تھا۔ جب پنڈت بھاپر لال نہرو کے والد پنڈت موٹی لال نہرو کو گرفتار کیا گیا تو یہ ہی چار کوٹھریاں رہنے کو دی گئیں تاکہ وہ عام قیدیوں سے بالکل الگ رہ سکیں اور ان پر سیاسی اثرات نہ پڑنے پائیں۔ پنڈت لال نہرو کے علاوہ انگریزی حکومت نے ایک درانڈا اور بنوادیا۔ میں جب پہنچا ہوں تو اس میں میں سیاسی قیدی تھے۔ ایک مسٹر کیشو دیو ماویہ اور دوسرے بالکراشن شریا "نورین" اور تیسرے مسٹر ایچ ایل ایم تینوں اتر پردیش کے مشہور سیاسی لیڈر تھے۔ میں اگرچہ بیٹی کا تھا مگر الہ آباد میں ایک تقریر کی تھی جس کے جرم میں وارنٹ بھیج کر حکومت نے بیٹی سے گرفتار کر لیا تھا۔ اس کے بعد کوئی نہ کوئی رہا ہوتا گیا اور ڈاکٹر کاٹھو، آر۔ ایس پنڈت (دوبہ کشی کے سرگرم شہر) مولانا آزاد اور ڈاکٹر حسین ظہیر باری باری آتے گئے۔ مولانا کو پہلے تو ایک ہی کوٹھری ملی تھی لیکن بعد میں ہم لوگوں نے مولانا کی تکلیف کا خیال رکھ کر ان کو دو کوٹھریاں دے دیں اور دو آدمی ایک میں ہو گئے۔ مولانا ایک کوٹھری بھروسہ خانہ استعمال کرنے گئے۔ ان کوٹھریوں کے رقبہ کا اندازہ یوں کیجئے کہ جس کوٹھی میں مولانا کا انتقال ہوا اس کے قوائیگ روم میں نیلی جیل والی چھ کوٹھریاں بن سکتی تھیں۔ اسی احاطہ کے اندر بیڈمنٹن کا کورٹ تھا ہم سب اسے کلاس قیدی تھے اس لئے جو کھانا جیل سے ملتا تھا اس میں اپنے خرچ پر اضافہ بھی کر سکتے تھے۔ کبھی کبھی پنڈت نہرو کے گھر سے غالباً دو بجے کچی پنڈت کی طرف سے کوئی کھانے کی چیز آجاتی تھی۔ مگر زیادہ تر وہیں کھانا تیار ہوتا تھا۔ احمد نگر کی ایری کے دوران نیز اپنی کوٹھی پر مولانا معمولی چائے کی بجائے یاسمین سے شوق کرتے تھے مگر نینی سنڈل جیل میں پٹن یا برکٹ ٹاڈ ہی استعمال ہوتی تھی۔ کبھی اتفاق سے صبح چار بجے کی چائے کے وقت اگر ت کا عدد خراب ہو گیا یا پانی پی گئی تو پھر مولانا بغیر دودھ کی چائے کا سیرٹ نکالتے تھے۔

بیمٹی میں آفا ستر کشمیری مشہور ڈراما گسٹ سے مولانا کے ساتھ تھے محمد اور حالات کے مولانا آزاد کے اشعار بھی سنے تھے۔ ان میں سے دو ایک شعر مجھے یاد تھے۔ نینی جیل میں میں نے مولانا سے دریافت کیا کہ آیا یہ اشعار ان کے ہی ہیں اور آفا ستر کی سند پیش کی۔ مولانا یہ کہتے ہوئے اپنی کوٹھری میں چلے گئے کہ "ہمد جاہلیتہ کی باتوں سے کیا فائدہ؟" ان میں سے دوسرے یہ ہیں۔

وعدہ دل بھی اک طرف تماشا کی ہے بات میں تو بھولوں نہ کبھی ان کو کبھی یاد نہ ہو آزاد بے خودی کے نشیب فراز دیکھ پڑھی زمین کی تو کبھی آسمان کی مولانا کبھی کبھی بیمٹی میں رہے ہیں مگر ان کی سرگرمیاں زیادہ تر کلکتہ ہی میں محدود رہیں۔ بیمٹی میں پرل روڈ پر ان کے والد کے نام سے ابھی تک مسجد خیر الدین موجود ہے۔ ایک بار تحریک خلافت کے زمانہ میں منبر پر کھڑے ہو کر میں نے سیاسی تقریر کی تو مجھے سیٹھ عبدالرحمن فیت والا مرحوم نے بتایا کہ اسی منبر پر مولانا آزاد کے والد اپنا خطبہ اس منبر سے شروع کیا کرتے تھے۔

۴۔ سب کا خدا خدا ہے میرا خدا محمد

اس منبر میں مذہبی عقائد کا جو تصور ہے اس کے خلاف مولانا آزاد نے جس طرح بغاوت کی اس کا نقشہ مولانا طبع آبادی کی کتاب آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی "میں نہایت دل چاہی پیش کیا گیا ہے۔ یہاں صرف اتنا اشارہ کافی ہے کہ باپ اور بیٹے کے عقائد میں یہ بعد از مشرقین بہت ہی دلچسپ ہے۔ لیکن اس سے یہ مطلب نہ سمجھنا چاہیے کہ مولانا آزاد بالکل دہائی ہو گئے تھے۔ ان کی دین الہیاتی کا تجربہ کئی اہم موافق پر ہوا۔ مسطور میں جب میں روزانہ خلافت کا ایڈیٹر تھا تو میں نے اس میں تصاویر کی اشاعت شروع کی۔ اس پر مولویوں نے بہت مخالفت کی کیونکہ ان کے نزدیک فوٹو کی اشاعت حرام تھی۔ مولانا یہ سلسلہ "الہلال" میں شروع کر چکے تھے میں نے ان سے اخلاقی امداد طلب کی۔ مولانا نے کوئی اعلان تو نہیں دیا۔ مگر پرائیویٹ طریقہ سے بعض سرکردہ خانیقین کو کھانا دیا اور مجھے چند ایسے مشورے دیے جو تیر بہدت ثابت ہوئے۔ مثلاً یہ کہ پیچھے ظالم سمرا، افسانہ مذہب ترک کے فوٹو شائع کرو جب لوگ عادی ہو جائیں تو آجے قدم بڑھانا۔ اس طرح روزنامہ "خلافت" میں فوٹو چھپنے کا رواج ہو گیا۔

دور واقعہ ان کی وسعت نظری کا یہ ہے کہ جب کمال اتاترک نے خلیفہ کو جلا وطن کر کے جمہوریت قائم کی تو مولانا نے اس خیال کی تائید کی کہ ایک جمہوری کونسل بھی خلیفہ کی قائم مقام ہو سکتی ہے۔ خلیفہ کی جلاوطنی پر ان کے اور علی برادران کے درمیان نہایت ناخوشگوار مناقشہ بھی ہوا مگر مولانا نے ایک سلسلہ مضامین میں کمال اتاترک کے طریق کار کی حمایت کی۔ مسلمانوں میں جس قسم کا پردہ رائج ہے مولانا اسے غلط سمجھتے تھے۔ جیل میں اس مسئلہ پر کافی گفتگو ہو چکی تھی لیکن جیل سے باہر بھی ایک بار جب میرے دوست خلیل شرف، نہرین مع اپنی ہمیشہ کے مولانا کی ملاقات کو گئے تو ان کی ہمیشہ کارفرما چہرہ اور ہاتھ دکھائے۔ مولانا نے فرمایا اسلام کا مانتا اسی قسم کا پردہ ہے۔

مولانا کا تعلق اسلام کے کسی فرقہ سے نہیں تھا۔ وہ اجتہاد کا درجہ رکھتے تھے اور ہر مسئلہ پر اسلام کی تعلیمات کی روح و منشاء کی روشنی میں نظر ڈالتے تھے۔ حال میں کتاب "آناد کی کہانی" کے صفحہ پہلے، شیر ذوق کو یہ غلط فہمی ہو رہی ہے کہ مولانا ان کے خلاف تھے لیکن جیل میں ایک واقعہ پیش آیا جو اس غلط فہمی کو دور کر سکتا ہے۔ جب ہم جیل میں تھے تو کھٹنوں میں مدح صحابہ کا فقیر چل رہا تھا۔ میرے اخبار روزنامہ "ہلال" میں ایک مقالہ مدح صحابہ کی تائید میں شائع ہوا تھا۔ یہ پڑھ کر جب جیل میں آیا تو ڈاکٹر کاٹھونے اس مقالہ میں دل چسپی لی کیونکہ جب وہ یو۔ پی میں وزیر قانون تھے تو انھوں نے مدح صحابہ کے حق میں رائے دی تھی۔ ڈاکٹر کاٹھو کو یہ موقع اُس وقت ملا تھا جب کانگریس نے صوبائی خود مختاری کے دور میں ونا دتیں بنانی تھیں۔ مولانا آزاد مدح صحابہ کی تحریک کے خلاف تھے۔ اور اس بارے میں جمعیت علماء اور مجلس اوار دونوں سے ان کو اختلاف تھا۔ ڈاکٹر کاٹھونے روزنامہ "ہلال" کا وہ پڑھ کر مولانا کو دکھایا۔ مولانا مجھ پر خفا ہوئے کہ تمہارے اخبار میں ایسے مقالات کیوں چھپتے ہیں۔ ڈاکٹر حسین ظہیر بھی اس وقت جیل میں تھے۔ میں نے یہ کہہ کر معذرت کر لی کہ میں تو میٹھی سے اتنی دور آپ کے پاس ہوں مجھ پر "ہول" کے مقالات کی کوئی ذمہ داری نہیں ہو سکتی۔ بہر کیف مولانا نے مجھ سے ایک خط لکھا دیا جس میں ادارہ "ہلال" کو ایسے مقالات شائع کرنے کی ممانعت کر دی گئی تھی۔

اس واقعہ سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ مولانا کے سامنے کسی وقت بھی

کسی خاص فرقہ کی مخالفت یا موافقت کا سوال نہیں تھا۔ وہ ہر معاملہ پر اُس کے حسن و قبح کے لحاظ سے نظر ڈالتے اور ایک نتیجہ پر پہنچ کر بلا خوف و ہراس اُس پر قائم رہتے تھے۔

میرے نزدیک مولانا آزاد کی جمہوریت کا لگ بھگ سے پہلے کا سب سے اہم واقعہ مظاہرہ میں پیش آیا جب کہ وہ یونیورسٹی فوڈنیشن کمیٹی کے جلسہ منعقدہ کھٹنوں میں مولانا محمد علی کے خلاف کھڑے ہو گئے۔ ذاتی قربات کی بنا پر کہتا ہوں کہ اس اختلاف کے نتائج کا اثر مولانا کی تمام زندگی پر پڑا۔ اہلکار ہیں اس اختلاف پر مولانا نے نہایت رنگین سلسلہ مضامین "حدیث انصاریہ" کے عنوان سے لکھا۔ جو اب میں علی برادران نے مولانا کے مقابلہ میں مجاذہ قائم کیا۔ بد قسمتی سے چار برس روزنامہ "خلافت" کا ایڈیٹر رہنے کے باعث میرا دامن مولانا شکوت علی صاحب کے ساتھ وابستہ ہو گیا تھا۔ عقائد مولانا آزاد سے ملتے تھے مگر زندگی مخالف کی کمپ میں گذرتی تھی۔ میں نے یہ پایا کہ گو مولانا آزاد نے محض قابلیت کے زور سے چند دستاویز کے سیاسی حلقوں میں اپنا ایک بلند مقام بنالیا مگر بڑی حد تک ان کو عام پلیٹ فارم چھوڑ دینا پڑا۔ بہت لوگوں کو یہ شکایت رہی کہ ہندوستان کے اعلیٰ ترین خطیب ہوتے ہوئے بھی مولانا بہت کم عوامی پلیٹ فارم پر آکر تقریر کرتے ہیں۔ لیکن اصلی سبب یہ تھا کہ پلیٹ فارم پر علی برادران کا قبضہ تھا جو مولانا کو پلیٹ فارم سے الگ رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔

مولانا نے بھی اس کا احساس کیا اور اسی احساس کا نتیجہ تھا کہ مولانا نے پنجاب پارٹی، بنائی۔ دراصل مجلس اوار کی تنظیم میں بھی مولانا آزاد کا اشارہ شامل تھا مگر مجلس اوار بہت جلد ایسی راہوں پر پڑ گئی جو مولانا کو پسند نہیں تھیں۔ نئی جیل میں پنجاب کے بعض لیڈر مولانا سے ملنے آئے اور اس سبیل انٹرویو کے بعد انھوں نے مجلس اوار سے علیحدگی کا اعلان کیا مثلاً جناب داؤد غزنوی صاحب نے ہمیشہ کے لئے مجلس اوار کو فنی جیل کی انٹرویو کے بعد ہی چھوڑا ہے۔ پلان یہ تھا کہ مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری، محمد داؤد غزنوی، مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی اور دیگر بعض اکابر اجتماعی طور سے مجلس اوار سے الگ ہو کر صرف کانگریس میں شریک رہیں مگر پلان پوری طرح کامیاب نہیں ہوا۔

بہر کیف علی برادران اور ان کے ساتھی علانیہ الزام لگاتے تھے کہ مولانا

آنادنے پنجابی ٹولی کو ہم سے بھڑا دیا ہے۔ مولانا عبدالقادر قصودی مرحوم اس پنجابی ٹولی کے لیڈر قرار دیئے جاتے تھے۔

علی برادران اور مولانا آزاد کی کشمکش کا اثر یہ ہوا کہ مولانا آزاد کی اُن تقریروں سے دنیا عروم ہو گئی جو ’اہلِ دل‘ والی آنسو میں ہوتی تھیں اور جنہوں نے اُن کو ’ابوالکلام‘ بنایا تھا۔ کانگریس کے مشترکہ پلیٹ فارم پر انہوں نے سادہ آندہ بلکہ ہندوستانی ہیں انہما و خیالات شروع کر دیا جس میں منظر و رہنما تھا مگر وہ جاؤ کہیں جو سامعین کو دیوانہ بنا دیتا تھا۔

مولانا کی زندگی اور اُن کی تحریروں پر ایک نظر ڈالنے سے مجھ پر یہ حقدہ بھی گھلا کہ کانگریس میں شامل ہونے سے تقریباً دس برس پہلے سے وہ کانگریس کے رجحانات کو پسند کرتے تھے۔ مثلاً ۱۹۰۶ء زوری سلاسل کے ’اہلِ دل‘ میں مسلمانوں کی نئی بیداری پر بحث کرتے ہوئے لکھا تھا۔
’مسلمانوں میں نئی حرکت کی تاریخ تقسیم بنگال کی منوفی سے شروع ہوتی ہے۔ اس سے پہلے صرف خال خال اشخاص تھے جن کو کانگریسی، باغی، بے وفائے قوم، امّہ اور امی طرح بعض بغیر اصطلاحات خاص سے یاد کیا جاتا تھا۔‘

اس اقتباس میں غور کیجئے کہ کانگریسی، کا استعمال کس پیرایہ میں کیا گیا ہے۔ یہ سلاسل کی تویہ ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کانگریس میں شرکت سے بہت پہلے اُن کے رجحانات کانگریسی تھے۔

جیل میں مذہبی مسائل پر مولانا سے اکثر گفتگو ہو جاتی تھی مگر یہاں اُس کا تذکرہ مناسب نہیں ہوگا۔ لیکن ایک ادبی مسئلہ کی طرف اشارہ کر دیتا دل چاہی سے خالی نہ ہوگا۔ گزشتہ عید کو جب میں ملاقات کے سلسلے گاتو موقع پا کر ایک سوال کر بیٹھا جس کا جواب تو انہوں نے دیا مگر ادھورائیوں کے دوسرے لوگ آ گئے۔ سوال اس بار سے میں تھا کہ جناب غلام رسولی جرنے جو کتاب غالب پر لکھی ہے اُس میں غالب کے گھر کو قارخانہ اور غالب

کا جوازیوں سے ناں وصول کرنا ثابت کرنے کے سلسلے مولانا آزاد کی سند پیش کی ہے۔ اور مولانا آزاد نے نواب لہاروی کی شہادت پر بھروسہ کر کے غلام رسولی مسدود کو اس بار سے میں تحریر دی ہے۔ میں نے مولانا سے عرض کیا کہ نواب لہاروی کی شہادت قابلِ اعتبار نہیں بلکہ

Tainted (مردوح) ہے کیونکہ غالب کی گرفتاری کے بعد خاندان لہارو نے ایک مبینہ جوازی کے ساتھ اپنے ہر تعلق سے بے ناری کا اعلان کر دیا تھا۔ حالات کہ خاندان لہارو سے غالب کے تعلقات کا سب کو علم ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ اس اعلان بیزاری کو خفیہ بنایا ثابت کرنے کے لئے اُس خاندان کے ایک فرد نے مولانا کے سامنے غالب کے متعلق ایسا بیان دیا ہو۔

مولانا نے جواب کا آواز اس طرح کیا تھا کہ غالب کا خرچ بہت تھا اور آمدنی کم تھی اس سلسلے انہوں نے اپنے گھر شہر کے جوازیوں کو جمع کرنا شروع کر دیا تھا تاکہ آمدنی کا سلسلہ قائم رہے۔ ایسے حالات میں خاندان لہارو کے ایک فرد دار آدمی کی شہادت کافی ہے۔ خصوصاً صاحب کہ مجھے معلوم ہے کہ وہ مجھ سے جھوٹ دیویں گے۔ ابھی مولانا نکھائی رہے تھے کہ چند آدمی آ گئے۔ اور تھوڑے اظہار کے بعد مجھے رخصت ہو جانا پڑا۔ مگر مولانا کے جواب سے مجھے ذرا بھی تشویش نہ ہوئی۔

میں نے مولانا کے سامنے ایک اور وقت مرزا ابوالفضل کی غیر مطبوعہ تصانیف کے مسودوں کے بارے میں بھی چند گزارشات پیش کی تھیں اور مولانا نے فروری گادی وائی کرنے کا وعدہ بھی فرمایا تھا۔ میں نے انہیں کے متعلقہ حضرات مثلاً عبداللہ حکیم صاحب (ماکاشنرف لاریں لکھتی وادار) کو یہ سوختی بھی پہنچادی تھی۔ مگر یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ اس اہم کام میں مولانا نے کیا اقدام لکھے مولانا کی زندگی کے سب واقعات جو میرے تجربہ میں آئے ایک متاثر میں نہیں ساسکتے اس سلسلے یہاں بس کرتا ہوں۔

تو میندار کہ اس وقت خود می گویم گوش نزدیک ہم کہ آقا زہست

خضر حیات

لڑا ہے آج خاکِ وطن پر وہ کوہِ غم
پرست کا دل اس ہے گنگا کی آنکھ نم
یکجا ہیں سرگورِ غم خازنِ حرم
غم سے جبین پریم ہندوستان ہے غم
مشرق کی موج تو کا آجا اچھلا گیا
فرزندِ ارجسند بہالا چھلا گیا
وہ اٹھ گیا، وطن کو بلا جس پہ رنگ
جس نے حیاتِ عمر کو بخش نئی، رنگ
دل جس کا کوہِ ہند تھیں، خوں میں کاموچ گنگ
دانش نے جس کی توڑے جادوئے فرنگ
خضر حیات در بہر بیدار چل دیا
ہندوستان کا قافلہ سالار چل دیا

جس نے جنوں کو عام کیا وہ ابوالکلام
جس نے حسد کا کام کیا وہ ابوالکلام
منوب کو جس نے رام کیا وہ ابوالکلام
مشرق کا جس نے نام کیا وہ ابوالکلام
ہرنا امیسد دل کو جو امیسد دے گیا
شامِ وطن کے اٹھتے ہیں غور شیدھے گیا
دانش میں طاق، من میں لگا رہتی جس کی ذات
اک دوزخ گاہ تو کا ترازو تھی جس کی ذات
جہاں فریں جنوں کا دند تھی جس کی ذات
دنیا تھی جس کی ذات، زمانہ تھی جس کی ذات
سہے تاب ایک دل میں جہاں کی حیات تھی
ذاتِ ابوالکلام تھی یا کائنات تھی

پُرساں حال، شامِ غرباں کے واسطے
 افسانہ گو، جہاں جیبوں کے واسطے
 افسوں مسماں، بزمِ غیلاں کے واسطے
 سالار، کاروانِ ادیبوں کے واسطے
 یکتا علوم و فن میں، یگانہ ثبات میں
 شہدِ جہادِ زیست میں، شہنمِ صفات میں
 دانش میں اس کی جذب تھا فوراً بہرِ منیر
 ظلمت میں پھیلتا تھا، نخلِ کرن کے تیر
 حسنِ سخن گلال تھا، رنگِ سخن عبیر
 پیشے سے کوہکن کے ابھی تھی جوئے شیر
 فن کے نئے، نفوسِ جو، ایسا دگر گیا
 وہ بیستونِ فکر کا سرِ بادِ مر گیا
 مسدِ نشیں، مہرِ باطلِ شکار بھی
 دنیا کے انقلاب کا پروردگار بھی
 قرآن کا منسبِ حکمت شہر بھی
 نقاد بھی، معتقد جاو و نگار بھی
 اتنے تضاد اور اک، انسان کی ذات میں
 ملتے ہیں ایسے لوگ کہاں کائنات میں
 دل میں عمل کا جذبہ محکم ہے ہوئے
 آنکھوں میں دروغِ حق کی شہنم ہے ہوئے
 ہمسرا، انقلاب کا عالم ہے ہوئے
 ہاتھوں میں البتلاں کا پرچم ہے ہوئے
 جس رخ گیا، حیات کو بیدار کر دیا
 ظلمت کے رے کو مطلعِ انوار کر دیا

آج کل کی دوا کلامِ ہند

ذوقِ نگر، لطافتِ محسوس سے دوچند تھا
 ہجوِ نیاں و شہد، سخنِ شیر و قدر تھا
 رُتبے میں ہر دوا سے بھی کچھ بلند تھا
 لیکن عجیب مردِ حقیقت پسند تھا
 دیت نہ تھا محسوس کو بڑائی یقین پر
 تاروں پر مٹی لگا، قدم تھے زمین پر
 اس کی نوا میں غصہ خنداں کی لعل
 شامِ نش و مرجعِ بہاراں کی لعل
 معینِ چین کی جوئے خزاں کی لعل
 روحِ جنوں کے شہرِ جنباں کی لعل
 وہ لعلی کہ بانگِ دراجس کا نام تھا
 جس کی پیش سے قافلہ بہت خرام تھا
 آواز کی مٹی گونجی کہ ہاں کی مٹی گرجی
 ہر سانس اک جہاد مٹی ہر گام ایک رنج
 کیا زندگی کی شان تھی، کیا بائیں کی دھج
 رہتی تھی منہ کی جبین پر کلاہ رنج
 مردِ فطیر، شوکتِ شاناز سے گیا
 مصر میں قینارِ نیک تھا دیوانہ لے گیا
 بے شبیہ و چراغ مٹی کو زندگی کی رنج
 بیچنے میں نہ و نشان مٹی مگر مثلِ حیات
 فکر و نظر کے نور سے روشن تھے شمشیرِ حیات
 چاتا تھا ساتھ ساتھ جہاں تہنیت
 نقشِ قدم تھے ہمسرا کا پر توئے ہوئے
 اک صبح کا مزن مٹی نئی منوئے ہوئے

آج کل کی دوا کلامِ ہند

وہ جہدِ طوق ودار وہ ہنگامِ قید و بند
 وہ حریت کا شور وہ دندان کا زہر خند
 وہ ہر فضا پہ دام وہ ہر ذیت پر کند
 لیکن مقام دار سے گزرا وہ سر بلند
 بہت جو آس کی ہمدم و دمساز ہو گئی
 اک سر غیبیہ قوم سرا آفسرا نہ ہو گئی
 گیا ذہرِ اضطراب تھا کیا گردشِ دام
 دنوں میں اک قدم تو بیا با رہی ایک گام
 پہن حصولِ ہوش و خسر میں ہوا نام
 گزری جنوں میں جہدِ جرات کی موج و شام
 فصلِ شباب تیشہ زنی میں گذر گئی
 پیری تمام کوہ مٹی میں گذر گئی
 ہر راستے میں سنگ ہر اک پہ گزریں خار
 اپنوں کا وہ سوک کہ دشمن ہوشیار
 ملت کے اس عناد کے ہاوصفِ زہنبار
 خاطر کے آئینے پہ نہ پایا گسیا خبار
 مٹی کون سی وہ بات جو وجہِ مہن نہ مٹی
 لیکن جبینِ ہضم پہ کوئی شکن نہ مٹی
 ملت کے طعن و طنز سے دم بھر نہ تھا فرار
 ہر لمحہ ایک نہ قسم تو ہر لحظہ ایک دُعا
 پھر بھی زولِ تھا نہ فسرہ ہوا دُعا
 موج ہوائے تند سے لڑتا رہا چراغ
 آندھی کبھی کبھی جو بلا خیز ہو گئی
 کچھ اور بھی سپراخ کی تو تیز ہو گئی

آج کل دہلی (ادبِ انکلام)

تازہ نہیں یہ شیوہ ایسا رُوزگار
 اکڑ کب گیا ہے زمانے میں گل کو خار
 غم ہو گئی ہے سنو میں ہادی کی ہر لپکار
 حق کو کو دی گئی ہے سترائے صلیب دار
 "گفتارِ صدق مائے آزار می شود
 چوں حرفِ حق بلند شود وادی شود"
 "منصورِ حوصلوں کو مگر کیا ہراس دار
 ہوتے ہیں شاد و کھیر کے میدانِ کارزار
 دائم کفن بدوش رہا مردِ جاں نثار
 مقتل میں جب گیا تو غزلِ خوان و لہزار
 ہر دم یہ دھن کہ داشت کوئی پُر خطر طے
 کم ایسے روزگار میں شود بیدہ سرے
 بہت قوی دماغ لانا، نظر بلند
 منزلِ حسینِ اعظم حواں رہ گزریں بلند
 یوں کر گسیا وطن کو بشارتِ دگر بلند
 ہندو ہے مفسرِ از مسلمان ہے سر بلند
 تھے رستم اب جہان میں نے سام رہ گیا
 مردوں کا آسمان کے تلے نام رہ گیا"
 منزل سے آہ چھوٹ گیا ایسا دلہیر
 جس کی حیات آگ مٹی جس کا ہو شہر
 جس کے نقوشِ پاسے چراغاں مٹی رہ گزریں
 غمگیں ہیں جس کے سدھرِ بحرِ آتش و دشت و
 معینِ نقصانے ہند ہے اور گریہ دیا س ہے
 "مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگلِ آداس ہے"

ہر سان حال، شامِ غریباں کے واسطے
 افسانہ گو، جہاں جیبوں کے واسطے
 افسوں طساز، بزمِ خطباں کے واسطے
 سالار، کاروانِ ادیبان کے واسطے
 یکتا علوم و فن میں، ایگازِ ثنات میں
 شہدِ جہادِ زیست میں، شبنمِ مغفلات میں
 دانش میں اس کی جذب تھا فوراً بہ منیر
 خدمت میں پھینکتا تھا، تخیل کرن کے تیر
 حسنِ سخن گلال تھا، رنگِ سخن عیب
 تیش سے کہن کے اُبتی تھی جوئے شیر
 فن کے نئے، نفوش جو ایسا دگر گیا
 وہ بیستونِ فکر کا سرِ بادِ مرگیا
 مسد نشیں، جو ہر باطل شکار بھی
 دنیا سے، انقلاب کا پروردگار بھی
 قرآن کا منسبِ حکمت شاعر بھی
 نقاد بھی، مقتصد جاو و زور بھی
 اتنے تضاد اور اک، انساں کی ذات میں
 ملتے ہیں ایسے لوگ کہاں کائنات میں
 دل میں عمل کا جذبہ محکم لئے ہوئے
 آنکھوں میں دروغِ شق کی شبنم لئے ہوئے
 ہمسواہ، انقلاب کا عالم لئے ہوئے
 ہاتھوں میں المہلال کا پرچم لئے ہوئے
 جس رخ گیا، حیات کو بیدار کر دیا
 خدمتِ کد سے کو مطلبِ انوار کر دیا

ذوقِ نگر، لطافتِ محل سے دو چہند تھا
 ہجرِ نبات و شہد، سخنِ شیر و قہر تھا
 رستے میں ہر و ماہ سے بھی کچھ بند تھا
 لیکن عجیب مردِ حقیقت پسند تھا
 دیتا نہ تھا گھس کہ بڑائی یقین پر
 تاروں پر مٹی نگاہِ قدم تھے زین پر
 اس کی نوا میں غنچہ خنداں کی لعلی
 شامِ نشاۃ و صبحِ بہار کی لعلی
 معنِ چین کی جوئے خزاں کی لعلی
 روجِ جنوں کے شہپرِ جنباں کی لعلی
 وہ لعلی کہ بانگِ دراجس کا نام تھا
 جس کی تپش سے قافلہِ بتِ حرام تھا
 آواز کی مٹی گونج کہ بادل کی مٹی گرے
 ہر سانس اک جہاد مٹی ہر کام ایک رے
 کیا زندگی کی شان مٹی، کیا باکپن کی دھج
 رہتی تھی منہ کی جبین پر کلاہ کی
 مردِ فیتور، شوکتِ شاناز لے گیا
 مصر میں جتنا رنگ تھا دیوانہ لے گیا
 بے شبیہ و چراغ مٹی کو زندگی کی ریت
 پیٹنے میں خود شاں مٹی مگر مثلِ حیات
 فکر و نظر کے نور سے روشن تھے شش بہت
 چاتا تھا ساتھ ساتھ جہاں تجلیات
 نقشِ قدم تھے ہمسرا کا پر توئے ہوئے
 اک صبح کا مزن مٹی نئی فنوئے ہوئے

وہ جہدِ طوق و مدار وہ ہنگامِ قید و بند
 وہ حریت کا شور وہ دُعا کا زہر خند
 وہ ہر فنا پہ دام وہ ہر نیست پر کند
 لیکن مقامِ وار سے گزرا وہ سر بلند
 ہمت جو اس کی ہمد و مساز ہو گئی
 اک سر غیبیہ قوم سرا فراد ہو گئی
 کیا دورِ اضطراب تھا کیا گردِ بقیہ دام
 دُعا میں اک قدمِ قرباں ہیں ایگام
 پہنچنِ حصولِ ہوش و خبر میں ہوا تما
 گزری جنوں میں جہدِ جوانی کی موج و شام
 فصلِ شباب تیشہ زنی میں گذر گئی
 پیری تمام کوہِ مٹی میں گذر گئی
 ہر راستے میں سنگِ ہراک رہ گزریں غار
 اپنوں کا وہ سوک کہ دشمنِ ہوش و سار
 ملت کے اس حناد کے ہا و صفِ زینبار
 خاطر کے آئینے پہ نہ پایا گیا خیاب
 مٹی کون سی وہ بات جو دجہبہ مٹی نہ مٹی
 لیکن جبینِ عزم پہ کوئی شکن نہ مٹی
 ملت کے طعن و طنز سے دم چھڑ نہ تھا دلغ
 ہر لمحہ ایک زخمِ تہہ ہر لفظ ایک دلغ
 پھر بھی نہ دل تھا نہ فسردہ ہوا دلغ
 موج ہوا سے تند سے لڑتا رہا چراغ
 اندھی کبھی کبھی جو بلا خیز ہو گئی
 کچھ اور بھی سپراغ کی کو تیز ہو گئی

آج کل دہلی (ادب و کلام ج ۱)

تانہ نہیں یہ شیوہ اپنا سٹے روزگار
 اکثر کہ گیا ہے زمانے میں مٹی کو خار
 غم ہو گئی ہے شور میں ہادی کی ہر لپک
 حق کو کو دی گئی ہے سترائے صلیب و دار
 "گفتارِ صدق مایہ آزاد می شود
 چوں حرفِ حق بلند شود وادی شود"
 "منصور جو صلوں کو مگر کیا ہر اس واد
 ہوتے ہیں شاد دیکھ کے میدانِ کارزار
 دائم کفن بدوش رہا مردِ جاں نثار
 مقل میں جب گیا تو غزل خوان و لہزار
 ہر دم یہ دُھن کہ دشت کوئی پر خطِ سطرے
 کم ایسے روزگار میں شوریدہ سرے
 ہمت قوی دماغ لانا، نظر بلند
 منزلِ حینِ اعز و جاں رہ گزریں بلند
 یوں گر گیا وطن کو بشارِ دگر بلند
 ہند ہے سرِ سر از مٹاں ہے سر بلند
 تنے رستم اب جہان میں نے سام رہ گیا
 مردوں کا آسمان کے تلے نام رہ گیا"
 منزل سے آہ چھوٹ گیا ایسا دلہر
 جس کی حیات آگ تھی جس کا ہوش نر
 جس کے نقوشِ پاسے چراغاں مٹی رہ گزریں
 غمگین ہیں جس کے صدر پر ہر آن دشت و
 معینِ فضا ہے ہند ہے اور گردِ یاس ہے
 "مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگلِ اداس ہے"

امام الہند مولانا آزادؒ — سفر اور مقصد سفر

”مسئلہ میں جب کہ میری موجودہ پبلک زندگی کا بالکل ابتدائی عہد تھا، مجھے موقع ملا کہ اپنی آئندہ زندگی کے علاوہ ایک مذہبِ عمل ”قائد“ سے لوں خدمتِ ملک و ملت و دشتِ ناپید کنر کی طرف قدم اٹھاتے ہوئے، اصولی عمل کی مختلف راہیں میرے سامنے تھیں اور میں چاہتا تھا کہ میرا سفر اس دانش مند مسافر کی طرح ہو جس نے سفر سے پہلے ماہ و منزل کے سلسلے میں حلوں پر غور کر لیا ہے۔ اس طوفانی فتنے کی طرح نہ ہو جس نے ہوا کے جھونکوں اور سمندر کی موجوں پر اپنے سفر کا رخ اور کنارے کی جستجو چھوڑ دی ہے۔“

دشمنِ خلافت اور جہنمیت

پیر یہ بھی یاد ہے کہ

”سفر دو ہیں، ایک اشخاص کا، ایک مقصد کا، اشخاص کی کامیابی یہ ہے کہ وہ اپنا کام کئے جائیں یہاں تک کہ اپنے آپ کو مقصد کے خطِ قربان کر دیں، جب انھوں نے اپنے آپ کو قربان کر دیا تو ان کا سفر بنو! مقصد تک پہنچ گیا، اور وہ کامیاب ہو گئے اب ان کے علاوہ یہ سوال باقی نہیں رہتا کہ مقصد حاصل ہوا یا نہیں؟ اس سفر میں سفر سے نہ ٹھکتا اور آخر تک چلتے رہنا ہی سب سے بڑا مقصد ہے، اور اس کے جس مسافر نے اس مقصد کو پایا۔ اس نے اپنا کام پورا کر دیا، یہاں ماہ اور منزل دو نہیں ہیں، ایک ہی ہے۔“

رازہ مضامین بلائیں انکلام آزاد ۱۹۹۱ء

باقی رہا مقصد کا سفر، تو بلاشبہ اس کی کامیابی یہ ہے کہ مقصد حاصل ہو جائے، لیکن یہ انسان کا کام نہیں ہے جو بیچ بڑا ہے۔ خدا کا کام ہے جو سورج چمکاتا اور بدلیاں بھیجتا ہے۔ اور اس کا قانون یہ ہے کہ اگر ہر وہ انسان مقصد کا میابی کے ساتھ اپنا مقصد پورا کرتے رہے تو مقصد کا سفر بھی ایک دن پورا ہو کر رہے گا۔“

(رازہ مضامین)

جب یہ حقیقت ہے اور اس حقیقت سے کسی طرح انکار نہیں کیا جاسکتا، تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان حالات میں مذہبِ عمل کا تعین کس طرح کیا جائے اور کیا کیا جائے؟ لیکن جس کی زبانِ قلم سے یہ صدا بلند ہو رہی تھی۔ اس نے کہا کہ میرا مذہبِ عمل ”ملک کی آزادی یا موت“ ہے۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں۔ یہ آواز نہرو شاہی میں پہلی آواز تھی، اس نے حیرت و استعجاب کے ساتھ ٹٹنی گئی، ہر شخص نے اسے ایک دوسرے سے پوچھنا شروع کر دیا کہ جو ”مذہبِ عمل“ متعین کیا گیا ہے۔ اور اشخاص کے سفر کی جو منزل بتلائی جا رہی ہے کیا واقعی کسی شخص واحد کا یہ مذہب ہو سکتا ہے اور کیا کوئی شخص اس راہ پر چل سکتا ہے؟

مگر جواب دے تو کوئی دے!

آخر کار وہی انسان اُٹھے بڑھتا ہے اور پورے جلال کے ساتھ ہندوستان کی مخالفت کر کے کہتا ہے کہ

”میری طرف دیکھو! میں ایک انسان ہوں جو ہوں (دشمنِ خلافت)

ملک کی آزادی یا موت، یہ راگنی ہے وقت کی راگنی

اگست ۱۹۴۷ء

ہے، ملک اس کے سلا تیار نہیں۔

یہ آواز کسی ایک فرد کی آواز نہ تھی، ہر شخص کی زبان پر یہی الفاظ جاری تھے۔ حرام سے ٹکڑہ کیا جلتے ٹکڑے ملے کیا جلتے، درہم بھر کی زبانوں پر یہی کلمات تھے۔ ان حالات میں مرد کار، آگے بڑھتا ہے، اور دہریہ زمانہ کو مخدوم کر کے کہتا ہے کہ

”ہمارے زمانے کے اکثر مدراس امر کو ایک مسلم الثبوت مسئلے کی حیثیت سے پیش کر دیا کرتے ہیں کہ کسی قوم کے سلا اس وقت تک آزاد ہونا مناسب نہیں، جب تک وہ اپنی حریت کے صحیح استعمال کے لائق نہ ہو جائے۔“

یہ مفروضہ اس حق کی زبان سے زیادہ عذروں معلوم ہوگا جو پوری مدایت کے مطابق تیرا سیکھ بیڑ پانی میں قدم نہیں کھنا چاہتا، پس اگر قوم حریت (آزادی) کے سلا اتنے دنوں تک انتظار کرے کہ پہلے حالت غلامی ہی میں پوری عاقل اور ذی ہوش بن جائے، تو اس کو تا بہد عرف انتظار ہی کیسے پڑے گا، وہ دنیا میں اترنے کے لئے دشمن درسی کے سیکھنے کا انتظار کرے گی اور دشمن درسی بغیر دنیا میں اترے تا قیامت ڈائے گی۔“

(انتخاب اہلال ص ۱۵)

میکس مدرین زمانہ نے اس کا کوئی اثر نہیں لیا۔ بلکہ کہنا شروع کر دیا کہ ایک آزادی کی جنگ کے نتائج آج تک بھگت رہے ہیں، اب جو جنگ لڑی جائے گی وہ ہم کو کہیں کا نہیں رکھے گی۔ ہم کسی نئے انقلاب کے لئے حید نہیں یہ غلامی ایک نعمت ہے اس میں ہم کو ہر قسم کی آزادی حاصل ہے۔ دنیا میں جو انقلاب آتا ہے وہ تباہیوں اور بربادیوں کا پیغام لے کر آتا ہے۔ یہ آدیزیں اس کے قانون ہکسٹنچیں۔ ایک اہل طراب کی جیج بلند ہوئی۔ اس نے کہا:-

”اگر کوئی انقلاب کی ابتدا نہایت خراب دیکھی جاتی ہے

مگر قوم جب تک آزادانہ زندگی بسر کرے وہ آزادی کے

صحیح استعمال سے واقف نہیں ہو سکتی۔“ (انتخاب اہلال ص ۱۵)

اس کی یہ دلیل ایک عقول دلیل تھی۔ مخالفت کرنے والوں نے سوچنا شروع کر دیا، شاید بہت جلد وہ وقت آجائے کہ پورا ملک اس کا ہونا

بن جائے کہ ملک کے قلب نے کہا کہ اس دور میں آزادی کا نام لینا اپنے کو بھڑکھڑاتا ہے۔ بندوستان طاقت ور ظالمانہ اقتدار کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ ان حالات میں وہ بھڑکھڑنے کے لئے تیار نہیں ہے۔

”میکس آزادی یا موت“ کا متغلا بھٹنھی سزاورڈ مذہب عمل کی حقیقت انسانی مافوں سے منوانے کے لئے بے چین تھا، وہ بول اٹھا۔

”ہر قوم کی تاریخ میں ایک زمانہ ایسا آتا ہے۔ جب اس کا ہر فرد حکومت کے نزدیک بھڑکھڑاتا ہے۔ کیونکہ وہ خدا کے بھڑکھڑ سے توبہ کرتی ہے اور حق و آزادی کے سلا اٹھ کھڑی ہوتی ہے۔ قوم کی آزادی کے یہی معنی ہیں کہ فیروں کی حکومت کا خاتمہ ہو، پس ظاہر ہے کہ اجنبی حکمرانوں کے نزدیک بھڑکھڑ اور بناوت کی اس سے بڑھ کر اور کیا بات ہو سکتی ہے۔

بندوستان بھی آزادی کے سلا بے قرار ہے اس لئے

کب کا بھڑکھڑا ہے؟ (زمانہ مضامین ابوالکلا آزاد ص ۱۹۹)

گلاس کی باتوں پر جس طرح دھیان دینا چاہئے تھا۔ اس طرح دھیان نہیں دیا گیا، اور سنی، الٹنی کو برابر کر کے ”کارٹڈ ماسکوں“ نے کہنا شروع کر دیا کہ انگریزی حکومت اور اس کی برکات کا مقابلہ دینی کے آزاد ملکوں سے کرو، اور دیکھو کہ یہاں کی غلامی دنیا کی آزادی سے کس قدر بلند ہے۔ تعلیمی، سماجی، اصلاحی ادارے قائم کرنے کا ہم کو اختیار حاصل ہے۔ مندر، مسجد، گرے، اگر مدار سے آزاد ہیں۔ حکومت ہمارے گوشہ حیات میں ہماری مدد کرتی ہے۔ اس سے بڑی آزادی اور کیا ہو سکتی ہے۔

یہ تقریر بڑی خوش نما تقریر تھی اور دلائل میں ناقابل تردید دلائل تھے۔ میکس جس لطیف حادثے نے بغیر ہاتھ رکھنے سے پہلے ہر سے سے مرض کو بھانپ لیا ہو۔ اس کے سامنے ان دلائل کی کوئی قیمت نہیں۔ اس نے کہا کہ:-

”ایک حکومت ایک قوم کی حریت و آزادی سلب کر

لیتی ہے۔ اس سے غلاموں کی طرح کام لیتی ہے۔ اس کی قوت

کو قوت کو دیتی ہے۔ اس کی اخلاقی حالت برباد کر دیتی ہے۔ آگ

یہ عمل بالکل ایک قلم مرچہ فساد ہے۔

لیکن وہ کہتی ہے کہ میں اپنی قوم کی اصلاح کرتی ہوں ، اور اسی کی اصلاح و ترقی کے لئے دوسری قوم کو اپنا غلام بناتی ہوں ۔

پس جو شخص اس حکومت کے خلاف جہاد کرتا ہے ، اس کے مفید قرار دیتے ہیں ۔
(مضامین ابدان)

لیکن

ہمراہ عقائد ہے کہ آزاد و ہندو ہر فرد اور قوم کا پیدائشی حق ہے ۔ کوئی انسان یا انسانوں کی گروہی ہوئی جو وہ کسی یہ حق نہیں رکھتی ، کہ خدا کے بندوں کو اپنا گروہ بنائے ۔ ملکی اور غلامی کے لئے کیجھے ہی خوشنام کیوں نہ رکھئے جائیں ۔ لیکن وہ غلامی ہی ہے ۔ اور خدا کی مرضی اور اس کے قانون کے خلاف ہے ، پس میں موجود گورنمنٹ کو جائز حکومت تسلیم نہیں کرتا ، اور اپنا ملکی ، مذہبی اور انسانی فرض سمجھتا ہوں کہ اس کی ملکی سے ملک و قوم کو نجات دہوں ۔

”قول فیصلہ“ بیان عدالت ، مگر سوال پیدا ہوتا ہے کہ ملک کی آزادی کی جنگ لڑے تو کون رہے اس ملک میں متحد قومیں ہیں ، لیکن یہاں کے عوام دو اکثریتوں میں بٹ جاتے ہیں ۔ ایک کا نام ہندو ہے اور ایک کا نام مسلمان ، دونوں کی تہذیب و دونوں کی معاشرت میں شدید اختلاف ہے اور یہ اختلاف ہرگز شرمہیات میں ظاہر ہے ۔ اس لئے دونوں مل کر آزادی کی جدوجہد میں کیسے حصہ لے سکتے ہیں ؟

یہ سوال ایک ایسا سوال تھا ، کہ جس نے اس پیگیر غریب کو ایک لمحہ کے لئے غور فکر میں ڈال دیا ۔ اس نے اپنی رہنمائی کا ہاتھ جس رہنما کے ہاتھ میں دیا تھا ۔ اس کی تعلیم نے رہنمائی کی ۔ تفصیلی جواب سے قبل اس نے پرچوں لپ و لچ میں کہا کہ :-

”ہندوستان کے لئے ، ہندوستان کی آزادی کے لئے ۔ صداقت و حق پرستی کے بہترین فرائض ادا کرنے کے لئے ، ہندوستان کے ہندو مسلمانوں کا اتفاق اور ان کی یک جہتی ضروری ہے ۔“ (خطبہ صدارت اگرہ)

اس اجمالی جواب نے غائبین میں جھنجھلاہٹ پیدا کر دی ۔ اور اس

جھنجھلاہٹ کے نتیجہ میں ان لوگوں نے کہنا شروع کر دیا ، کہ یہ نعرہ مذہب کے خلاف ہے ، کہ زور اسلام کا اتحاد قیامت تک ناممکن ہے ۔ اور دنیا کا کوئی بڑا سے بڑا انسان مذہبی تعلیم کی روشنی میں اس کو ثابت نہیں کر سکتا ۔ یہ آواز صرف پیپلک پلیٹ فارم کی آواز نہ تھی ، بلکہ کچھ خانقاہوں سے بھی اسی قسم کی صدا میں بلند ہوئیں ، سروں ، خان بہادروں ، رائے بہادروں نے آواز میں آواز ملائی ۔ کتا بھی شائع ہونے شروع ہوئے ، اور غائبین کو یہ یقین ہو گیا کہ اس کا جواب ناممکن ہے ۔ لیکن وہ پیکر حریت و آزادی آگے بڑھا ، اور ہندوستان کے ہر فرد انسانوں کو مخاطب کرتے ہوئے اس نے کہا کہ :-

”ہندوستان کے ساتھ ساتھ کروڑ مسلمان ، ہندوستان کے ہندو مسلمانوں کے ساتھ مل کر ، بیٹے ہو جائیں کہ دونوں مل کر ہندوستان کی ایک قوم اور نیشن بن جائیں ۔“

آپ میں سے اب مسلمان بھائیوں کو سنا چاہتا ہوں کہ خدا کی آواز کے بعد سب سے بڑی آواز ہو سکتی ہے وہ (حق) محمد رسول اللہ علیہ وسلم کی زبان تھی ۔ اس وجود مقدس نے جہانم کھل دیا ، جس نے اس کے الفاظ میں کہ

”ہم ان تمام قبیلوں سے جو مدینہ کے اطراف میں بستے ہیں صلہ کرتے ہیں ، اتفاق کرتے ہیں اور ہم سب مل کر ایک نیشن بننا چاہتے ہیں ، ایک قوم بننا چاہتے ہیں“ (خطبہ صدارت اگرہ)

پھر اس مسئلے میں داخل کا ایک انبار سلئے آیا ۔ اُس نے غائبین کو ایک بڑی شکست دی ۔ مگر جو انہوں میں ”انار کی“ کے جذبات پرورش پاتے د کھلائی میس ۔ یہ بات ہندوستانی روایات کے خلاف تھی ۔ اس نے کہا کہ میری شہرہ کی بات کو یاد کرو ، اور اس کو اس سرکردہ آزادی میں اصل لا صلہ کی حیثیت دے دو ۔ میں نے کہا تھا کہ

”ہر طاقت و رہا تھ جس میں تمہارا ہوا ، اپنے مخالف کو شکست دے سکتا ہے ، لیکن تمہیں اس فاتح کے لئے ہے جو اس کے استغما

کے بغیر مریت کو اپنے قابو میں کرے ۔“ (الندہ مکھڑا پریل ۱۹۳۷ء) بات بظاہر بڑی خوش آئند بات تھی مگر جس فیض انداز میں کہی گئی تھی ۔ عوام اس کے متحمل نہ تھے ، مرد آزاد نے ان کے چہروں کو پرٹھا اور کہنا شروع کیا کہ :-

ہندوستان کی قومیت بحث و نظر کے ابتدائی مدارج
 کے مگر کے عمل زندگی میں گامزن ہو چکی ہے۔ اس نے قدرتی ہوتے
 سے کہ آپ کے ذوقی عمل پر بحث و نظر کی طوالت گراں گزرتی ہو
 اب آپ کی پسندیدہ چیز فصاحت نہیں رہی بلکہ عمل کی سادگی

(خطبہ صدارت کانگریس ۱۹۳۳ء)

اور یہ حقیقت بھی تھی رگ مل کے لئے بے چین تھے۔ پہلا عمل پروگرام
 متحرک مواصلات اور وراثتی مال کے بائیکاٹ کے نام سے سامنے آیا۔ مگر ترک
 مواصلات (نان کو آپریشن) ایک ایسا مسئلہ تھا جو مدبرین زمانہ کی نگاہ میں نہیں
 آتا تھا۔ انہوں نے کہا شروع کیا کہ کیا ترک مواصلات سے ملک آباد ہو سکتا ہے
 کیا اس طرح فلاحی سے نجات حاصل کی جاسکتی ہے؟ کیا کسی ملک نے نان کو آپریشن
 سے نجات حاصل کی ہے؟ بظاہر ہاں باتیں ایسی تھیں جو عوام کو متاثر کرنے والی
 تھیں، حوالہ کر، مراض کرنے والوں کے دل جانتے تھے۔ اور ان کو اس کے
 دور رس نتائج کا بھی اندازہ تھا۔ پھر بھی ان زبانوں پر مہر سکوت لگا نا ضروری
 تھا۔ اس لئے معلم آبادی نے صاحبان فہم و فراست کی زبان میں فرمایا کہ۔

”قوموں کی سیاسی جدوجہد کے میدان میں دیکھا جائے
 چھپ چھپ ذہن ایک متفقہ اعتقاد ہے۔ بلکہ متفقہ عمل ہے
 بالکل ظاہر ہے کہ دنیا میں کوئی قوم اور جماعت اپنے آباد
 حقوق کو اپریشن کے ذریعہ نہیں حاصل کر سکتی۔ ہر قوم نے اپنے
 حقوق جدوجہد کر کے حاصل کئے ہیں اور جدوجہد مقابلہ اور

(خطبہ صدارت کانگریس ۱۹۳۷ء)

اب مسئلہ کی صحیح صورت نگاہوں کے سامنے آگئی۔ اور ملک کے ہندو
 مسلمانوں نے مل کر جدوجہد شروع کر دی۔ عام تعاون (نان کو آپریشن) اور
 وراثتی مال کے بائیکاٹ کی ترکیب شباب پر آئی، ابطال ذی سامراج کے قدم ڈھنگا
 گئے۔ مذہب سے بے گناہ مذہبی شکیکیداروں کی تلاش شروع ہو گئی۔ ملک میں کچھ
 خانقاہیں اور آشرم پیپے سے موجود ہیں تھے۔ جو موٹے کے منظر تھے۔ بریلی سے
 ایک نیا گل کھلا جس نے سرے سے اس تحریک کو عمل باطل قرار دیا۔ ہندو
 مسلمانوں میں اختلاف کی خلیج حائل کرنا اور شادی، ششکھن کے نام سے ملک
 میں تصادم کرنا اصول قرار پایا جس کے لئے دودھ دھوپ شروع ہو گئی۔ برہمن
 نے نئے ہروپ بھرنے لگے اور وہ آبادی کی جنگ جو کامیابی سے ہم کنار نہ

والی تھی، وہ بظاہر رکتے نظر آئی۔ لیکن یہ بات ملک کے لئے اور اہل ملک
 کے لئے بڑی شرمناک بات تھی۔ اس لئے اس نے ہندوستان کے ہر
 باشندہ سے کو اس کا کیا ہوا جدید یاد دلایا، اور اس عہد کو یاد دلاتے ہوئے
 کہا کہ۔

”چاند سال بوسٹ کہ ہم نے قومی عزت و شرف کا ایک

بڑے سے بڑا اعلان کیا، اور دنیا سے کہا کہ ہماری آزادی کا
 انکار کرے لیکن میں اس وقت جب کہ وہ ہماری آزادی کی مثال
 صفحہ کے لئے گوش برآواز ہے، ہم آمادہ ہوئے ہیں کہ اپنی علامہ شرمناکی
 اور اپنے جہنم ناک کشت و خون کی اگلی کھلے ہوائی قریب دیں۔ موجود
 یہ ہے کہ سولہ اور خلافت کی جگہ شادی کی تحریک اس کی مدافعت اور
 شکستن کا غفلت پر طرف پیہ ہے۔“ (خطبہ صدارت کانگریس ۱۹۳۳ء)

یہی حالت میں

”ایک طرف کہا جا رہا ہے کہ ہندوؤں کو مسلمانوں سے

بچاؤ اور سری طرف سے کہا جا رہا ہے کہ اسلام کی لاج کی ہندو
 کے متعلق مخالفت کر دو۔ جب ہندوؤں اور مسلمانوں کی مخالفت کی
 پکار ہندو ہوسے تھی ہر جگہ کہ بدعتیہ ہندوستان کا دور
 کب قائم رہ سکتا ہے۔“ (خطبہ صدارت کانگریس ۱۹۳۳ء)

بات بھی کچھ ایسی ہی تھی، انگریزی سامراج کا منشا پورا ہوتے نظر
 آیا۔ علاحدگی پسندی کے خیالات کی پورے ملک میں اشاعت ہونے لگی
 مسلمان جن کی تعداد ہندوؤں سے بہت کم تھی، اور جو تعلیم اور دولت میں ان
 سے بہت پیچھے تھے، خود کو لڑے اور خمدارے میں سمجھتے تھے اس لئے انہوں نے
 دریغ فتنہ کیا کہ کچھ اب کیا راستے ہے۔ اس نے کہا کہ۔

”کسی قوم کے آواز ہونے کے لئے پہلی غلط یہ ہے کہ

آپ کو آزادی کا پورا قدر شناس ثابت کر دے۔ جس وقت
 ہندوستان نے یہ مطالبہ کیا کہ ترکی، اور عرب کی آزادی محفوظ
 رہنی چاہیے تو ساتھ ہی اس نے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ وہ خود آزادی
 سے محروم نہیں رہ سکتا۔“ (خطبہ صدارت کانگریس ۱۹۳۷ء)

یہ تو مسلمانوں کے لئے درس حقیقت تھا۔ اور ان کو ان کا بھولا ہوا
 سبق یاد دلانا تھا مگر ساتھ ہی ہندوستان کی ۲۲ کروڑ آبادی سے بھی خطاب

مگر سب سے پہلے اس مردِ حق میں کو کھن پڑا، اگر

میں نے سنا تھا کہ آپ نے ہم مذہبیوں کے مسلک کے خلاف اپنی صداقت کی قسم لی۔ اور ان کی مخالفت کا خوف مجھے اظہارِ حق سے باز رکھ سکا تھا، ٹھیک اس طرح آج میں اپنا پہلا فرض سمجھتا ہوں کہ میں ان تمام بھائیوں کے خلاف اپنی صداقت باندھوں، جو ہندو مت کے قریب کے عقیدہ دار ہیں۔

مذہب کا کام جاری رکھتے ہوئے آگے فرمایا کہ

”آج یہ تحریک ان لوگوں کو بانیہ نہ کرنا چاہتی ہے جن کی تعداد مسلمانوں سے تین گنی زیادہ ہے۔ یہ کسی تامل کے صاف صاف کہنا چاہتا ہوں کہ آج جس ہندوستان میں مذہبی ہندو مت کے قریب سے اور مذہب کے قریب سے ہیں صرف ایک متکلف کی ضرورت ہے اور وہ یہ ”انڈین نیشنل کانگریس“ ہے۔“

(خطبہ صدارت کانگریس ۱۹۳۱ء)

ابھی یہ کلمات اس کی زبان سے ادا ہوئے تھے کہ قیامت آگئی، مسلمانوں کو ہر گشتہ کرنے کا سامنا ہی پہلے فراہم کیا جا چکا تھا۔ اب ہندو بھی ہر گشتہ ہونے شروع ہو گئے۔ مسلمانوں کو ہندوؤں کی اکثریت کا خوف کھانے جا رہا تھا، اور ہندو خلافت کی تحریک سے پیدا ہونے والے اثرات سے پریشان تھے۔ ان کو یہ خیال تھا کہ اگر ان اس وقت چلا گیا تو ملک کی باگ ٹوڑ پیر مسلمانوں کے ہاتھ میں آ جائے گی۔ بساط سیاست کے شارک کھلاڑیوں نے دو قوموں کے دلوں میں دو الگ الگ قسم کے شبہات پیدا کر دیئے تھے۔ ہندوؤں سے جس حد تک بات کہنی چاہیے تھی، اس حد تک کہی گئی، رہا مسلمانوں کا سوال تو وہ اس کے ہم قوم تھے، ان سے اس بھلے حریت اور مجاہدیت کے مطالب کا اندازہ دوسرا تھا۔ ہندوؤں کی اکثریت کا خوف کوئی نیا نہیں تھا۔ جب اس نے مسلمانوں میں ملک کی آزادی کے لئے ہندو مسلم یکجہتی بھائی بھائی کا اتحاد کا درس دیا تھا، اس وقت بھی ہندو اکثریت کا سوال اس کے سامنے مسلمانوں کی طرف سے نہ کیا گیا، نہ اس کی نگاہیں ماضی کے آئینہ میں حال کو دیکھتے ہوئے مستقبل کو دیکھ رہی تھیں۔ اس لئے اس کو کہنا پڑا کہ:-

”میں تو سمجھتا تھا کہ اب یہ بن نکل گیا، مگر آپ تیس برس

کا بچا، اس وقت ابھی جو سب نہیں، بہتر مسلمانوں کی تعداد کم ہے۔ سیلف

مگر رنٹ، ہندو گورنٹ ہو جائے گی، ہندو مسلمانوں کو چیر چھاؤں ڈالیں گے۔ پس مسلمانوں کو ہمیشہ غلام اور مملوک بن کر رہنا چاہئے اگر یہ فلسفہ اب تک باقی ہے تو باقی رہے، تم کو غلامی مرغوب ہے تو نظارہ اللہ خدا ہمیشہ غلام بنا کر رکھے گا۔“

(مضامین ابوالکلام آزاد صحت دوم، ایک مراسلت کا جواب) مسلمانوں کو آزادی کی حقیقت سمجھاتے ہوئے فرمایا کہ:-

• ہندوستان کو آزاد ہونا ہے وہ آزاد ہو کر رہے گا۔ مودِ حقین عالم کی صف ایک نئے مورخ کی راہ تک رہی ہے۔ وہ آزادی ہند کا مورخ ہو گا۔ خلافت کمیٹیاں اگر پھٹی ہیں کہ ان کو کیا کرنا چاہیے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ان کو آزادی ہند کی تاریخ کا پورا مواد صرف اپنے ہی سرمایہ سے فراہم کر دینا چاہیے۔ تاکہ جب مورخ کا قلم اٹھے تو اسے اعتراض نہ پڑے کہ ہندوستان اپنی آزادی کے لئے کسی جماعت کا اسس قدر مرہون منت نہیں ہے، جس قدر یہ ان اسلام کا۔“

(تازہ مضامین ابوالکلام آزاد صحت دوم)

اور جن وقت یہ باتیں کہی گئیں اس وقت کچھ حالات بھی ایسے ہی پیدا ہو گئے تھے۔ اس سے ہندوؤں کا اپنی جگہ یہ فیصلہ کر لینا قرین قیاس تھا۔ کہ اگرچہ اگر کیا تو ملک کی باگ ڈور مسلمانوں کے ہاتھ میں ہوگی۔ انگریزی سامراج کے ایجنٹوں نے اس شک کو یقین کا درجہ دینے کے لئے مسلمانوں سے معاملات کی گفتگو شروع کی اور مسلمانوں نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہندوستان میں مصالحت کی پیش کش کا غیر مقدم کرنا چاہا۔ مگر جس کی نظر بساطِ عالم پر تھی اور جو یہ شبہ اور یہ بات کہنے کے لئے تیار دیاں کر رہا تھا اس نے کہا کہ:-

”جس وقت تک ایک چمچہ زمین پر، ایک انچ زمینی پر اتنے حصے پر کہ جتنے حصے ہیں عراق کے گرد و غبار کا ایک ذرہ آسکتا ہے، اگر انگریزی حکومت کا بلا واسطہ یا با واسطہ ہاتھ باقی رہے۔ یہ مسلمان کے لئے آسان ہے کہ چھوڑوں کے ساتھ، سانپوں کے ساتھ صلح کر لیں، پہاڑوں کے غاروں اور بھٹوں میں چلے جائیں وہاں دزدوں کے ساتھ صلح کر لیں۔ مگر یہ ممکن نہیں کہ انگریزوں کے سامنے صلح کا ہاتھ بڑھائیں“ (خطبہ صدارت جمعیت علماء لاہور ۱۹۳۱ء)

مگر جہاں مرد باذوق نے دیکھا کو میری بات ان کی سمجھ میں نہیں آ رہی ہے
نو تھوڑی سی ترمیم میں جاتے ہوئے کہنا شروع کیا کہ۔

ہر مسلمان کے قلب پر یہ حقیقت نقش ہے، اور ہو جانا چاہئے
کو حب ملک، انگریز گورنمنٹ، برٹش گورنمنٹ اپنے اس اہلیساؤ گھنہ
سے باز نہ آجائے مسلمانوں کے معاملات شرعی کو چور نہ کر دے،
عراق کی سرزمین اس کی ممانعت سے پاک نہ ہو جائے۔ جو بیک
ایشیاؤ کو چاک میں اس کی کوئی طاقت مخالفت نہ کرے، قطعاً
سے تمام شرائط اور پابندیاں اٹھانی جائیں، ہندوستان کو
آزادی نہ دی جائے اس وقت تک برٹش گورنمنٹ فریقِ عارب
سے، اس وقت تک اس کے لئے جائز نہیں کہ صلح صفائی کا ہاتھ
انگریزوں کی طرف بڑھا سکے، وہ تمہارے ان آباد شہروں کو چھوڑ
دے، جنگوں میں چلا جائے دباں سانپوں کے ساتھ صلح کر دے
بچھوڑوں کے ساتھ صلح کرے، اگر انگریزی گورنمنٹ کے ساتھ
صلح نہیں کر سکتا۔ (خطبہ صدارت جلسہ آگرہ ۱۹۰۵ء)

دیکھو جو تہم فساد فرقہ واریت کے نام سے لویا جا چکا تھا۔ اور جس
کی آپ باری کے لئے ہندوؤں نے خون بہا ہے چاچکے تھے۔ اب ایک تناور درخت
بہتے ہوئے نظر آیا اور سری طرف ملک کے بعض گوشوں سے بے آوازیں آنے
لگیں کہ انگریز ہندوستان کو آزاد کرنے کے لئے تیار ہے مگر یہ ہندو مسلم اتحاد کا
راگ گانے والے آزادی کی راہ میں روڑا بنے ہوئے ہیں۔ آج اگر ہندوستان
اس مطالبہ سے دست بردار ہو جائے تو کل اس کو آزادی مل سکتی ہے۔ دعویٰ ہندو
اتحاد نے بھی ان بھولی بھالی پرفریب باتوں کو سنا، اور پھر اس وقت کے ۲۹ کروڑ
ہندوستانی ہندوؤں کو مخاطب کر کے فرمایا:-

”آج اگر ایک فرشتہ آسمان کی بدلیوں میں سے اتر آئے
اور وہی کے قلب میثار پر کھڑے ہو کر، اعلان کر دے کہ سولہ
ہجرت گنہ کے بعد مل سکتا ہے بشرطیکہ ہندوستان ہندو مسلم اتحاد
سے دست بردار ہو جائے۔

تو میں سولہ سے دست بردار ہو جاؤں گا مگر اس
سے دست بردار نہ ہوں گا۔ کیونکہ اگر سولہ ملنے میں تاخیر ہوئی
تو یہ ہندوستان کا نقصان ہوگا، لیکن اگر ہمارا اتحاد جاتا رہا تو

یہ عالم انسانیت کا نقصان ہے۔“ (خطبہ صدارت کانگریس ۱۹۰۵ء)

لیکن بات جو ہونے والی تھی وہ ہو کر رہی، ہندو مسلم اتحاد پارہ پارہ ہوا، ذمات
کی ہر سی تیزی کے ساتھ بڑھیں، اور ملک پھر غلام کا غلام رہا، مگر اس کے لئے
ہوئے قدم پیچھے کی جانب نہ مڑ سکے۔ یہاں تک کہ تاریخ نے، برس اور گزراؤں نے
یہ زمانہ خاموشی کے ساتھ نگوارا جا۔ کہ جو پیش قدمی و کمزوری تک وہی پوری
داستان دہرائی گئی، مستند سے مستند تک عدم تعاون، باقی کاٹ کی جنگ، یہاں
کے ساتھ لڑی گئی۔ آئینی تبدیلی کے آثار و نتائج سے آنے شروع ہوئے۔ اور اب
ہندوستان کے نوڈی سیاست کے ماہرین نے بھی یہ یاد کیا کہ حکومت کی جو یہیں توسیع
ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ اس مہرِ اعظم کو ایک بار پھر پورے ہندوستان کو مخاطب
کرنے کا موقع ملا۔ اور اس نے کہنا شروع کیا کہ

”اس سترہ برس کے اندر ایک کے بعد ایک بہت سی چیزیں

ہمارے سامنے آتی رہیں، ہمارا سفرِ زندگی کا تھا۔ اور فردی تھا
کہ مختلف منزلوں سے گذرتے، ہم ہر منزل پر نمبر برس، مگر کے
کہیں نہیں، ہم نے ہر مقام کو دیکھا، مگر ہمارا دھنکا کہیں
بھی نہیں، ہمیں طرح طرح کے آثار پر ٹھٹھا پیش آئے، مگر ہمارے
میں ہماری نگاہ سامنے کی طرف رہی، تو کیا تو ہمارے اداؤں کے
بارے میں شک ہے ہوں مگر ہمیں اپنے فیصلوں کے بارے
میں کبھی شک نہیں گزرا، ہمارا راستہ شکوں سے ہوا تھا، ہمارے
سامنے قدم قدم پر طاقت و درکاؤں کی کڑی نقیص۔ ہم جتنی تیزی
سے چلنا چاہتے تھے، ڈچل سکے ہوں، لیکن ہم نے آگے بڑھنے میں
کبھی کوتاہی نہیں کی اگر ہم مستحضر اور مستعد کی درمیانی مسافت
پر نظر ڈالیں تو ہمیں اپنے پیچھے بہت دور و صندھ لاسا نشان دکھائی
دے گا۔ مثلاً وہیں ہم اپنی منزل مقصود کی طرف بڑھنا چاہتے
تھے، مگر منزل ہم سے اتنی دور تھی کہ اس کی راہ کا نشان بھی دکھائی
آگیا، اس سے اوچھل تھا لیکن آج نظر اٹھائیے اور سامنے کی طرف
دیکھئے، نہ صرف منزل کا نشان صاف صاف دکھائی دے رہا

ہے بلکہ منزل بھی دور نہیں۔“ (خطبہ صدارت کانگریس ۱۹۳۱ء)

مگر جہاں تک اور ملکی مسائل کا تھا، تو اس میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ وہ
اسی طرح اچھے ہوئے تھے، اب سے بڑا مسئلہ ہندو مسلمانوں کی علاحدہ پسند

ہندوستان اور مسلمان چاہتے ہیں کہ اقلیت کو جو حد و شہادت سے دوچار ہونا پڑتا ہے، وہ سارے حد و شہادت ایک ایک کر کے اس کے سامنے لپکتے تھے۔ اور شہادتیں اس کے بعض بر خود غلط ثابت ہیں۔ اپنی علاحدہ ہندی کا عام طور پر اعلانی بھی کر دیا تھا۔ اب آپ ہی بتلا دیجئے کہ جس نے ہندوستان کو متحدہ قومیت کا درس دیا ہو، اور جو ابھی اختلاف کو عالم انسانیت کا نقصان سمجھتا ہو، اس کے دل پر کیا گزند ہونی چاہیے؟ اس کا سکون دل ہی گیا، اور ایک بار حکیمانہ انداز میں پورے ہندوستان کو اکثریت اور اقلیت کی حیثیت سمجھا ہوئے مسلمانوں کے دل پر حد و شہادت کو دور کرنے کا فیصلہ کر لیا، اور اسی جذبہ کے پیش نظر حکیم ملت، امام اہل ہند نے سب سے پہلے ایک سوال کیا کہ

”کیا ہندوستان میں مسلمان کی حیثیت ایک ایسی اقلیت کی ہے جو اپنے مستقبل کو شک اور خوف کی نظر سے دیکھ سکتی ہے اور تمام اندیشہ اپنے سامنے لاسکتی ہے۔ جو قدرتی طور پر ایک اقلیت کے دماغ کو مضطرب کر دیتے ہیں؟“

لیکن اس سوال کا جواب کون دیتا، جب اس نے دیکھا کہ سب کی زبانوں پر ہر سکوت گت چکی ہے، جواب دینا دکنڈ، سوال کے سمجھنے کی بھی صلاحیت نظر نہیں آتی تو وہ خود آگے بڑھا اور کہنا شروع کیا کہ

”ہندوستان کے سیاسی مسائل میں کوئی بات بھی اس درجہ غلط نہیں سمجھی گئی۔ جس پر یہ بات کہ ہندوستان کے مسلمان کی حیثیت ایک سیاسی اقلیت کی ہے۔ اور اس لئے ایک جمہوری ہندوستان میں ہمیشہ حقوق و مفاد کی طرف سے اندیشہ ناک رہنا چاہیے۔ اس ایک بنیادی غلطی کے لئے ہر شمار غلط فیروں کی پیدائش کا مدعا نہ کھول دیا۔ غلط دیوار میں چن جانے لگیں۔ اس نے ایک طرف تو خود مسلمانوں پر ان کی حقیقی حیثیت مشتبه کر دی، دوسری طرف دنیا کو ایک ایسی غلط فہمی میں مبتلا کر دیا، جس کے بعد وہ ہندوستان کو اس کی صحیح صورت حال میں نہیں دیکھ سکتی۔“

اگر اس معاملہ کی ابتدائی تاریخ آپ معلوم کرنا چاہتے ہیں تو آپ ایک سابق وائسرائے ہند لارڈ ڈفرن اور سابق منسٹر گورنر لارڈ کراکسٹن (اب یونائیٹڈ پروٹیسٹنٹس سرکلیف کا لوگ کے زمانہ کی طرف لوٹنا چاہیے۔

برطانوی سامراج نے ہندوستان کی سرزمین پر وقتاً فوقتاً بھیجے ہوئے اہل میں سے ایک ایک یہ تھا۔ اس نے فوراً پھول پتے پیدا کئے۔ وہ گریس برس گزرتے چکے ہیں، مگر ابھی تک اس کی بڑی خشک نہیں ہوئی۔

سیاسی دل چال میں جب کبھی ”اقلیت“ کا لفظ بولا جاتا ہے تو اس سے مقصود یہ نہیں ہوتا کہ سیاسی کے عام معنی کا ہے۔ اس کے مطابق انسانی افراد کی ہر ایسی تعداد جو ایک دوسری تعداد سے کم ہو اور جس کی طرف پراپریت ہوتی ہے اور اسے اپنی حفاظت کی طرف سے خطرہ ہونا چاہیے۔ بلکہ اس سے مقصود ایک ایسی گروہ جماعت ہوتی ہے جو تعداد اور صلاحیت دونوں اعتبار سے اپنے کو اس قابل نہیں پاتی کہ ایک بڑے اور طاقتور گروہ کے ساتھ رہ کر اپنی حفاظت کے لئے خود اپنے اوپر اعتماد کر سکے۔ اس حیثیت کے نفاذ کے لئے صرف یہ کافی نہیں کہ ایک گروہ کی تعداد کی نسبت دوسرے گروہ سے کم ہو بلکہ یہی ضروری ہے کہ بچائے خود کم ہو، اور اتنی کم ہو کہ اس سے اپنی حفاظت کی توقع نہ کی جاسکے۔ ساتھ ہی اس میں تعداد کے ساتھ قومیت کا سوال بھی کام کرتا ہے۔ فرض کیجئے کہ ایک کتاب میں دو گروہ موجود ہیں، ایک کی تعداد ایک کروڑ ہے دوسرے کی دو کروڑ ہے اب اگر یہ ایک کروڑ دو کروڑ کا نصف ہو گا، اور اس سے دو کروڑ سے کم ہو گا، مگر یہ سیاسی خطا خیال سے ضروری نہ ہو گا کہ صرف اسی نسبتی فرق کی بنا پر ہم اسے ایک اقلیت (فمن کر کے اس کی ضرورت ہستی کا اصرار کریں۔ اس طرح کی اقلیت ہونے کے لئے تعداد کے نسبتی فرق کے ساتھ دوسرے عوامل کی موجودگی بھی ضروری ہے۔ اب لہذا خود کیجئے کہ اس لحاظ سے ہندوستان میں مسلمانوں کی حقیقی حیثیت کیا ہے؟ آپ کو دیر تک خود کرنے کی ضرورت نہ ہوگی آپ صرف ایک ہی نگاہ میں ملاحظہ کریں گے کہ آپ کے سامنے ایک عظیم گروہ اپنی اتنی بڑی اور پہلی ہوئی تعداد کے ساتھ سر اٹھائے کھڑا ہے۔ اس کی نسبت ”اقلیت“ کی کوڑوں کا گمان بھی کرتا اپنی نگاہ کو مزید دھوکا دیتا ہے۔“

(خطبہ صدارت کانگریس سن ۱۹۵۷ء)

میں نے ہندوستان کے مسلمانوں کو شک کا مریض بنا دیا گیا تھا۔ اور اس کے ساتھ ہی ساتھ مسلمانوں کی مشنوں پر کھڑے ہو کر اپنی میڈری کی حالت تبدیل کرنے والوں نے اس مرد حق آگاہ سے تمام مسلمانوں کو برگشتہ کرنے کے لئے طرح طرح کے منصوبے، گٹھ جوڑے، اور یہ یقین دلانا شروع کیا کہ مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لئے علاحدہ ہندو کی پالیسی بنی پالیسی ہے، برطانوی سامراج کو اپنے منصوبے میں کامیاب ہونے کا سہرا چھپا کر دیا وقت تھا۔ اس لئے اس نے بھی شک و شبہ میں ڈھکی چھپی کا اعلان کیا۔

”انڈیا پارٹی کی تفصیل ایک طرزی تفصیل ہے۔ لیکن اس کے نتیجے میں ایک تفریق ہو رہی ہے کہ بدحوالات کو دیکھ کر اس کا مقصد بھی اظہارِ ناک تصور ہے۔ اس وقت یہ یقین تھا کہ

”سوراج نے کی تاریخ سے ہندوستان کا نقصان تھا۔ لیکن اتحاد کے رخصت ہو جانے سے عالم انسانیت کا نقصان نظر آ رہا ہے۔“

اور یقیناً نے اتحاد کی شکل میں اختیار کر لی تھی اور حال یہ تھا کہ ایک طرف ہندو پیچ رہا تھا کہ ہمارا وجود خطرے میں ہے، تو ہندوستانی میں مسلمانوں کے دشمنوں کے نیچے سے نہیں نکل چکی تھی۔ برطانوی سامراج کے ایجنٹ اس وقت دہلی میں دیکھ کر مسکرا رہے تھے اور ان کو یقین ہو گیا تھا کہ ہندوستان اب سنبھالا نہیں لے سکتا۔ اور یہ یقین آگیا کہ ہندو بھی تھا۔ مگر انہیں کیا خبر تھی کہ ابھی وہ مسیحا موجود ہے کہ جس نے غلامی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی اور دم توڑتی ہوئی انسانیت میں آزادی کی روح پھونکی تھی وہ مسیحا نفسی کا پھر ثبوت دے گا۔

آنکھ کا یہی ہوا سب سے پہلے ۲۲ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو دہلی کی جامع مسجد میں اس نے ہندوستان کے مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ ”انگریز کی بساطِ تعاریٰ خواہش کے برخلاف الٹ دی گئی ہے۔ وہ ہندو کے وہ بت جو تم نے وضع کئے تھے وہ بھی فنا ہو چکے ہیں۔ تم نے یہی سمجھا تھا کہ بساطِ ہمیشہ کے لئے بچانی گئی ہے اور انہیں جن کی پوجا میں تعاریٰ زندگی ہے۔“

پھر بات ایک دوسرا اعلان اختیار کر کے سامنے آئی کہ

”یہ ٹیک ہے کہ وقت نے تعاریٰ خواہشوں کے مطابق انسانی

نہیں لی۔ بلکہ اس نے ایک قوم کے پیداؤشی حق کے احترام میں کرٹا ہٹا دیا۔ اور یہی وہ انقلاب ہے کہ جس کی ایک کرٹا سے تعویضیت حد تک خوف لاحق کر دیا ہے۔ تم خیال کرتے ہو کہ تم سے کوئی بھی نہیں گئی اور اس کی جگہ بڑی شے آگئی۔ یہ واقعہ نہیں دیکھ رہے حقیقت یہ ہے کہ بڑی شے چلی گئی اور اچھی شے آگئی۔“

لیکن یہ باتیں ساری تہیدی باتیں تھیں، اصل سوال اٹھ رہا ہے کہ قدموں کا جھاننا اور ان کے دلوں سے اس خوف و ہراس کو نکالنا تھا کہ جس نے ان کے دلوں میں گھر کر لیا تھا، اس کے لئے فرمایا کہ۔

”مسلمان اور ہندو، یا مسلمان اور شتال ایک جگہ نہیں

ہو سکتے۔ یہ مسلمان کو ذکوئی ملے ہو سکتی ہے اور ذکوئی خوف ڈا سکتا ہے۔ چند انسانی چہروں کے غائب اور نظر ہو جانے سے ڈر نہیں، انہوں نے تعویضیت جانے ہی کے لئے اکٹھا کیا تھا، آج انہوں نے تعویضیت ہاتھ سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا تو یہ عیب کی بات نہیں، یہ دیکھ کر تعویضیت دل تو ان کے ساتھ ہی رخصت نہیں ہو سکتا۔ اگر وہ ایسی ایک تعویضیت سے پاس ہے تو اس کو اپنے اس خدا کا جوہ گاہ بناؤ جس نے آج سے تیرہ سو برس پہلے عرب کے ایک اتنی کی عزت فرمایا تھا کہ جو ایمان لائے اور اس پر ایم لگے تو پھر ان کے لئے ذکوئی کا ڈر ہے اور ذکوئی تم۔“

”بوائیس آئی اور گندہ جاتی ہیں اور یہ مرمری، لیکن اس کی جگہ زیادہ نہیں، ابھی دیکھتی آنکھوں یا بسلا کا موسم گدہ نے والا ہے۔ یوں بدل جاؤ جیسے تم پہلے کبھی اس حالت میں نہ تھے۔“

”ایک مولا تا ابد اسلام آزاد کا پیغام، تقریر جامع مسجد ملی ۲۲ اکتوبر ۱۹۴۷ء پھر دہلی میں ۲۳ اکتوبر ۱۹۴۷ء میں اس سے مختلف انداز میں لکھنؤ میں دہلی میں مسلمانوں کے اکٹھے ہونے قدم بچھنے لگے، اور دیکھتی آنکھوں نے یہ منظر دیکھنا شروع کر دیا کہ ہندوستان کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے کہ جہاں مسلمان موجود ہیں اور آج کسی کو کسی قسم کا کوئی خوف پریشان کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔“

اب سوالی ملک کی مخالفت اور اس کی ترقی کا تھا، اس پر ہندوستان کا مرنے پر چکا ہے۔

”لیکن ملکہ میں ایک انعام کا اور ایک مقصد کا“

اگست ۱۹۵۵ء



اوپر، ہندوستان کی جمہوری حکومت کے بنیادیں کی حیثیت

سے مولانا آزاد پہلی پریس کانفرنس میں (۳۱ جنوری ۱۹۴۷ء)

درمیان وائیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد جرنل کی فیکٹرل ری پبلک

کے صدر کے ساتھ۔ (۱ جولائی ۱۹۵۵ء)

درمیان وائیں۔ مولانا آزاد آئینہ قدیم کے مرکزی مشاورتی

بورڈ کے چیئرمین اجلاس میں تقریر فرما رہے ہیں۔

نیچے۔ مولانا آزاد خود مولانا آزاد کے ساتھ





انصار مری کی پیموشی سڑک ہند



س۔ مولانا آزاد و مشرق قریب ادیر پوری مادک کے خیرنگالی
دور سے پرروانی کے وقت ۱۵.۵.۱۹۵۱ء
س۔ مولانا آزاد و بی کے پام ہوائی است پر شاہ سود کے ساتھ ۲۷/۱۱/۱۹۵۵
مولانا آزاد و استنبول میں۔

مولانا آزاد و کشمیر کے مقام ڈاچی کام میں (بشکریہ ڈاکٹر نازہ باندھ فاروقی)



خواجہ احمد فاروقی

مرد آزاد

دہلی کے دیرینے

۲۲ - فروری ۱۹۵۸ء

برآمدی رنجیدہ

میراجی چاہتا تھا کہ حضرت کو ہندوؤں میں دفن کیا جاتا جہاں چیلے
ہندوؤں کی آرام گاہ ہے جن کا زمانہ میں جواب نہیں، حضرت شاہ ولی اللہ
حضرت شاہ عبدالقادر، حضرت شاہ عبدالرحیم، حضرت شاہ عبدالعزیز
حضرت شاہ ریح الدین، حضرت شاہ محمد اسحاق، لیکن فیصلہ ہوا کہ انکی
لال قلعہ اور جامع مسجد کے درمیان میں دفن کیا جائے۔ سب سے
الگ۔ خاص اٹل میں جگہ۔ یہ فیصلہ سب سے ہی مناسب ہے اس لئے کہ
مولانا مغزوگوں میں سے تھے۔ یا ہم دے دیے ہم۔ فکر و فکر کی عام راہوں میں
وہ کبھی وقت کے معمولی قافلوں کا ساتھ نہ دے سکے۔ ان کی نظر کا پیمانہ ہر جگہ
بلند اور نکلنا میاں ہر جگہ اربند ہی رہا۔ زندگی ہی لائق رشک اور موت ہی
لائق رشک،

شیرم خاک دیکھی ہوئے تربت،

قدن شہادت کز خاک موی خیز

ان کی زندگی، وفاداری و استواری کا کامل نمونہ۔ پراشانی، زور کی عجیب مغزب

مثال۔ ان کا مقصد بلند تھا، اس لئے وفا کا اور جہی بلند تھا۔ اور وفاداری

بھی ایسی وفاداری جیسے قبلہ کی سوئی قبلہ کی سمت ہوا کرتی ہے۔ اس لئے

میں کس طرح کی ذہنی برداشت کیں، کیسی کیسی تکلیفیں اٹھائیں، کیا کیا

سختیاں جھیلیں، نہ پوچھئے

گردنک ہے اب تک بھی بیا باؤں کی

وہ واقعی بے پناہ تھے۔ قطرہ کو گہر پہنچنے تک بہت سی منزلیں طے کرنا پڑتی

اگست ۱۹۵۵ء

قدیمی۔ کیا لکھوں؟ حقیقت یہ ہے کہ اب کچھ لکھنے کو نہیں ہے
وہ منور گدھی میں لاہور کا لکھا ہوا تھا، پاکستان پٹی اور حضرت مولانا رات
کے دو بیچ ساری قوم کو سوگوار چھڑ کر اپنے آقا سے جا ملے۔ رنج، صدمہ، اس
قسم کے سارے الفاظ کمزور معلوم ہوتے ہیں۔ اور دیدہ و دل کی اس حالت کو
بیانی کرنے سے قاصر ہیں جو صبح سے اس وقت تک ان پر گزر چکی ہے۔ کل
پیش حال کے لئے دید و دل پر حاضر تھا۔ صبح سا جیس تھا۔ اچیل خاں صاحب
بلی ڈن لے بیٹھے تھے۔ بلا مبالغہ ہر منٹ پر گھٹی بچی تھی اور یہی سوال ہوتا تھا:
"اب حضرت کا مزاج کیسا ہے؟"

جواب تھا: "وہی حال ہے۔ کوئی افادہ نہیں۔ دعا فرمائیے۔"

جیسے جیسے وقت گزرتا گیا، گفتنی جلد بدلنے لگی اور سوال و جواب مختصر ہوتے
آگے بڑھ رہے تھے،

"حضرت کا مزاج؟"

"وہی، بدستور۔" پھر خاموشی چھا گئی۔ اثناء خاموشی۔ لاکھوں

اومید کا منٹ مگر سانس تک کی آواز نہ تھی۔ ہر شخص کا رخ ہم کنارہ ایڈورڈ

لعل کی طرف تھا۔ سارا ہنرمند پڑا تھا۔ مصافحات کے دنگ لڑنے پڑتے تھے۔ میرٹھ

اور علی گڑھ تفریق کی انگلیاں ہیں دہلی سے عقیدت مندوں کا آنا خوب خیر

ہو رہا ہے، جیو پال، بیٹی، جیلد، یاد اکلکتہ، بے پور، سری نگر، کست

ہندوؤں میں سے تھے۔ تا حد نظر آدھی ہی آدھی تھے۔ ہر شخص ممنوم

ہیں، ان کا کوئی جانشین ہے۔ وہ اس قوطکش کے ساتھ مگر اریں داخل ہو کر رو شمشاد بکھڑا گئے۔ وہ جہاں ہیں، اتہنا ہیں۔

مولانا کی عنایت میں شمشاد نہیں۔ یہیں جو چیز تھے وہ گریا، آتی ہے وہ الہ کی شمیمیت کا حیرت انگیز تناسب اور اس کی دلکش ہمراہی ہے۔ بعض لوگوں کے یہاں بڑی افراط و تفریط ہوتی ہے۔ ان جہاں نقواریں گم ہوئے تو پھر کسی بات کی خبر نہیں۔ اللہ دنیا کی طرف توجہ کی تو میں اسی کے ہو گئے Pascal کو حیرت مئی کہ لوگ عاقبت سے بے خبر ہو کر کچھ شاہد و شہریا سے رامتش و رنگ پور میں موجود ہوتے ہیں۔

(They) Dance and Play the Lute and Sing and Make Verses

ڈی ایچ لارنس کہتا ہے لوگوں کو گرد و پیش کی مسرتوں اور مشکوں سے محسوس کس طرح فرصت مل جاتی ہے کہ وہ داوڑی مسائن پر وقت ضائع کر سکیں یہیں مولانا کے وسیع تخیل میں ان دونوں کے لئے ٹھکانہ نش مئی اور بڑے مجمع تناسیب کے ساتھ انھوں نے اسلام اور ہندوستانی تہذیب سے وہ سب کچھ لیا تھا جو انھیں

یٹا چاہیے تھا۔ طبع ہے کہ انھوں نے انسانیت اور رواداری میں دونوں کی ایک مشترک اساس بھی تلاش کر لی مئی۔ ایک مرتبہ انسانم آرزو دست کے سلسلے میں ایک چینی مقبول پیش کرنے لگے کہ اگر تمہیں ایک سال کا انتظام کرنا ہے تو گھروں ہو، اگر دس سال کا، تو درخت ہو، اور اگر لکڑی کا بندوبست کرنا ہے تو انسان ہو۔ ان کے یہاں سارا ذور انسان اور انسانیت ہی پر ہے، قدیم ترک کی گہرائی اور فطرتی پر ہے۔ یہیں اس میں جدید کی بیداری اور اس کا احساس و شعور بھی شامل ہے۔ انھوں نے اپنے اعجاز عمل سے تاریخ کی تخلیقی زندگی کو مٹا دیا اور ہمیں وہ قدیم دیں جن کی روشنی میں چل کر ہم حیات کے مراتب عالیہ پر فائز ہو سکتے ہیں۔

گویندیس از ہزار سال از مسالم روشن چائے ز آسمان زیر آید
خاقانی از ان جنس و دین دہر مجر پر رہ منشیں کہ کا داواں ویر آید
آپ کا
خواجہ احمد فاروقی

حاصل گزارش

”ہم کو اپنے سفر میں تلخے ہوئے دو سال ہو گئے۔ ہمارا سفر تاریکی میں نہ تھا بلکہ دو پہر کی روشنی میں تھا اور دنیا اُسے دیکھ رہی مئی۔ ہم اگر حرکت میں رہے ہیں تو اس پر پردہ نہیں پڑا ہے اور اگر جمود و قفلت میں کھڑے کے کھڑے رہ گئے ہیں تو وہ بھی کوئی نا نہیں ہے۔ اگر اپنے سفر کا کچھ حصہ طے کر سکے ہیں تو دیکھیں واسے اس کی شہادت دے سکتے ہیں۔ اور اگر راہ کی دشواریوں سے ڈانڈہ رہ گئے ہیں تو بہت کا توڑ لیا اور قدم کی لغزش بھی بھرا ناں ہے۔ متاع باکس نئی مئی اور اپنے سفر کے لئے خود ہی ایک نئی راہ نکالی گئی مئی۔ نہ تو ہمارے سامنے نمونہ تھا اور نہ کوئی رہنمائی کی مادی روشنی۔“

بہ خشک رفت و دامن پر ہیز تر نہ کرد ناں چہ نہ کہ خضر و سکندر و جنو کنند

قوموں اور جماعتوں میں انقلاب و تغیر کی دعوتوں کے نفاذ کا کام ایک ایسا دشوار گزار سفر ہے کہ اگر تمہیں کی بادیہ پیمائی اور رنگ و دو کے فہرست کا ایک قدم بھی طے ہو جاتا ہے تو اس کی کامیابی رشک انیجر اور اُس کی فتح مندی جیش و نشاط کی مستحق ہوتی ہے۔ ایک ٹوٹی ہوئی دیوار کو گرا کر نئی دیوار کے بنانے کے لئے کس قدر سامان اور وقت مطلوب ہوتا ہے۔ پھر ان لوگوں کے لئے تو وقت کا کوئی سوال ہی نہ ہونا چاہیئے جو حقیقتات و اعمال کی ایک پوری آبادی کو بدل دینا چاہتے ہوں۔ اور صرف کسی دیوار اور حجاب ہی کو نہیں بلکہ شہر کی تمام عمارتوں کو از سر نو بنانے کے آرزو مند ہوں۔۔۔۔۔“

(’الہلال‘ جون ۱۹۱۴ء)

تیرے بعد بیادِ ابوالکلام آزاد

تھا جب سلسلہ لطف و عنایت تجھ سے
تینوں کو بھی ملا رنگِ مسلاوت تجھ سے
کسی دلداسے کی جب بھی شکایت تجھ سے
مل گئی چہرہ افسردہ کو رنگت تجھ سے
پائی اک لذت بے حرف و حکایت تجھ سے
اسے کہ باقی مٹی تپ و تابِ محبت تجھ سے
شعلہ عشق سیہ پوش ہوا "تیرے بعد"
وہنداری وہ تری وہ تری گھنار کا ڈھنگ
وہ غمخوش تری امداد لبِ اہلار کا ڈھنگ
بکھلا ہی وہ تری وہ تری رفتار کا ڈھنگ
خلوتِ شب میں وہ تیرے دل بیدار کا ڈھنگ
صبح کے کیف میں وہ فکرِ فسون کا ڈھنگ
تجھانے کی بھاپ سے اٹھتے ہوئے اسرار کا ڈھنگ
ہوئی مستولی انداز و ادا "تیرے بعد"
جیسے یکبارگی غمخیزہ منزل گھو جائے
کوئی زحمت کش ہر جاہِ شکل گھو جائے
جیسے محفل ہو، مگر صاحبِ محفل گھو جائے
چھیڑ میں جلوں کی تاب نگہ و دل گھو جائے
شبِ تار یک ہیں جیسے نہ کامل گھو جائے
سخت طوفان ہو اور دامنِ ساحل گھو جائے
راستہ بھول گئے راہنما تیرے بعد

موم ہو کر تری مٹتی میں رہا آہنِ وقت
ایک مٹی اگر وہ مینا ہو کہ ہو گردِ وقت
مستی راہبرانِ جیب بھی مٹی رہزینِ وقت
ہوشیار نے سنبھالا تری اک کوسنِ وقت
تو کہ تھا سے کدہ وقت میں تروا مٹی وقت
"کون ہوتا ہے حریف سے مرد انگلی" وقت
تھے مگر لبِ ساقی پر مسلا "تیرے بعد"
تیرے خاموش تذکرے، اشارات کہاں
سب میں وہ قوتِ تفسیرِ حالات کہاں
تھایہ معلوم تھی کو کہ گھنی رات کہاں
دل کے آجیادوں سے کھا جاتی ہے خدمات کہاں
نہم ہو سکتی ہے ہر شور و شبِ آفات کہاں
بن کے خورشید، چمک سکے ہیں ذرات کہاں
سرد و تنش کدہ فسر ہو "تیرے بعد"
گو تیرے طرزِ تکلم کا وہ جساد نہ رہا
نواں اب وہ نرا دیدہ ہر سوز نہ رہا
فنسبِ گرم سے پھیلائے جو خوشبو نہ رہا
پھیل ہی جانے کے قابل کوئی آنسو نہ رہا
دل کی تسکین کا باقی کوئی پہلو نہ رہا
وہی ہنگامہ محفل ہے مگر تو نہ رہا
یاد سے آرام سے ہیں اہلِ جفا "تیرے بعد"

ہیں غلط سمت خیالات کے مدار سے اب بھی
 ضد پر ہیں، مجتہد تعلیمات کے مارے اب بھی
 ہیں پس پردہ انطاس مٹا رہے اب بھی
 آندھیاں دیتی ہیں شعلوں کو ہمارے لب بھی
 شریہ آمادہ ہیں کچھ لوگ ہمارے اب بھی
 ہیں وہی برقی سیاست کے نظارے اب بھی
 کس کے گھر جائے گا سیلاب بلا تیرے بعد
 لوگ کہتے تھے تراخو تو راز جن جنسیں
 ادا کرنے ہی دیا شعلہ آواز جنہیں
 سوز دیتی رہی تیری جگہ ناز جنہیں
 نے بخشی تھی نئی قوت پر داز جنہیں
 وہ کہتا ہو شش ربا جبرائیل آواز جنہیں
 تھا ترے رنگ طبیعت سے بڑا ساز جنہیں
 ان کے ناخن ہوئے محتاج حیات تیرے بعد
 یوں تو دیکھے گئے شامل ترے ماتم میں سبھی
 چند دن کا تھا مگر مشغلہ ہمارا دوری
 اب دودھ آہوں کی لحدت ہے، رز وہ لوح گری
 قوم نے لئے تری موت کی وہ قدر نہ کی
 تیرے اخلاص کی دینے کی طرح دانہ ندی
 تخم سے مٹا ہوں کہ امتنا نہیں دنیا میں کوئی
 کہ کر یہ قسبت بہرہ و فسا تیرے بعد

حل کیا وقت کا پیپہ ہے پیپہ سوالی
 حد امکان کے قریب آگیا ہر امر محال
 فیصلوں کو ترے ٹھکرانے، یہ تھی کس کی جلال
 سب نے تجویزوں کو مانا تری بے قیل و قال
 اللہ اللہ تری فکر کا وہ اوج و کمال
 جنہیں گرا ہی منزل سے ہو نیچے کا خیال
 پھوم لیں وہ تراختش کعب یا تیرے بعد
 ہمدانوں میں مسلم ہمدانی تیری
 بھول سکتا نہیں دل، سحر بیانی تیری
 لئے کہ تفسیر ہر اک گچ معانی تیری
 اسے کہ تعریف نہیں کوئی بھی فانی تیری
 بے لثانی سے بھی پیدا ہے لثانی تیری
 وقت و ہوائے گانا حشر کھسانی تیری
 تذکرہ ہو گا بہر حال ترا تیرے بعد
 تیرا کردار مثالی وطنیت کے لئے
 تو نے قدرت کے ہے وار محبت کے شہا
 تو شریعت کے لئے تھا کو امامت کے لئے
 تو قیادت کے لئے تھا کہ سیاست کے لئے
 یہ سمجھنا ہے کشم چشم حقیقت کے لئے
 تیرا ہوتا تھا کسی سخت ضرورت کے لئے
 واز قوم اور وطن پر یہ کھلا تیرے بعد

یہ وطن، تیرا وطن، میرا وطن، سب کا وطن
 یہ چین، تیرا چین، میرا چین، سب کا چین
 یہ ہمارا کی زبان، رقص گونگ و چین
 مینج علم و ادب، مرکز تہذیب و فن
 جس میں پہنچت تھی فکر مرا سوڑ سخی
 ٹانگے والا ہے تاروں کو سب پر اسی
 چھ نمبر سے۔ کہ ہو جائے گا کیا، تیرے بعد

مولانا آزاد کی شخصیت

”آئندہ ابوالکلام آزاد“ کی روشنی میں

یہ تو فائدہ ہوتا ہے کہ ان کا تباری ان سے مولانا کی شخصیت کے بارے میں عجائب و لطائف سنے کا موقع نہیں رہتا لیکن یہ نقصان بھی ہوتا ہے کہ خود ان کے ذہن میں تردد و متذبذب پیدا ہو جاتا ہے جس کا اثر ان کے کام پر بھی پڑتا ہے۔

قاضی عبدالغفار نے مولانا آزاد کی شخصیت کے جس پہلو پر سب سے زیادہ زور دیا ہے وہ ان کی ”انفرادیت“ ہے۔ وہ خود لکھتے ہیں: ”جب میں نے یہ مطالعہ شروع کیا تو میرے اس تجربے کا موضوع نہ تو مولانا کی شخصی زندگی کے معمولات تھے، نہ ان کی خانہ دانی یا ذاتی عظمت تھی نہ ان کی سیاسی زندگی کے کارنامے تھے۔ نہ ان کا مجتہدانہ علم و فضل تھا۔ بلکہ میری فکر و نظر کا مرکز صرف ان کی مخصوص ”انفرادیت“ تھی جس کے نقش و نگار ان کی قویوں میں نمایاں ہوتے ہیں۔“ مولانا کی اس ”انفرادیت“ میں سب سے زیادہ جگہ ان کی ”غیر معمولی“ جنینیت کا ہے جس کے بارے میں قاضی عبدالغفار کی رائے ہے: ”جب مولانا دنیا کے سامنے آئے تو وہ اپنے ساتھ علم و فضل اور تقدس کی معایات ہی نہیں لائے بلکہ ایک طاقت و جہتیں کی بے پناہ قوت اختیار ہوئی سے کرتے ہیں نے انھیں آباؤ اجداد کے حلقہ افکار کے باہر بہت سی نئی راہیں دکھائیں اور دنیا کو ایک ایسی زبردست ”انفرادیت“ سے آشنا کیا جیسی کہیں سے اس تک میں پیدا نہ ہوئی تھی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا کی جنینیت نے ان کی ”انفرادیت“ کو جنم دیا اور ان کی ”انفرادیت“ نے ایک طرف ان کی شخصیت

مولانا آزاد کی شخصیت جتنی عظیم تھی اس اعتبار سے ان پر بہت کم لکھا گیا ہے اور جتنا لکھا گیا ہے اس میں بھی اکثر کے بارے میں یہ کہنا دشوار ہے کہ اس نے ان کی عظمت کے ساتھ کس حد تک انصاف کیا ہے۔ انگریزی میں مہا دویشائی کی کتاب اور اردو میں قاضی عبدالغفار کی ”آئندہ ابوالکلام آزاد“ شاید اس وقت تک اس معیار پر سب سے زیادہ پوری اترتی ہیں۔ قاضی عبدالغفار سے اردو ادب کے طالب علم پر حیثیت ایک انشا پرداز، صحافی، طنز نگار اور سوانح نویس کے اچھی طرح واقف ہیں۔ اور حیثیتوں سے قطع نظر سوانح نگار کی حیثیت سے ”آئندہ ابوالکلام آزاد“ کی ترتیب کے بعد ان کا پایہ ہمارے سوانحی ادب میں خاصہ بلند تسلیم کر لیا گیا ہے۔ انھیں دوسروں کے مقابلے میں مولانا آزاد سے قرب بھی زیادہ حاصل رہا۔ اس نے ان کی نظر حضرت مولانا کے ذہن کے پوشیدہ گوشوں تک زیادہ پہنچ سکی۔ آج کی صحبت میں یہ دیکھنا ہے کہ قاضی عبدالغفار اپنی اس کوشش میں کہاں تک کامیاب رہے ہیں کہ ہیں ان پوشیدہ گوشوں کی جھلکیاں دکھائیں اور حضرت مولانا کی عظمت کے ساتھ انصاف کر سکیں۔

قاضی عبدالغفار نے شروع ہی میں یہ اعتراف کیا ہے کہ کسی بڑی شخصیت کی خصوصیات کا صحیح افہام کرنا بہت مشکل کام ہے اور اس سے بھی زیادہ مشکل یہ ہے کہ غلط اندازہ کرنے کے اندیشے کو دل سے نکال دیا جائے۔ وہ خود یہ اندیشہ پہلے دل سے دور نہیں کر سکے ہیں۔ وہ مولانا آزاد کو ایک ”بہت مشکل انسانی“ سمجھتے ہیں اور ان اعترافات کے بعد اپنے کام کی ابتدا کرتے ہیں۔ اس سے

میں وہ محسوس اور عظمت پیدا کر دی جس کی اس ملک کی حالیہ تاریخ میں سوائے ڈاکٹر مایند ناتھ ٹیکور کے کوئی دوسری مثال نہیں ملتی اور دوسری طرف اُن کے فلم سے ایسے جواہر بریزے نکلائے جنہوں نے اردو زبان کو امر کر دیا۔

قاضی عبدالغفار نے مولانا آزاد کی "انفرادیت" کو اُن کے ادب میں جا بجا تلاش کرنے کی کوشش کی ہے اور جہاں کہیں اُس کا سراغ پایا ہے۔ بڑے ماہرانہ انداز میں نقاب کشائی کی ہے۔ مولانا سب سے زیادہ "غبارِ خاطر" میں گھل گھلے ہوئے ہیں اور وہ بھی اس لئے کہ یہ خطوط اشاعت کے لئے نہیں لکھے گئے تھے بلکہ ان کا مقصد خود اپنی طبیعت کا بارہلکا کرنا اور اپنے عجیب و غریب اور "صدیقی کرم" سے "ہم کلامی" اور غفلت کی خوش وقتی حاصل کرنا تھا۔ چنانچہ قاضی صاحب نے بھی مولانا کی شخصیت کو سمجھنے میں سب سے زیادہ مدد فراہم ہی سے لی ہے۔

اس میں شبہ نہیں ہے کہ جب یہاں پر عرض کیا جا چکا ہے مولانا کی انفرادیت نے اُن کی شخصیت میں بڑا حسن اور عظمت پیدا کر دی لیکن اس میں بھی تشبہ نہیں ہے کہ اس "انفرادیت" ہی کی بدولت اُن کے اور عوام کے درمیان ایک ایسی آہنی دیوار کھڑی ہو گئی جو ایک سیاسی کارکن اور قومی رہنما کے منصب سے میل نہیں کھاتی اور جس نے انہیں ہندوستان کی عوامی زندگی میں گاندھی اور برہنہلال یا محمد علی اور عبدالغفار خاں نہیں بننے دیا۔ اس سلسلے میں قاضی عبدالغفار لکھتے ہیں: "اُن کی انفرادیت عوام کی نفسیاتی سطح سے اس قدر بلند ہے کہ کوئی عام پیمانے سے ناپ تولی نہیں سکتا۔۔۔ مولانا کی یہ نفسیاتی کیفیت جس کا خود انہوں نے "غبارِ خاطر" کے مکتوبات میں بہت بلیغ اشاروں کے اندر ذکر فرمایا ہے۔ اُن کے اور عوام کے درمیان ایک آہنی دیوار بن گئی ہے؟ کوئی جانتا ہے کہ اگر یہ آہنی دیوار نہ بن گئی ہوتی تو آج ہندوستان، خصوصاً ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ کس طرح مرتب ہوتی ہوتی۔

قاضی عبدالغفار نے مولانا آزاد کی اس "انفرادیت" اور تنہائی پسندی کی توجیہ نگاریاں محسوس کی ہیں۔ اس معاملے میں انہیں مولانا کے شریکِ حال حکیم اجمیر خاں جن کے بارے میں قاضی صاحب کی تصنیف "حیاتِ اجمیر" شائع ہو چکی ہے، نظر آتے ہیں۔ اُن کا دعویٰ ہے کہ انہیں حکیم صاحب مرحوم کی تشویش کے مطالعہ کا کافی موقع ملا تھا۔ اور اس لئے انہوں نے ایک ایسی سبکی کی کیفیت کو پہچاننے کے لئے اشارے پائے تھے: "لیکن وہ مولانا کے اس

تقدیرِ کبھی نہیں پہنچ سکے اور اُس نے اُن کی فطرت کے تقاضوں کو اُن کی تحریروں ہی میں تلاش کرنا فردی ہو گیا۔ غالباً اُس کی اصل وجہ یہ ہے کہ ایک اجمیر خاں کی شخصیت اتنی "شکل" نہیں تھی جتنی مولانا آزاد کی تھی۔

اس مرحلے پر قاضی عبدالغفار مولانا آزاد کی فطرت کے "نگین" احساس پر مزید روشنی ڈالنے سے قاصر رہتے ہیں، اور ہمیں یہ نہیں بتاتے کہ آخر اس "نگین" کا اصل سبب کیا ہے۔ صرف "فطرت کا کمال" ہی تو اس کا واحد سبب قرار نہیں دیا جاسکتا۔ پھر بھی آثار کے مطالعہ سے ہمیں یہ ضرور معلوم ہو جاتا ہے کہ جس طرح مولانا آزاد کی شخصیت عروج و زوال کا تجربہ اُن کی شخصی اور سیاسی زندگی کے واردات اپنے اندر چمکنا کے لئے بڑا سرمایہ جرت رکھتے ہیں۔ اُن کی پیدائش ایک خاص مشرقی بلکہ موریانہ گھرانے میں ہوتی ہے۔ انہیں تعلیم وہ ملتی ہے جو سوائے تنگ نظری اور خود بینی کے دوسرا کوئی سبق نہیں پڑھا سکتی چوں کہ وہ مشائخ کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اس لئے اُن کے گرد عقیدت مندوں اور اداوت کشوں کا ایسا جھوم رہتا ہے جو اُن کے ہاتھ پیر کر آنگھوں سے لگاتا ہے اور اُن کی طرف پیڑھے لکھنا عذابِ الہی کا مستوجب سمجھتا ہے۔ ان حالات اور ایسے ماحول میں انہیں جو کچھ بننا چاہئے تھا اُس کے بالکل برعکس وہ زندگی کے ابتدائی دور ہی سے وسیع انٹروی اور خدمتِ خلق کے محکمہ کو اپناتے ہیں اور عیش و آرام کی زندگی چھوڑ کر انتظامیہ وطن کی تحریک میں تین سو سے شریک ہو جاتے ہیں۔ یہاں انہیں ایک اور ہی نقشہ نظر آتا ہے۔ آزاد کی ہند کی جدوجہد میں برادرانِ وطن تو بڑے بڑے حوکر حقتہ سے رہے ہیں لیکن مسلمانوں میں حیثیتِ انہیں اُس سے الگ ہیں اور مرستہ اور اُن کے حاشیوں کے بستے بھٹے راستے ہی پر چلنا باعثِ خجالت سمجھے جاتے ہیں۔ یہ دیکھ کر اُن کے جذبات کو شدید طبعیت بنتی ہے اور وہ فلم کو خونِ دل میں ڈبو کر اُس سے مسلمانوں کے خوابیدہ احساس کو بیدار کرنے کا کام لیتے ہیں۔ وہ جو کچھ اور جس انداز سے لکھتے ہیں۔ اُس سے ایک طرف تو عام مسلمانوں میں بیداری کی ہر دوڑ جاتی ہے لیکن دوسری طرف بوڑھے رہنماؤں کی پیشانیاں بھی تسکین آلود ہو جاتی ہیں اور جیگر کی حکومت کے اشارے پر اُن کے خلاف بہتان تراشی اور ان ام آفرینی کا طوفان کھڑا کر دیا جاتا ہے۔ مگر وہ اُس کی دھار پر انہیں کرتے اور ایسے کام میں مشغول رہتے ہیں ان کے لئے وہ دقت البتہ بہت سخت ہو چکی ہے جب اس ملک میں ہندو دہشت گردانہ دہشت گردانہ اور فساد گردانہ دہشت گردانہ

کلاؤ کا رہ کر یا ہم دیگر وہ مریاں ہو جاتے ہیں اور ملک کی آزادی اور اتحاد کا بولنے والے
نے اپنے ذہنی عمل اور حیات گزارے بنایا تھا وہ بگڑا ہوا نظر آتا ہے۔ اسی پر یہ نہیں کہتی
بلکہ ملک کے فرقہ پرست عناصر ہندوستانی عوام اور خصوصاً مسلمانوں کے
مقابلہ اعظم "کے دلوں میں اُن کے خلاف بے سرو پا شکوک پیدا کرنے کی کوشش
کرتے ہیں یہاں تک کہ ایک وقت ایسا آ جاتا ہے جب کہ وہ لوگ جن کی خدمت
اور رہنمائی کی خاطر انھوں نے طرح طرح کی اذیتیں برداشت کی تھیں
اور قسم قسم کے الزامات اٹھائے تھے اُن سے واقعی بدظنی ہو جاتے ہیں اور
اُن کے بر قول اور فعل کو شیعہ کی نظر سے دیکھنے لگتے ہیں بلکہ اس سے بھی بڑھ
کر یہ اُن کے پیچھے نثار پڑھنے سے انکار کر دیتے ہیں اور اُن کی شان میں کسی
گستاخی اور ہندوئی سے باز نہیں آتے۔ اس کے جواب میں وہ یہ تو نہیں کرتے
کہ اپنے مخالفوں پر کچھ اچھا لیں اور اُن کی بُرائی کا بدلہ بُرائی سے دیں اس سلسلے
کے یہ اُن کی شان اور شخصی عظمت کے منافی ہے لیکن یہ ضرور کرتے ہیں
کہ ایک گنبد کے اندر جس کا کوئی دروازہ نہیں ہے راوڑا گرہ تو کوئی پور
دروازہ ہے!) اپنے وجود منسوی کو بند "کر بیٹھتے ہیں اور دنیا والوں کی نظروں
سے اتنے مُردہ ہو جاتے ہیں کہ اُن کے سوا سوا اس کے چارہ کار نہیں رہتا کہ
"اُن کی عظمت کے تقاضوں کو اُن کی تزیینوں ہی میں تلاش "کرنے کی کوشش
کرمی بظاہر ہے کہ اس کا اثر مولانا کی تزیینوں پر بھی پڑتا ہے اور اُن کی عظمت
کا منظمی احساس "ہے اُن کے ہم وطنوں اور ہم مذہبوں کے طرز عمل سے بہت
تقویت پڑتی ہے۔ اُن کے ادب میں ایک ایسی انفرادیت اور گمان پیدا کر
دیتا ہے جس کا دوسرے ادیبوں کے ہاں سرور لگاتا آسان نہیں ہے مولانا
نے قیاب خاطر "کے اسباق میں اپنے آرٹ کے بنیادی عناصر کی نشان دہی فرما
دی ہے۔ وہ "انانی ادب "کی اصطلاح میں اپنے ادب کی عظمت کو نام زد
فرماتے ہیں۔ مولانا نے "انانی ادب "کے مسئلے میں دنیا کے مختلف نامور
ادیبوں کا تذکرہ فرمایا ہے۔ لیکن واقعہ ہے کہ اس فہرست میں خود مولانا کا
نام بھی کافی اُونچے مقام پر جگہ پانے کا مستحق ہے۔ اور اردو ادب میں تو مولانا
قاضی عبدالغفار کوئی دوسرا ادیب ایسا نظر نہیں آتا جس نے اس شدت کے
ساتھ اپنی انفرادیت کے تازیانے عوام کی ذہنیت پر مارے ہوں۔ مصری
زبانوں کے "انانی ادب "کو سمجھنے میں بھی ہمیں سب سے زیادہ مدد مولانا
ہی کی تزیینوں سے ملتی ہے۔ جیسا کہ قاضی صاحب کا خیال ہے کہ انانی ادب

کے انحصار خاص الجیسے افراد ہوتے ہیں جس کا ادب عام عوام میں تو نہیں
جاسکتا اور جن کو ادب و تعریف کے عام کلیات پکڑ نہیں سکتے۔۔۔۔۔ اس
اشناسے کو مولانا کا ادب سامنے رکھ کر سمجھ لینا کچھ ایسا دشوار تو نہیں ہے
مولانا کے ادب کی اس شارح کے مطالعہ سے ہمارے ذہن میں جس شخصیت
کا نقش ابھرتا ہے اُس کے سب سے نمایاں اجزاء اسے ترکیبی قاضی عبدالغفار
کے الفاظ میں خود داری، انانیت، انفرادیت، کم آمیزی اور احساس ترقی
ہیں۔ "جو عقلیت اور Intellect کا ایک طبقاتی امتیاز ہے۔"
یہ خود داری اور کم آمیزی "مولانا کی شخصیت میں جو جادو جگا دیتی ہے اُس
کی طرف مضمون کے شروع میں اشارہ کیا جا چکا ہے۔ لیکن یہاں سب سے
اہم سوال یہ ہے کہ اس خود داری اور کم آمیزی کی بدولت ہم نے کھویا کیا
اور پائی کیا؟ اس میں شبہ نہیں ہے کہ ہمیں ایک اول درجے کی "جینس" میٹر
آگئی، خود مولانا کو اس سے یہ فائدہ ہوا کہ وہ عوام کی غلط فہمیوں اور بدگمانیوں
کی زد سے بہت دور نکل گئے۔" لیکن ساتھ ہی ہم نے ایک ایسا عظیم سیاسی
رہ نمائندہ دیا جو اگر اس درجہ خود داری اور کم آمیزی "نہ ہوتا تو اُس کا مقام
کسی طرح گاندھی جی سے کم نہ ہوتا۔ افسوس ہے کہ مسئلے کے پہلو سے قاضی
عبدالغفار نے بحث نہیں کی ہے۔

مولانا آناؤ کی انفرادیت کے نمایاں ہونے کا ایک اور موقع بھی یاد
پانا آتا ہے اور وہ ہے اُن کے مخالفوں کے ساتھ اُن کا برتاؤ۔ جیسا کہ عرض
کیا جا چکا ہے۔ مولانا کے مخالفوں نے انھیں عوام کی نظر سے گرانے کے سلسلے
بڑے بڑے جتن کئے اور طرح طرح کے نام دھرے۔ لیکن مولانا نے کبھی اپنی
زبان یا قلم کو اُن کی مخالفت سے آلودہ نہیں ہونے دیا بلکہ اُن کے اعتراضات
اور الزامات کا جواب دینا بھی اپنے لئے کسر نشان ہی سمجھا۔ اس ملک کی سیاسی زندگی
کی عام اخلاقی سطح کو بلند کرنے میں مولانا نے جتنا بڑا کام کیا ہے اُس میں اُن
کے ساتھ دوسرا نام گاندھی جی کا لیا جاسکتا ہے۔ اس عارفانہ یک سوئی کے
منظاہر سے جس اُن کی انفرادیت اُن کے بہت کام آئی۔ قاضی عبدالغفار لکھتے ہیں
"اس لئے اور خیالات کو وہ ایسی بلندی سے دیکھتے رہے اور عام مباحث میں اُلجھنے
کو انھوں نے اپنے شخصی وقار کے اس قدر متاثر کیا کہ ایسے مسائل میں فکر
اور تصورات کا ضبط ایک سنجیدہ خاموشی اُن کے علم و فہم کی ایک ضروری
شرط قرار پائی۔" مولانا آناؤ کی طرح قاضی عبدالغفار بھی فرقہ واریت کے بہت

بڑے دشمن ہیں اور اس لئے یہاں کہیں ان کا قلم مولانا کے مسلم فرقہ پرستوں سے تصادم کی نشانی دلاتا ہے وہاں اُس میں بڑی جان آجاتی ہے اور وہ بہت دل فریب گل ہڈے کھلانے لگ جاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں: "مولانا کی شخصی اور منوی عزم و استقامت کا امتحان حکومت کے جبر و استبداد کی سونپ پر کوئی اتنا بڑا امتحان نہ تھا کہ وہ آزمائش تھی جس میں مولانا اُس وقت جیتتا ہوئے جب ہندو مسلم اتحاد کا دور گزر چکا، وہ تیسرا ایک دور ہے سماج پر گئی امداد ایک دور ہے حکومت نے فرقہ واریت و تعصبات کی آگ روشن کر دی..... بہت سے بلند آہنگ لیڈر تھے جو اس امتحان میں پورے ڈاکٹر کے، لیکن مولانا خود اپنی قوم کے ہاتھوں (جب وہ گمراہ ہو چکی تھی) سب کچھ جمیل لگے۔ برطانوی حکومت کا فساد ہی پھر ان کے وجود منوی کو اس قدر بردہ سمی نہ کر سکا۔ جتنے زخم خود ان کی گمراہ قوم نے ان کے دل و دماغ پر لگائے۔ مگر انھوں نے ان تمام براحتوں کو شکوہ و شکایت کا ایک حرف بھی زبان پر لائے بغیر گواہ کر دیا.....

... مولانا کی اس استقامت میں بہت کچھ دخل ان کی نئی ذاتی کیفیت کو بھی تھا۔ اپنی نئی ذاتی خلوت میں انھوں نے اپنے سے کم دوسرے کی مخلوق سے شکوہ و شکایت کرنے کی ادنیٰ سطر پر جانا اپنے ذہنی مقام کی توہین سمجھا..... اُس

اساں خودی اور علم و فضل کی اُس انانیت نے جو مولانا کے کردار کی بنیاد ہے ان کو ہمیشہ راہ و رسم عام سے علاحدہ رکھا اور یہی وجہ ہے کہ ان کی ایک پرتکلیب و فیور، خاموشی تھی تنہا ان پر دشمنوں کا مقابلہ کر سکی جو سال ہا سال ہر قدم پر ان کا راستہ روکتی تھیں..... مولانا ہمیشہ رپ سے زیادہ اُعلیٰ عملوں کی زد پر رہے جو ایک سے اختلاف رکھنے والے مسلمانوں پر کئے جاتے تھے..... جب تک ان کی تحریک آبادی کے دوران میں خدا اور رسول کے نام سے کرسم یگ کے نظریات کو جاہل مسلمانوں کے دلوں میں بٹھایا گیا اور ایک خود غرض اور ناقابل اثر قیادت نے جہاد کے جذبات کو آگاہ کر دیا کہ عقل و فہم کے تمام راستے بن ہو گئے تو اُس زمانے میں مولانا کے ساتھ جو برتاؤ کیا گیا وہ سب کو معدوم ہے "قائد اعظم انھیں شوقیہ تھے" کا خطاب دیا فرمایا..... جتنی گالیاں انھیں دی گئیں شاید ہی ہندو کے کسی دوسرے لیڈر کے حصے میں آئی ہوں... اور یہ سب ایک ایسا امتحان تھا جس سے مولانا اپنی پیشانی پر ایک شکوہ ڈالے بغیر گزرے۔ اس سلسلے میں میں نے اتنے طویل اقتباسات اس لئے دیئے ہیں کہ قاضی عبدالغفار کی طرح برائی یہ خیال ہے کہ مولانا آزاد کی شخصیت اور اُس کے پس منظر کو سمجھنے کے لئے

سب سے اہم ان کی زندگی کے اُسی پہلو کا مطالعہ ہے، جہاں ان کا تصادم مسلمانوں کی فرقہ وارانہ سیاست سے ہوا۔ بیرونیوں کے ہاتھ سے تلوار کے زخم کی گہرائی دل و دماغ کی وہ کیفیت نہیں ہوتی جو انہوں کی زبان سے نکلا ہوا ایک تلخ لفظ کر دیتا ہے۔ آدمی جب یہ سمجھے کہ ہم جن کی جھڑپ کے لئے کام کر رہے ہیں وہی ہماری جان کے دشمن بنے ہوئے ہیں اور اُن کے بعد کانے والے وہ لوگ ہیں جن کی ساری زندگی اول تو غیر ملکی حکومت کی کاسہ بیسی میں گوری ہے اور نہ کم از کم ذاتی حافیت کو کسی کی خاطر قومی زندگی کی ہمہ جہی اور نشیب و فراز سے تو ضرور ہی کنارہ کش رہے ہیں تو دل و دماغ پر جو بھی زکور جائے کم ہے لیکن ان حالات میں بھی ایک طرف خدمتِ خلق میں بدستور مصروف رہنا امداد و مری طرف اپنے زبان و قلم کو مخالفت کی آواز کی طرح نہ مرنے دینا اتنا بڑا کام جس کی کشمکش میں تاریخ نے انھیں ڈھونڈے سے دوچار ہی کر سکتی ہیں اور یہ کام کوئی ایسا شخص ہی انجام دے سکتا ہے جس کی انفرادیت نے اسے عام سطح سے بہت بلند بالا مقام پر پہنچ کر پہنچا۔

زندگی کے سفر میں طرح طرح کی رکاوٹیں اور قسم قسم کے نشیب و فراز آتے ہیں جن سے انسان کو گزرنا پڑتا ہے اور پھر زندگی جتنی اعلیٰ اور با مقصد ہوتی ہے، اتنی ہی اُس کی راہ میں رکاوٹیں بھی زیادہ آتی ہیں۔ ان رکاوٹوں سے کام لے کر ان کے لئے کے لئے انسان کو جو جدوجہد کرنی پڑتی ہے وہ اُس کی شخصیت میں کچھ ایسے عناصر کو اجاگر کر دیتی ہے جنہیں تضاد کا نام دیا جاسکتا ہے۔ لیکن زندگی کا یہ تضاد اُس میں ایک خاص قسم کی جاویدیت اور کشش پیدا کر دیتا ہے اور اسے ایک ایسا "انسانی رنگ" Human Touch دے دیتا ہے۔

جس سے وہ بصورت دیگر محروم ہی رہتا۔ مولانا آزاد نے "غبارِ خاطر" کا ایک خط لکھا اور نگ زیب کا ایک واقعہ لکھا ہے کہ یہ "لوہے اور پتھر کا انسان" جب ایک سببی اور بے ہاک راک کی سے متصادم ہوا تو اُس کا اس درجہ اثر قبول کیا کہ اُس کے ہاتھوں اپنی سب سے عزیز متاع یعنی دین و ایمان فروخت کرنے کو تیار ہو گیا۔ ہم اب نگ زیب اور نگ زیب کو ایک سادگی پسند اور باوقار بادشاہ، بہادر وادہ ہوشیار سپہ سالار اور سخت گیر اور بے پیک انسان کی حیثیت سے جانتے آئے ہیں۔ اس لئے جب ہماری نظر کے سامنے اُس کی زندگی کا یہ تضاد آتا ہے تو ہمیں حیرت و غور ہوتی ہے لیکن ساتھ ہی ہمارے لئے اُس کی شخصیت میں ایک ایسا روشن اور دلربا بھی پیدا ہو جاتی ہے جس سے وہ اب تک قطعاً محروم تھا۔ قاضی عبدالغفار نے بھی مولانا آزاد کی شخصیت کے "تضاد" کا تذکرہ

کھایا ہے اور بتایا ہے کہ "منفرد عناصر کے تعادم سننے اُسے کس طرح متحرک
Dynamic بناتا تھا۔ وہ مولانا کی زندگی کے ان تعادم
 عناصر کا سراغ خود اُن کی تحریروں میں لگاتے ہیں۔ پٹناں چھ لکھتے ہیں: "مولانا اپنی
 قوت کے تعادمات کو شاعرانہ اور فلسفیانہ انداز میں بار بار بیان فرماتے ہیں
 مفہم غلطی کے ایک مکتوب میں پہلے تو آتش دہلی سے اپنی طبیعت کے لگاؤ کا ذکر
 کرتے ہیں اور پھر اپنے پیرا کی کے شوق کو..... سامنے لاتے ہیں۔ "اگے میں
 کروہ یہ بھی واضح کر دیتے ہیں کہ مولانا اپنی فطرت کے اجتماعات کی وضاحت
 کیوں فروری خیال فرماتے تھے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ "مولانا کے اندر یہ احساس
 موجود ہے کہ عوام اُن کی زندگی کے تفاوت سے بے خبر نہیں ہیں اور بعض
 اوقات جب ایسی کوئی واردات پیش آجاتی ہے جس سے تضاد ظاہر ہوتا
 ہے تو وہ گم سوچنے لگتے ہیں کہ ایک ہی طبیعت کے یہ دو رخ کیوں کر ممکن
 ہوئے۔ مولانا اپنے شاعرانہ انداز میں اس تضاد کی تصریح فرماتے ہیں اور
 اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ یہاں اوقات مسلح کے اوپر جو کچھ ہوتا ہے
 اس سے بالکل مختلف بہت کچھ مسلح کے نیچے ہوتا ہے۔ مولانا کی شخصیت کے اس
 تضاد پر بھی اُن کی بے پناہ "انفرادیت" کی چھاپ پوری طرح لگی ہوئی ہے
 اس سلسلے میں قاضی صاحب رقم طراز ہیں: "زندگی کے حقائق کو وہ بار
 بار اپنے ہی رنگ میں اس طرح بیان فرماتے ہیں کہ ہر چار سطروں کے بعد
 ایک شعر اُن کی بے پناہ ادبے محابا انفرادیت کا آئینہ دار ہوتا ہے۔... مولانا
 نے اپنی زندگی کے ایک خاص اسلوب کا جو معیار اور زاویہ قائم کر دیا ہے
 وہ کسی متوازن نہیں ہوتا۔ نہ اُن کی غلطوں میں اور نہ سیاسی مشاغل کی جلوت
 میں۔"

انسان کے لئے حد سے زیادہ خوشی اور حد سے زیادہ رنج کے مواقع
 ایسے ہوتے ہیں جب اس کا توازن ذہنی قائم نہیں رہتا اور وہ اپنی انفرادیت
 کو باقی نہیں رکھ پاتا لیکن مولانا آداس آزمائش سے بھی پوری طرح کامیاب
 گزرتے ہیں۔ قلم انداز کی نظر بندی کے دوران میں انھیں اپنی بیگم صاحبہ
 کی شدید علالت کی اطلاع پہنچتی ہے اور اُن سے کہا جاتا ہے کہ اگر وہ حکومت
 برطانیہ سے درخواست کریں تو انھیں بیگم صاحبہ کی تیار دہلی کے لئے رہا
 کیا جاسکتا ہے لیکن اُن کی خود دہلی انھیں اس کی اجازت نہیں دیتی اور
 باوجود اسے کہ وہ بیگم صاحبہ کو دیکھنے کے لئے بہت بے تاب ہیں مگر فیملی

حکومت سے اس قسم کی درخواست کرنا مناسب نہیں سمجھتے اور قلب و جگر
 پر جو کچھ گزرتا ہے اُسے برداشت فرماتے ہیں اور اس طرح برداشت فرماتے
 ہیں کہ روزمرہ کے معمولات میں ذرا فرق نہیں آئے دیتے یہاں تک کہ جیل
 کے ساتھیوں کو بھی وجہ ہیں اُن کے بعض ایسے قریبی دوست شامل ہیں
 جیسے پنڈت بھارل نہرو، امرا آصف علی اور ڈاکٹر سید محمود، حقیقی واردات
 قلب سے آتشکار پائنت نہیں فرماتے، البتہ ایک "غائب از نظر" ہم نشین دل
 کے نام ان واردات کو صغیر قسط پر درگزر کرتے جاتے ہیں اور وہ
 بھی غالباً اس سلسلے کے ان مکتوبات کے مکتوب البتہ تسبیح کا پورا یقین
 نہیں ہے۔ اُس زمانے میں مولانا کے عموں کے عموں کے عموں اور انھیں اپنی
 انفرادیت کو قائم رکھنے میں کیا کیا جتن کرنے پڑے۔ اس کا حال خود مولانا کے
 الفاظ میں ملاحظہ فرمائیے۔ "اس زمانے میں میرے دل و دماغ کا جو حال رہا
 میں اُسے چھپاتا نہیں چاہتا، میری کوشش تھی کہ اس صورتِ حالی کو پورے
 صبر و سکون کے ساتھ برداشت کروں۔ اس میں میرا ظاہر کامیاب ہوا لیکن باطنی
 نہ ہو سکا۔ میں نے عموں کو اپنا دماغ اپنا دل و دماغ آواز دہاؤں کا وہی پارٹ
 کھیلنے لگا ہے جو احساسات اور انفعالات کے ہر گوشے میں ہم کھیل کر رہے ہیں
 اور اپنے ظاہر کو باطن کی طرح نہیں بننے دیتے..... قرا و سکون کی یہ جو کچھ
 نمائش تھی، تم و صوموت کی تھی، قلب و باطن کی تھی۔ ہم کو میں نے ہلنے سے
 بچا لیا مگر دل کو نہیں بچا سکا۔" بہر حال جو وقت آتا تھا اگر رہا خیر بدش کی
 مولانا کی جو کیفیت ہوئی ہوگی وہ تو ظاہر ہی ہے لیکن اُن کی انفرادیت و اس
 جاں نسل موقع پر بھی کس طرح سرفراز رہی اُس کا حال منظر: "سب سے پہلے یہ
 کوشش کرنی پڑی کہ یہاں زندگی کے جو معمولات ٹھہرائے جاچکے ہیں اُن میں ذرا
 نہ آنے پائے۔... ہوں کہ زندگی کے معمولات میں وقت کی پابندی کامیابوں کے
 حساب سے پابند ہو گیا ہوں اس لئے یہاں بھی اوقات کی پابندی کی رسم قائم
 ہو گئی اور تمام ساتھیوں کو بھی اُس کا ساتھ دینا پڑا۔... یہ سب کچھ بدستور
 ہوتا رہا۔ یہاں یہ خیال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ کم از کم اس موقع پر مولانا کی انفرادیت
 میں آمد Spontaneity باقی نہیں رہی، بلکہ اُسے قائم رکھنے
 اور بروئے کار لانے کے لئے انھیں خاص طور پر جدوجہد کرنی پڑی اور اسی
 کا دوسرا نام تعصّب اور بناوٹ ہے۔ اس طرف قاضی صاحب انظار نے بھی اشارہ
 کیا ہے وہ لکھتے ہیں: "منبط و تحمل بھی ایسی انفرادیت کے سرفراز قرار دی گویا

ایک بناوٹ ہے۔۔۔۔۔ اس بناوٹ کو وہ تسلیم کرتے ہیں کہ انھوں نے اس موقع پر اپنے خطاب کو بالخصوص سے متاثر نہ ہونے دیا۔ اس واقعہ سے مولانا کی عظمت کم نہیں ہوتی، براہِ حق ہے۔ فطرت کے تعین اور بناوٹ کی اس طرح نقاب کشائی کے ایک بڑے آدمی ہی کا کام ہو سکتا ہے۔ ہر کہہ دہم! اس کی جرأت کیسے کر سکتا ہے۔

مولانا آزاد کی انفرادیت نے انھیں جیسے سیاست اور ادب میں ایسے ہی مذہب میں شامراجہ عام سے ہٹ کر اپنا راستہ بنانے پر مجبور کیا۔ جیسا کہ گھسا، جاچکا ہے وہ ایک علمی اور مذہبی مخالف دوسے کے چشم و چراغ تھے اور اس لحاظ سے اُن کی کٹھنی میں پڑا تھا لیکن ورثے میں انھیں مذہب کا جو تصور ملا تھا وہ بہت جامد اور بے روح تھا، وہی تقلیدی اور آبائی مذہب جو ہم میں سے اکثر لوگوں کے حلقے میں آتا ہے۔ لیکن مولانا اس پر کیسے قانع رہ سکتے تھے! زندگی کے ابتدائی دور ہی میں اُن کے دل میں شکاک کا لاشٹا چمبھا اور اُس کی غلش اتنی بڑھی کہ اُس نے انھیں الحاد اور بے دینی کی سرحد تک پہنچا دیا، مگر مولانا قدرت سے ملحق سلیم اور فکر رسا ہے کر آئے تھے اس لحاظ سے اُن کے قدم پیاں رگ نہیں گئے بلکہ جلد ہی وہ اس مقام پر پہنچ گئے جو مذہب کا اصلی مقصد ہے۔ جس میں دوسرے رگ زندگی کا سفر شروع کرتے ہیں۔ اُس عمر میں مولانا سفر کی تنگائی دور کر رہے تھے۔ قاضی عبدالغفار نے مولانا کے مذہبی عقائد سے خامی لہریا بحث کی ہے لیکن چوں کہ وہ ہمارے موضوع سے خارج ہے اس لحاظ سے اس کے بارے میں زیادہ لکھنا نہیں چاہتے، البتہ آتنا ضرور عرض کریں گے کہ مولانا کی انفرادیت ہی کا گارنٹر ہے کہ وہ مذہب اسلام کو عورتوں کی ترقی، موسیقی کے ذوق، اجماع و حریت، تنقید قوم کی تکمیل اور غیر مسلم موجدین کی خدمات کی راہ میں حائل نہیں سمجھتے تھے۔ اگرچہ اپنے ان عقائد کے انہار میں انھیں ایک طرف بچے اور عامے والے بزرگوں سے اور دوسری طرف اپنے سیاسی مخالفوں سے بہت کچھ سننا اور سہنا پڑا۔

میں شبہ نہیں ہے کہ یہی وہ بزرگ ایسے ہو سکتے تھے۔ جن سے مولانا آزاد کاملاً متاثر کیا جاتا، اس لئے کہ موجودہ صدی کے نصف اول میں اسلامی ہند کو صحیح معنی میں بنیاد پر تعمیریں ایسی میسر آجیں جو دل و دماغ کی صلاحیتوں سے پوری طرح مستفید تھیں اور جنہوں نے بعد میں آنے والوں کے لئے اپنے طرز عمل اور کردار سے چال و دلا اور صاف رہائیں قائم کیں۔

ڈاکٹر اقبال علی انسان بالکل نہیں تھے بلکہ ایک فلسفی اور مفکر تھے اور اس لئے اُن کا مولانا آزاد سے فکر و نظر کی دنیا ہی میں کیا جاسکتا ہے۔ ان دونوں کے درمیان جوہر سب سے زیادہ مشترک ہے وہ ریزہ خودی اور عرفانِ حیات کا فلسفہ ہے لیکن اس باب میں بھی مولانا آزاد کو ڈاکٹر اقبال پر فوقیت حاصل ہے۔ اس کی تشریح قاضی عبدالغفار اس طرح کرتے ہیں :-

اقبال ریزہ خودی کا فلسفہ صرف مسلمان کے لئے پیش کرتے ہیں، اُسی کو اپنا مخاطب بتاتے ہیں اور اُسی کو زندگی کا پیام دیتے ہیں مگر مولانا کا فلسفہ حیات اقبال کے تصورات سے زیادہ وسیع اور زیادہ ہمگیر ہے۔ وہ اقبال سے

نہادہ مذہبی ہونے کے باوجود خود شناسی کے فطری تقاضوں کو انسانیت میں
 ہر جگہ دل کے ساتھ منسوب کرتے ہیں۔۔۔۔۔ اقبال حرف مسلمانوں کے لئے
 وقتِ حمل کا ایک منہ بخیر یہ کہتے ہیں اور مولانا تمام فطرت کی اس قوتِ فکرا
 ذکر کرتے ہیں جو اس میں ولایت ہے۔۔۔۔۔ اقبال اپنے بلند ترین افکار میں
 انسانیت کے تعلق سے اس قدر وابستہ نظر نہیں آتے جتنے کہ حرفِ اسلام اور
 مذہب کے تعلق سے۔۔۔۔۔ اور اسی لئے اقبال کا پیام فرقہ پرستوں کے لئے
 فرقہ پرستی کا ایک نکتہ انگیز کھلونا بن گیا ورنہ خود شناسی اور خودی کا وہ فطری
 عمل جس کو مولانا نے ایک پڑیلے کے بچے کے پردوں میں کار فرما دیکھا، انسان
 کے پیکر میں اور بھی زیادہ نسل اور فرقہ اور مذہب کی تنگ نظری سے آزاد
 سوا آئندہ کی انفرادیت کو نمایاں کرنے کے لئے قاضی جید انفرادیت
 ان کی زندگی کے مختلف گوشوں کو بے نقاب کیا ہے اور اپنی اس کوشش
 میں انھوں نے زیادہ مدد مولانا کی تحریروں خصوصاً "قبارِ خاطر" سے

لی ہے۔ لیکن انھیں مولانا سے یہ شکوہ ہے کہ انھوں نے اپنی اس تڑپ
 شر کی تمام لطافتیں اس طرح سمودی ہیں اور شاعرانہ اشارات و کنایات
 سے اس قدر کام لیا ہے کہ تنقید اور تبصرے کی راہ دشوار گزار ہو گئی ہے
 اور مخاطب شگ رہا ہو سکتے ہیں۔ اولیٰ کی شعریت نے ایک چادر بن کر
 ان کے حقیقی تاثرات کے چہرے کو اس طرح ڈھانپ لیا ہے کہ بعض مقامات
 پر تو یہ بھٹکا شکل ہو جاتا ہے کہ کس نقطہ پر شاعری ختم ہوئی اور حقیقت شروع
 ہوئی! پھر اسی قسم کا شکوہ ہمیں قاضی جید انفرادیت سے بھی ہے۔ جو کہ مولانا کی
 شعریت سے باقی رہ گئی تھی اسے قاضی صاحب کی شعریت نے پورا کر دیا اور تنقید
 اور تبصرے کی راہ اور بھی دشوار گزار ہو گئی۔ بہر حال کہا جاسکتا ہے کہ آئندہ بالکل کام
 آئندہ مجموعی طور پر ایک عظیم اور مشکل شخصیت کو سمجھنے اور اس کی نفسیاتی کا مطالعہ کرنے کی
 خاصی کامیاب کوشش ہے، اگرچہ یہ اور زیادہ کامیاب ہو سکتی تھی اگر حقیقت کے ساتھ تنقید
 سے بھی کام لیا جاتا اور مشکل شخصیت کا تاثر پہلے ہی ذہن میں قائم نہ کر لیا جاتا۔

حیاتِ امید و موتِ غم

"یاد میں سے بڑھ کر کوئی شے انسانیت کے لئے قاتل و مرہک نہیں اور دنیا کی تمام کامیابیاں حرفِ امید کے قیام پر موقوف ہیں۔ یہ امید ہی ہے جس نے
 زمین پر قبضہ کیا ہے، پہاڑوں کے اعلیٰ سے راہیں پیدا کی ہیں، سمندر کی قبائلی کو منسوب کیلیٹ اور جب چاہے اس میں اپنی سواری کے رُج چلائے ہیں اور جب
 چاہے اس کے کناروں کو میلوں اور فرسوں تک خشک کر دیا ہے۔ پھر امید ہی ہے جس نے وہ قلوب کو زندہ کیا ہے، بسترِ مرگ سے بچا دیوں کو اٹھایا ہے، ڈوبے ہوئے
 کو کناروں تک پہنچایا ہے، بچوں کو بچاؤ کی تیاری سے مدد دیا ہے اور بزرگوں کو بچاؤ سے زیادہ قوی و طاقتور بنا دیا ہے۔
 جبکہ قوتیں چھاپ دے دیتی ہیں، جبکہ زمانہ پھیر لیتا ہے، جبکہ زمین کے کسی گوشے سے صدمے بہت نہیں آتی اور جبکہ تمام اعضائے عمل جواب دے دیتے
 ہیں تو امید ہی کا فرشتہ ہوتا ہے جو مسکراتا ہے، اپنے پیروں کو کھولتا ہے اور اس کے سایہ میں سے کثرت و طاقت، ہمت و مستی جیتی و چلائی کی ایک
 مددگار تازہ دلوں میں پیدا کر دیتا ہے۔"

دنیا میں کامیابی اعمال کا نتیجہ ہے اور اعمال کے لئے پہلی چیز امید ہے۔ جب تک انسان کے اندر امید قائم ہے، مصیبتوں اور ہاتھوں کے اگر غم
 بھی نہ آئے، آکرے ہوں تو بھی اس کو شکست نہیں دے سکتے۔

اگر غم اور اس کا دوران انسان کی جہانی حیات کے لئے ضروری ہے تو یقین کیجئے کہ اخلاقی و ادبی حیات کے لئے امید اس کے اندر بمنزلہ روح کے ہے
 جب تک اس کا دھماکا دل سے اٹھ کر دنیا بھر میں صاف صاف صاف سے نکل کر جسم کے تمام گوشوں میں جڑ جڑ کر رہتا ہے اس کی قوتِ عمل زندہ اس کے
 اعضائے کار متحرک اور پائے مستحضر و مؤثر نکال پڑیں۔ لیکن یہاں یہ رُجِ حیاتِ دل سے نکل کر جسمِ انسانی کے لئے قہر کے سوا کچھ نہیں۔

(الہلال ۹- اپریل ۱۹۵۸ء)

زینا

جیسی آگھیں، دروازہ کھیں، چٹ بھینس، پیچھے ہٹے سونے کا سارنگ، ہجیری
چہرہ، یا قوتی، سادوں کی گھٹاؤں کے مانند کائے لائے ہال، بڑا سا قد، مائل یہ گلا
وہ کورہ جسم، سفید کالی کٹی کسوتی یا ایک ساری بے پروائی سے پیٹے مشترقی
جیسا آئینہ اداہل کا قافرا اپنے جوبیں نے میں نے اسی دنیا کی تھوکر دیکھا ہے۔ یہ
پاکیزہ ہستی حضرت یوسف والی زینا نہیں، یہ سبب ہندی "موتی مولانا" ابوالکلام آزاد
کی رفیقہ و حیات زینا بیگم تھیں۔

میری عمر سات یا آٹھ سال کی تھی وہی میں ایک زمانہ کا نفرنس منعقد نہی
اس کی صدارت بیگم صاحبہ مولانا سلطان جہاں بیگم نے کی۔ ان کے ہوا مولانا آزاد
کی دورہ نہیں، اگر وہ بیگم صاحبہ اور فاطمہ بیگم صاحبہ بھی تشریف لائیں۔ ان دونوں کے
علم و فضل اور ادبیات و خطبوں کی دھاک پڑھی تھی، خواتین پر بیٹھی ہوتی تھی۔ چونکہ
والدہ صاحبہ اس کا نفرنس کی استقبالیہ کمیٹی کی ایک رکن تھیں اسی لئے ان کی
میزبانی کا شرف ہمارے گھر کو ملا۔ اس طرح دوستی کی بنیاد پڑی۔ پھر یہ مراسم
وہ بدلی بڑھتے گئے۔ ۱۹۳۷ء میں آج جان کی وفات کے بعد تین سال بعد ر
کلکتہ رہنا ہوا، تو تعلقات بالکل عزیزہ اندہ ہو گئے۔ یہ دونو اپنے کرم عیانی سے
لے جھوپا آگ آئیں تو ہمارے یہاں بھی آئیں۔ پھر اپنی چھٹی بھانج بیگم زینا نے
میں والدہ صاحبہ کو ملایا۔ مولانا آزاد اس زمانے میں بالی گج کی ایک مشافہ
دو منزلہ کوٹھی میں رہتے تھے۔ والدہ مرحومہ پرانے زمانے کی بہت رکھ رکھاؤ
والی بیوی تھیں۔ مگر اس وقت بیگم آزاد کی پاکیزہ صورت، دل نشین اداس نے
ان کو کھینچا، اُدھر وہ بھی شرمیلی اور کم آمیز ہونے کے باوجود کچھ ایسی گھسٹ بل
گئیں کہ بلا ناظر ایک ہفتہ یہ وہاں جاتیں دوسرے ہفتہ وہ یہاں آئیں۔ انہیں

وہ تمام خوبیاں تھیں جو ایک اچھی خاتون میں ہونی ضروری ہیں۔
وہ سیدہ شہار بھی تھیں اور خانہ داری کے امور سے بھی بخوبی واقف۔
ہماں نواز بھی تھیں اور ہنس مکھ شیریں زبان بھی۔ شہساز والوں پر بھی جان چڑھ
تھیں اور شہر پر بھی فدا تھیں۔ چونکہ آپس میں کافی بے تکلفی تھی اس لئے شہباز
کے رشتے کو سہ کر دونوں میں ملاقات بھی ہوتا تھا۔

ایک مرتبہ صبح دس بجے کے بعد یہ ان کے یہاں پہنچیں تو خلافِ عادت
وہ وہ پندرہ منٹ بعد مسکراتی ہوئی آئیں اور صاف کرتے ہوئے کہا: "معا
کچھ بھائی! آپ کو اتنی دیر میرا انتظار کرنا پڑا۔ میں مولانا کو کھانا کھلا رہی تھی۔
بہت تھوڑا اور سادہ کھانا کھاتے ہیں۔ دو چمچے آبلے ہوئے چاول، تھوڑ
والا، سبزی یا گوشت اور دہی۔ چونکہ صبح بہت سویرے اٹھ جاتے ہیں اس
دوپہر کے کھانے کے بعد بارہ بجے سے بھی پیچھے بیٹ جاتے ہیں۔ پھر دو بجے خد
کر کے منہ زپڑتے ہیں اس کے بعد کاموں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔
لے خالوں کا تانتا رات گئے تک لگا رہتا ہے۔"

بیگم آزاد کے بکھرے بالوں کی طرف اشارہ کر کے بولیں مگر "بھانج
ہوتا ہے ہمارے بھائی کو آپ کی یہ زلف پریشان بہت پسند ہے جو آپ
نہیں گوندھتیں۔"

وہ جس آغاز سے جا کر بولیں "اے نہیں نہیں یہ بات نہیں۔ ان
بار بار جمل جانے سے میری حسیت کچھ ایسی خفگانی ہو گئی ہے کہ چوٹی گونہ
سے دل گھبراتا ہے۔" وہ آغازِ حجاب آج بھی مجھے یاد ہے۔ کیسی باحیا، سو
تھیں اور کیا زمانہ تھا کہ شوہر کا ذکر کرتے ہی شرماتی تھیں۔ یہ اس دن ان

تھکتے ہوئے کی نشان دہی کرتی تھیں۔ پھر ان کی خالی کلاہوں کی طرف اشارہ کر کے کہا: "اسے نوچ! ایسی بھی کیسا سادگی! وہم نہیں آتا۔ اللہ تعالیٰ ہمارے قائم رکھے ایک چوڑی ہاتھوں میں ڈال لیا کرو۔"

انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا: "خیر میں تمہارا آپ بھی نندا بالکل سراسر ہاؤس کی طرح طے دے رہی ہیں۔ اچھا آئندہ میں آپ کی خوشی کا خیال رکھوں گی" مدرسہ ہفتہ جو وہ طے کر رہی تھیں تو پشت پر چوٹی لہجہ سادہ سی تھی۔ لیکن کافریتوں پر لگا بلادر پیچھے تھیں اور بالکل دھاتی ریشمی ساری زیب تن تھی۔ ہاتھوں میں سسے کی دو دو چوڑیاں تھیں۔ کانوں میں بنسے اچھے لباس اور ہلکی سسے آٹامش لے ان کی موہنی صورت کو اور بھی دل دبا کر دیا تھا۔ یہ ان کو گھٹے لگا کر مدرسہ پہنچے میں بویں۔ اسے ہے کہیں بری منظر نہ لگ جائے۔ آج تو ماشا اللہ چغچغ بدو بدو بہت اچھی لگ رہی ہو۔ وہ حسب عادت لپکا کر بویں۔ آپ کو خوش کرنا تھا۔ درنہ بچے تو اب رنگین کپڑے اور نرم پینچے شرم آتی ہے۔ اسے ہے وہ ادھر سو جگہ دی تھیں۔ ابھی تمہاری فکر کون سی ایسی ہے سہ ماہیگر تو بڑا حال ہے میں بھی رنگا پڑا پہنتی ہیں، انہوں نے کہا۔

مجھے ہر بار کتابوں کا لالچ جاسے پر مجبور کرتا۔ مولانا صاحب کی لائبریری اور پڑھنے میں ہی تھی۔ میں جانتے ہی لائبریری میں گھس جاتی امدکنا میں وہاں سے لاتی پھر ان کو پڑھ کر رکھ دیتی اور لے آتی۔ میرے ذوق کی تسکین کا سا لاف فرائی سے ملتا۔ کوئی ٹوک ٹوک نہ تھی۔ اسی لائبریری میں ہی پہلی مرتبہ میں نے مولانا کی زیارت کی۔

امامی عجمی کی ایک شام تھی۔ وہ دو ٹولیمینیاں ماتل میں تھیں۔ میں حسب معمول لائبریری میں پہنچ گئی۔ ایک مشرق وسطیہ لنگ کا تیکے خط ڈال داتا انسان سفید کرتے پھیلائے ہیں نشے سرکنا ہوں کے اور گرد و حیرنگا نے مطالعہ میں ایسا مصروف تھا کہ میں قریب پہنچ گئی اس کو جہز نہیں ہوئی۔ وہ اسی طرح سر جھکا کے پڑھتا رہا۔ میں اگلے قدموں واپس ہوئی تو وہ محبت سے بچے میں بویں۔ کیوں کتابیں نہیں ہیں؟ میں نے کہا غالباً آج لائبریری میں مولانا صاحب تشریف لکھتے ہیں اسی لئے واپس آگئی۔"

اُسے ہاں دہی جاتے آج کل ان کو ذرا فرصت ہے۔ اگر شام کو طے داون سے بچ کر لائبریری میں بیٹھ کر پڑھتے ہیں۔ لیکن تمہارے تو اموں ہیں۔ آؤ میرے ساتھ چلو میں ان سے تم کو طواہوں۔ انہوں نے ایک خاص

اعزاز سے کہا اور میرا ہاتھ پکڑ کر لے گئیں۔ میں ڈرتی جھکتی مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ انہوں نے میرا قاتر کر لیا۔ مولانا صاحب نے مسکراتے ہوئے ہر بات کے پہلے میں فرمایا۔ "آؤ یعنی جو کتاب چاہو لے لو۔" اور میں بہت ہی کچھ دیر اس فطیمہ الہی کو دیکھتی رہی جو نیائے علم و ادب، خطابت، تربیت سیاست کا خورشید تاباں تھا۔ مولانا علیہ الرحمۃ کی خلعت کا نقش میرے دل کے سادہ ورق پر ایسی دی جلیا۔ پھر عمر کے ساتھ میری عقیدت میں اضافہ ہوتا گیا۔

ایک دن صبح جو ہم بچے تو بیگم آزاد کی نگہیں آنکھوں میں شمع ڈھکے دیکھ کر والد نے ان سے مسکرا کر کہا: "کیا رنجو کیا ہے بھادو؟ انکھیں کلابی بھرمی ہیں؟"

وہ جس کر بویں: "آپ کی تو عادت ہے ہی بنانے کی۔ آج کل مولانا قرا لیا کی تہ نہ لکھ رہے ہیں۔ رات کو دو بجے کے بعد اٹھ بیٹھتے ہیں۔ جتنی دیر وہ لکھتے ہیں میں ٹکھا جھپٹی ہوں۔ موسمیٹ گرم ہے۔ باہر بھی جس ہی رہتے ہے۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ جاگیں، محنت کریں اور میں آرام سے سوئی رہوں؟" یہی تھا اس نیک بی بی کا وہ جذبہ رفاقت جس کو یاد کر کے مرنے والی علم میں مولانا پر احمد نگر قلم میں ایک پرائی قبر کو دیکھ کر رقت طاری ہو جاتی تھی۔ بڑے آدمیوں کے سورج حیات جب کچھ جلتے ہیں تو ان کے ان کی خانی زندگی کو منظر انداز کر دیا جاتا ہے حالانکہ بہت ضروری ہے کہ ہم اپنے مشاہیر کے متعلق یہ جانیں کہ ان لوگوں کے گمربو حالات کیا تھے اور اپنی بیوی سے ان کا برتاؤ کیسا تھا۔

مولانا آزاد کی شادی زلیخا بیگم سے ہوئی تو وہ بارہ سال کے مسموم ڈیکے تھے اور زلیخا بیگم چھ سال کی تھی مئی بچی تھیں۔ ان کے والد آفتاب الدین صاحب بنواد کے ایک مشہور خاندان کے چشم و چراغ تھے ان کا سلسلہ نسب حضرت صدیق اکبر سے جا کر ملتا تھا۔ آفتاب الدین صاحب مولانا کے والد بزرگوار کے خاص مریدوں میں سے تھے۔ زلیخا بیگم ان کی پانچویں صاحبزادی دی تھیں۔ ان کے پیدا ہوتے ہی انہوں نے پریر کے قدموں میں لاکڑ ڈال دیا۔ انہوں نے بہت محبت سے اس حسین پیاری بچی کو گود میں لیا اور زلیخا نام رکھا۔ بعد میں بہت ہی صورت والی بچی ان کو اتنی اچھی لگی کہ اس کو انہوں نے اپنی بہو بنالیا۔ چھ سال کی بالی عمر میں زلیخا بیگم ہسپتال میں آئیں۔ ان کے ننھے سے دل پر اسی وقت سے

ہی اپنے سب سے بڑے شہر کا قبضہ ہو گیا اور شاہی کی منزل میں قدم رکھتے ہی وہ اس عظیم انسان کی پرستش کرنے لگیں۔ مولانا کے ہر خیال کا معنوی سرنگھوں پر رکھا۔ ہجرت کی سختیاں بھی سہیں اور مالی مشکلات بھی برداشت کیں مگر آپ پر کبھی اُفت نہ لایا۔ مولانا صاحب کی مالی حالت سیاسی جدوجہد میں معتدلیہ کی وجہ سے کبھی بھی اچھی نہیں رہی۔ اگر ان کو اتنی مہلت ملتی کہ وہ ہر ادبی کام کرتے تو یقیناً دولت کی دیوی ان کے قدموں کو چومتی مگر ان کو ایک کام سے ملنے کا نہ بیٹھے دیتا تھا۔ انھیں پس ماندہ قوم اور غلام ملک کا فہم چینی نہ لیجے دیتا تھا۔ ان کی شعلہ نفسی اور تشنہ بیانی قلم و زبان سے دونوں کو گرماتی رہتی۔ اور ان کی ذہنی حیات نہ اچھا کھاتی نہ اچھا پہنتی۔ ان تمام تکالیف کو محبت اور یگانہ سے برداشت کرتی جو شوہر کی جسمانی اور مالی پریشانی کی وجہ سے اس پر گذرتی۔ زینما بیگم کا زیادہ وقت یاد دہانی اور مولانا کی کامیابی کی دعاؤں میں گذرتا۔ ہر وقت کہتے رہتے تھے کہ باعظ ان کی محنت گرمی ملتی مگر یہی سستی اپنی دھن میں لگی رہی۔ اپنی خرابی محنت کا ذکر کبھی مولانا سے نہیں کیا۔ جن وقت بھی اور جتنے دن بد بھی وہ گھبراتے یہ پاک طینت بیوی مسکراتی ہوتی ہر تنہا شوق بنی ان کا استقبال کرتی اور ہر طرح شوہر کو آرام پہنچانے کی کوشش کرتی تاکہ تنہا دماغ جس کو سیاسی تحفظیں بھی سلجھاتی تھیں اور مذہبی و ادبی کام بھی کرنے لگے گھر پر آرام وہ فضا میں آرام پا کر اور نہ راہ ہمت و جوش سے کام کر سکے اور مولانا صاحب اسی پیکر صبر و شاکہ کی بدولت ہر مرتبہ نیا دور اور جوش کے کرب و آلام سے بچتا رہا۔

وہ فطری طور پر آزاد طبیعت اور دانا نہ جذبات کے مالک تھے۔ اس لئے اپنی کم عمری کی شادی سے ایک دوسرے بڑے غم کا غالب کی طرح خوش نہیں تھے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کو اپنی باوقار محبت کے والی بیوی کا خیال نہیں تھا یا ان کی ازدواجی زندگی بھی نہیں گزری۔ زینما بیگم کی وفات کے بعد انھوں نے جو خط صدید یا جنگ کو لکھا ہے اس سے ان کے بے اندازہ غم کا اظہار ہوتا ہے۔

جولائی ۱۹۴۲ء میں مولانا کو اور تمام لیڈروں کے ساتھ احمد نگر قلعہ میں نظر بند کیا گیا۔ زینما بیگم کی طبیعت کافی خراب تھی۔ ان دنوں برٹش گورنمنٹ کا رشتہ سخت ہو رہا تھا اور صورت حالات بہت تشویش ناک ہو رہی تھی۔ کسی کو معلوم نہ تھا کہ ان لوگوں کو کہاں رکھا گیا ہے۔ تمام ہندوستان میں سیاسی مفرینوں

آج کل دہلی (دہلی لکھنؤ ہنر)

کے متعلق متضاد افواہیں مشہور ہوتی تھیں اور یہ عجانت عجانت کی ہولناکیاں ستم رسیدہ فرقت کی ماری بیگم آزاد کے دل پر تیر و نشتر کا کام کرتی تھیں۔ اپنے پیچھے شوہر کے متعلق ہر نئی خبر سے کردہ تڑپ کر رہ جاتیں ان کو بس دن رات مولانا کی سلامتی کی دعائیں مانگتے اور رونے کے سوا کچھ یاد نہ رہتا تھا۔ وہ انھوں نے بالکل چھوڑ دی تھی۔ غلام بھی برائے نام تھی۔ وقت کا تھرا دھڑکنے دو سال سے بیچھا کیٹے ہوئے تھا۔ اب کمزور جسم پر اس نے بالکل تسلط جالیا۔ ڈھکڑکی سی رائے اور ککڑ کے مشہور ڈاکڑوں نے ان کو دیکھا۔ مگر مرض کو افاقہ دے رہا تھا جب کہ وہ اس وقت نہ غلام۔ وہ ہر ایک معاملے سے ہی ہمتی تھیں۔ جس خدا کے لئے مجھے ایک تیرہ مولانا کو دکھا دو۔ ان کی حالت دیکھ کر اور انجمن سے کڑی تنقید میں آنسو پھرے ہڑا کر چار پائی سے اٹھتا تھا۔ آخر بقول مولانا صاحب کے ۱۹- اپریل ۱۹۴۳ء کو دہلی میں کلید پسیا لے کر رہ گیا۔ زینما بیگم اپنے محبوب شوہر کے دیدار کی حسرت لئے اس دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ جس دن جان تو سپرد خاک کر دیا گیا اور روح شاید قید جسم سے آزاد ہو کر بھی اپنے بڑے سب سے گھر چھو رہی ہوگی۔

مولانا صاحب خباہ خاطر میں لوہاں صدید یا جنگ کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں:-

"ملاشتہ چھپیں برس کے اندر کتنے ہی سفر و پیش ہوئے اور کتنی ہی مرتبہ عرفانیاں ہوئیں۔ میں نے اس دورِ جبر و ستم کو کبھی نہیں دیکھا۔ کیا یہ جبر و ستم کی وقت کمزوری تھی جو اس پہ غالب آگئی تھی۔ میں نے اس وقت تو ایسا ہی خیال کیا کیسے سوچتا ہوں تو خیال ہوتا ہے کہ شاید اسے صحتِ حال کا ایک معمول احساس ہونے لگا تھا۔ شاید وہ محسوس کر رہی تھی کہ اس زندگی میں یہ ہماری آخری ملاقات ہے۔ وہ خدا حافظ اس لئے نہیں کہہ رہی تھی کہ میں سفر کر رہا تھا۔ وہ اس لئے کہہ رہی تھی کہ خود سفر کرنے والی تھی۔"

غم گسار شیخ صفت بیوی کے بعد مولانا صاحب کی زندگی کے معمولات میں تو بظاہر فرق نہیں آیا لیکن ان کا دل ہل گیا۔ وجہ سنوئی سراپا دور ہی کر رہ گیا۔ اس کا غم ان کے پیرائے انھوں نے خباہ خاطر کے ایک خط میں اپنے کو شاعر بننے سے تشبیہ دی ہے جس کو موسم بہار کی جانفزا ہوائیں بھی تازگی نہیں بخش سکتیں۔ اپنے غمزدہ دل کو تمام کر بے اختیار فرماتے ہیں:-

۱۰ اگست ۱۹۴۲ء

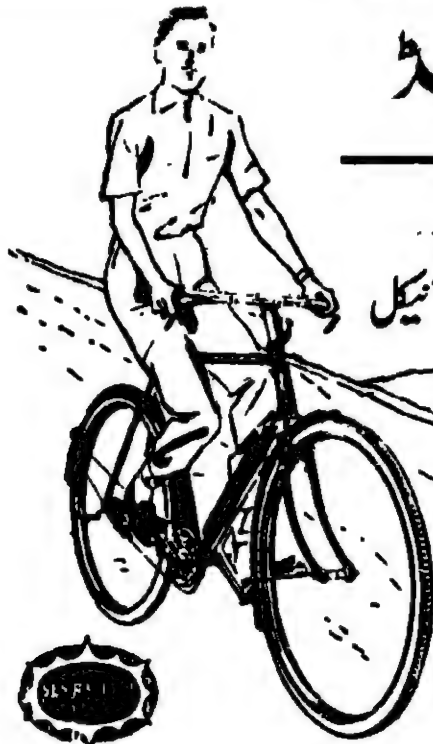
میں بچ بریدہ را منظر سے برہانیت

ان کا دل جزاں اس سے واضح ہو جاتا ہے۔ رہا ہونے کے بعد جب وہ
 اپنی ذہنی آخری آرام گاہ پر گئے تو یاد ہو داس بے انتہا غنیمت و قہر کے ہوائی
 کی طبیعت کی خاص خصوصیت تھی اپنی چاہنے والی کے ہر قدم پر اس کی ہر حرکت
 پنہاں کے بغیر نہ رہ سکے۔ دلوں پر وقت کو قہر مانا ان کے بس میں نہ رہا اور بہت
 دیر تک وہ سر جھکائے روتے رہے۔ مولانا صاحب کی صحت بڑی ہی وفات کے
 بعد دل پر خراب ہوتی گئی اور مزاج کی تشنگی بھی بہت کم ہو گئی۔ وہ ہندو
 جو ان کے مخصوص احباب کی محفلوں کو کشت زعفران بنا دیتی تھیں برائے نام وہ
 نہیں۔ وہ ہر وقت کھوٹے کھوٹے سے رہنے لگے۔ دینا بیگم کی زندگی میں ان کو
 غالباً یہ احساس رہا تھا کہ اس با وفا بیوی سے خود ان کو بھی دلی لگاؤ ہے۔ لیکن
 مرنے والی کے جاننے کے بعد جیسے ان کی زندگی میں کچھ بھی نہیں رہ گیا تھا۔ اپنی
 زندگی کے متبرع عزیز بھی ملک و قوم پر وہ پنہاں کر چکے تھے۔ اس خدا کی بھری
 ہوائی دنیا میں ان کے لئے کاموں اور مرحوم کی یاد کے علاوہ کوئی دل چسپی نہیں
 رہی تھی۔ ان کے دل نے جیسے اور بہت سی لازمشوں سے مولانا آزاد کو قرار دیا تھا
 وہاں ایسی با وفا نیک طبیعت پاکیزہ صورت بڑی ہی دعا فرمائی تھی۔ زینا بیگم

کی ذات پر عالم انہوں جتنا فکر کرے بجا ہے۔ جس نے سمن و جمال کی آفریں میں
 آنکھ کھولی۔ میرا کہنا کمالی نہیں حقیقت ہے۔ میری مرحوم ماں صحت کی صورت تھیں
 اور بھی صحت و میل و خواتین کو دیکھا لیکن جیسی مصروفیت اور تقدس بیگم آزاد کی
 صورت پر میں نے دیکھا ایسا پھر کبھی مجھ میں نظر نہیں آیا۔ وہ اس دنیا سے اب بڑی ہی
 لطف والی ہستی نہیں آسانی مخلوق معلوم ہوتی تھیں۔ ان کی پاکیزگی میں ان کا یہ عالم تھا کہ کبھی
 ٹیلیفون کا رسیور اس لئے نہیں اٹھاتی تھیں کہ نہ جانے دوسری طرف کون اور کیسا آدمی یا
 گھر رہا ہو گا۔ اس دہلے میں ایسی محنت و تاب و خواتین کا خیال بھی نہیں کیا جاسکتا۔
 ۱۹۴۷ء کے بعد میں اکثر مولانا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتی رہتی
 تھی۔ جب بھی میں حاضر ہوتی وہ مجھ پر شفقت فرماتے۔ ایک مرتبہ دوران گفتگو
 میں مرحوم کا ذکر میں نے کیا۔ مولانا صاحب ایک دم اس طرح خاموش ہو گئے
 گویا اس ذکر نے ان کے دل پر نشتر لگا دیا۔ وہ بہت دیر منزلوں خاموش
 بیٹھے رہے۔ میں بھی دم بخود پیشانی سی بیٹھی ان کے اس ہاتھ کا غم کا اندازہ
 کد ہی تھی۔ آخر یہ مفارقت کا طویل زمانہ ۲۲ فروری ۱۹۷۷ء کی
 آدھی رات کو ختم ہو گیا اور مولانا صاحب کی مقدس روح اپنی ذہنی کی تلاش
 میں عالم جاوداں کو سدھار گئی۔

راہنہ

تمام لوگوں کی
 دل پسند سائیکل



اگست ۱۹۷۷ء

نگارشات آزاد میں طنز و مزاح

ابتداءے آفرینش سے اب تک۔ خدایہ کوئی جتنی ایسی گزری جو جس کی زندگی میں وہ لطیف اور پرست مرتحات نہ آئے ہوں جن میں انسان کا جتنے ہنسنے کو دل چاہتا ہے اور وہ دوسروں سے چلبلیں کر کے اپنے لئے کلف و سرت کا سراپہ فراہم کرتا ہے اس میں نفع اور فائدہ، مہذب اور غیر مہذب، سنیہ اور غیر سنیہ کی تخصیص نہیں ہوتی۔

اس سہولت پر زور بازو نیست ۳۱۰ ہفتہ ہفتہ ہفتہ

بہت سے لوگ جو بنا ہے حکم جیہ، مذہبی، غلو و ش اور اپت آپ کو بہت ہی لئے دئے نظر آتے ہیں۔ ان میں بھی بعض بعض اپنی نئی زندگی میں بے حد شرم اور نڈرتی ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی خلوت و جوت میں بڑا فائدہ ہوتا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کا شمار بھی ان میں ہوتا ہے۔ جتنا بظاہر غلاموش اور باطنی ایک باغ و بہار قسم کے انسان تھے۔ چنانچہ جن لوگوں سے مولانا کی بے تکلفی تھی ان کا کہنا ہے کہ وہ اپنی نئی زندگی میں نہ صرف بے حد غلو، ہنس مکھ اور نڈرتی ہی تھے بلکہ ضلع چنگت اور رعایت غلطی یا فترت سے چپت کرنے میں اپنا جواب نہ دیتے تھے۔ ان کی حقیر بازی کا اندازہ ان کی مندرجہ ذیل رائے سے ہوتا ہے جو انہوں نے ایک مرتبہ مولانا غفر علی خاں اور مولانا شوکت علی مرحوم کے بارے میں قائم کی تھی:

"مک میں کسی قریب کو میبڑوں کے بجائے ہفتوں میں چپکنا ہو تو مولانا غفر علی خاں اور شوکت علی کو چھوڑ دو۔ وہ بہ سرعت یہ قلوبنا ڈالیں گے۔ لیکن جب یہ قلوب جاسے تو ان کو فوراً باہر کر دو کہ مگر وہ پھر اسی قلوب کو ڈھالیں گے۔"

اردو زبان اگرچہ دینی کی دوسری مشہور زبانوں کے مقابلے میں ایک نوع

اور نڈرتی زبان کی حیثیت رکھتی ہے اور اس میں طنز و مزاح کا سراپہ بھی دنیا کی دوسری زبانوں کے مقابلے میں کم ہے مگر اس عقیدے کے سراپے میں بھی وہ چمکتا نکا اور وہ پختی ہے کہ پڑھنے والا اس کی عمر میں شک کرنے لگتا ہے۔ اور ایک دوسری خصوصیت اس زبان کے بعض لکھنے والوں کی یہ ہے کہ متانت اور لطافت و دلفن میدانوں میں ایک پیچھے رستم اور مردی بد کا دم بھر رکھتے ہیں۔ چنانچہ مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کا شمار بھی ایسے ہی لوگوں میں تھا جو اگر دنیا کی دوسری زبانوں کے متناظر طنز نگاروں میں گھر لے کر دئے جائیں تو بہتوں کی نگاہیں ان پر جم کر رہ جائیں گی۔ اور ہم ان کے طنز کو پورے ہمتا د کے ساتھ دنیا کی بڑی زبانوں کے انشا پر آزادوں کی نگارشات کے مقابلے میں پیش کر سکتے ہیں اُن کی تحریر میں ایک ایسی انفرادیت پائی جاتی ہے جو اردو کے کسی طنز نگار، راہنما پرورد کے بیان نہیں ملتی اور یہ واقعہ ہے کہ جس طرح وہ اپنی سیاسی اور معاشرتی زندگی میں ایک بڑا گارڈ زندگی بسر کرنے کے عادی تھے اُسی طرح ان کا طرزِ تحریر بھی تسلسل اور یوں اور طنز نگاروں سے الگ تھلک تھا۔ ان کے سوچے کا انداز اُن کی زبان ان کے ہے۔ ان کی عبارت اور الفاظ کی نشست و برخاست سب میں ایک انوکھا پن ہے۔ جب وہ نثر لکھتے تھے تو خرمیں کوئی شرمکھ دیتے ہیں تو پوری عبارت میں ایک ترقم اور موسیقی کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور پوری نثر اس طرح جگمگا اُٹھتی ہے کہ نثر پر نظم کا شبہ ہونے لگتا ہے۔ ان کے انداز بیان میں ایک جرسنگی اور بے ساختہ پن ہے۔ خیال و خاطر میں ایک جگہ جب وہ ہندوستانی اور صینی چائے پر لوگوں کو رد و قدح کرتے دیکھتے ہیں تو اپنے ایک خط میں نہایت شوخی اور بڈل سنجی کے ساتھ لکھتے ہیں:-

"دعا میری جائزہ لے لی اس مرتبہ بیٹا ہوئی کہ انیسویں صدی کے وسط میں جب چائے کی مانگ ہر طرف بڑھ رہی تھی۔ ہندوستان کے بعض انگریز کاشتکاروں کو خیال ہی کہ سیلوں اور ہندوستان کے پٹھانوں اور ملوچ قبائل میں چائے کی کاشت کا تجربہ کریں انہوں نے چائے سے چائے کے پودے منگوائے اور یہاں کاشت شروع کی۔ یہاں کی مٹی نے چائے پیدا کرنے سے انکار کر دیا مگر تقریباً اسی شکل و صورت کی ایک دوسری چیز پیدا کر دی۔ ان نیاں کاموں نے اس کا نام چائے رکھ دیا اور اس غرض سے کہ اصلی چائے سے ممتاز ہے اسے کالی چائے کے نام سے پکارنے لگے۔

لفظی اسے مضامین مست پر چھوڑ گئے نامے کو رسا باندھتے ہیں

دنیا جو اس جستجو میں تھی کہ کسی طرح یہ جنس کا میاب اور ان ہونے کے بعد اس پر پڑا پڑی اور میر تو گویا پوری اربع اہلانی نے اس فریب خوردگی پر اجتماع کر لیا اب آپ سر پیچہ سننا کوئی۔ اسی کی سس کیجئے گئے اہل عشرہ کہیں پرستش داد خراں نہیں

مولانا کی ہندو تہذیب میں مزاج نگاری اور بزرگ سنجی کی مثال ان کے ۱۷ اور ۱۸۔ پارچہ تشدد کے وہ خطوط ہیں جو انہوں نے مولانا حبیب الرحمن شروانی کو لکھے ہیں۔ ان میں چڑیوں کے تدارک کا ذکر کرتے کرتے لکھتے ہیں۔ "چند دن تک تو میں نے میر کیا میکن چہرہ بداشتہ نے صاف چھاپ دیا اور فیصلہ کرنا پڑا کہ اب لڑائی کے بغیر چارہ نہیں منی دگر نہ میدان واقف اسباب

یہاں میر سے سامانی میں ایک چیتری بھی آگئی ہے۔ میں نے اٹھائی اور اعلان جنگ کر دیا لیکن متوڑی ہی دیمکے بعد معلوم ہو گیا کہ اس کو تاہ دستی کے ساتھ ان مرئیانہ سقعت و محراب کا متقابلہ نہیں میرا ہر کہ کبھی چیتری کی نارسائی دیکھتا کبھی حریفوں کی بلند آشیانی ہے اختیار و مانتہ کا شریک آگیا ہے

خیال جہت بلند تو ہی کندہ دل میں تو دست کو ترس میں آستینہ داز

اب کسی دوسرے ہتھیار کی تلاش ہوئی برآمدہ میں جالا صالت کرنے کا بانس پنا تھا دوڑا ہوا گیا اور اسے اٹھالایا۔ اب کچھ نہ پوچھئے کہ میرا بن کا زور میں کس زور کا مل پڑا۔ کمرے میں چاروں طرف حریف طواف کر رہا تھا اور میں بانس اٹھائے دیوانہ وار اس کے پیچھے دوڑ رہا تھا فردوسی اور نظامی کے درجن بے اختیار زبان سے نکل رہے تھے۔

ہر خیز ز میں دہرستان گم ہر نیزہ ہوارانیستان گم

آخر میدان اپنے ہی ماتھے رٹا اور متوڑی ہی دیمکے بعد کمرہ ان مرئیانہ سقعت و محراب سے بالکل صاف تھا۔ ایک تاختمی تا یک تاختم چہ گردن کشاں زمرانہ ختم

یہ واقعہ ہے کہ جس طرح مولانا کا ایک مخصوص انداز بیان ہے اسی طور پر ان کے موضوعات بھی مخصوص ہیں۔ ہر موضوع ان کے انداز تحریر کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ ان کی خطابت ان کی تقریر کا انداز اور اپنے مافی الغیر اور ان کے لے کا لب و لہجہ دوسرے لکھنے والوں سے بالکل ہی مختلف ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ ان کے سوچنے کا انداز بھی صوبے سے جدا گانہ ہے تو غلط نہ ہوگا۔ اور مزاج میں ایک چیز رعایت لفظی ہوتی ہے جس سے بعض مشاق مزاج نگار بڑی اطمینان کر دیتے ہیں اور چہرے والا نہ صرف ایک خاص قسم کی گدگدائی محسوس کرتے بلکہ مسکرا مسکرا کر زبان کے چلنے سے بھی ریتا رہتا ہے۔ مولانا جہاں رعایت لفظی سے مزاج پیدا کرتے ہیں وہاں بھی وہ اس فن کے ماہر نظر آتے ہیں۔ احمد نگر میں ایک مرتبہ باورچی کی وقت پیش آئی۔ تیریلوں میں کوئی باورچی نہ تھا۔ چیتہ خاں (سرپرست خانہ) جیل، یہ نام مولانا کا لکھا ہوا تھا اس سلسلے میں بڑی مستعدی اور سرگرمی دکھاتا۔ چنانچہ ایک باورچی کا ہتھکے کلکڑے انتظام کر دیا۔ دوسرے روز جب وہ اس قلمے میں لایا گیا تو اس کا حلیہ اور اس کی تصویر مولانا کے قلم سے ملاحظہ ہو

"دوسرے دن کیا دیکھتا ہوں کہ واقعی ایک جیتا جاگتا آدمی امداد لایا گیا ہے۔ صدمہ نہیں لطیف (باورچی) موجود یہی ہے۔ آخستہ از پس پردہ تقدیر پدید عمر نہیں معلوم اس طریق پر کیا جیتی تھی کہ تے کو آگیا تھا لیکن کچھ

ایسا گھبرا ہوا اور سرسبز حال تھا جیسے معیشتوں کا پہاڑ سر پر ٹوٹ پٹا ہو۔ وہ کھانا کیا پکاتا اپنے ہوش و حواس کا ساندہ کو نئے لگا۔

ایک مصیبت اس بد نصیب باد پرپی کے ساتھ یہ بھی تھی کہ اسے قلعہ سے باہر جانے کی اجازت نہ تھی۔ چنانچہ حکومت کے لئے بڑی پریشانی تھی کہ اس راہ چلے کو رکھا کہاں جائے۔ اس مقام پر مولانا نے رعایت نفی سے جو مزاح پیدا کیا ہے اس کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو:

"مے کلڑ کے یا راہی در قیقت کی قلعہ سی بجئے یا بے دوقی کو آسے بہلا پھلا کر بہاں کے قلعہ سی خلعے میں بھیج دیا۔ کیونکہ ان کے خیال میں قلعہ کے علاوہ اگر کوئی اور محفوظ جگہ یہاں ہو سکتی تھی تو وہ قلعہ خانے کی کوٹھڑی ہی تھی قید خانے میں جو اسے رات دی قید و جنگ کے سپرہ سٹھ کا گیا تو جو صفحہ تنے کی ساری ترکیبیں مہل گیا۔ اس ہتی کو کیا معلوم تھا کہ ساتھ دپے کے عشق میں یہ پاڑ پھینچے پڑیں گے۔ اس ابتداء عشق ہی نے کو مر نکال دیا تھا۔ تھک تک پیچھے پیچھے قلعہ بھی تیار ہو گیا

کہ عشق آساں نمود اول مے افتاد شکلا "

مولانا کے طنز میں ایک سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں اخلاص، سچائی اور صداقت کی پیمائش کو ذوق ہے۔ ان کا طنز جگہی نہیں بلکہ دواوی اخلاص کا حامل ہوتا ہے۔ مولانا کے حربے کو ہنگامی حالات میں استعمال کیا جاتا ہے۔ مگر مولانا کا طنز اس سے بالکل مختلف ہوتا ہے اور اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ مولانا کے مخصوص موضوعات سیاسی اور سماجی دوقی قسم کی اصلاح کے لئے ہوتے ہیں۔ وہ جو کچھ لکھتے ہیں پہلے اسے خود محسوس کرتے ہیں اور جب پوسے طور پر اس جذبے کی اپنے دل میں پوروش کرتے ہیں تب اس کی اپنے الفاظ اور اپنے قلم کی تکرار سے لائن چھانٹ کرتے ہیں۔ ان کی انشا پر دازی الفاظ کا گھر دنا نہیں ہوتی۔ وہ ایک سیلاب، ایک طوفان بلاغ کا دھارا اور ایک شیشہ ببار ہے جس پر سنجیدگی اور متانت کی لہریں صیقیل بھی ہے۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی نے ان کی مثال ایک پہلو سے دی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"ابو الکلام کی مثال اس پہلو ان کی ہے جو وسطی میدان جنگ

میں میاں و طلب ہو اور دوسروں کا نہیں بلکہ اپنے رجز سے خود اپنا دل بڑھا رہا ہو۔"

آکا کل دلی (ابو الکلام نیر)

جیل میں ڈاکٹر سید محمد کا ایک دل چاہنے والا تھا کہ وہ طشتی میں دانہ سٹے پر غلوں کو آ کر کئے جلتے گرائی آہواں ہوائی میں اتنی سمجھ کہاں جو وہ ڈاکٹر صاحب کی طرف توجہ بھی کرتے۔ سید محمد اپنی اس ناکامی پر اظہارِ افسوس کرتے ہیں۔ مولانا ان کچھ پوچھتے ہیں۔ اس کے جواب میں ڈاکٹر سید محمد کہتے گئے۔

"سید محمد کہتے گئے۔ عجب معاملہ ہے۔ دانہ دکھا دکھا کر جتنا

پاس جاتا ہوں اتنی ہی تیزی سے بھاگتے لگتی ہیں گویا دانے کی

پیش کش بھی ایک جرم ہوئی

خلایا جذبہ دل کی مگر تاثیر اُلی ٹہے

کہ جتنا کھینچتا ہوں او کھینچا جائے ہے مجھ

میں نے کہا لعل و نیلا کی راہ میں قدم اٹھایا ہے تو عشق و دانہ کے

تفاقی کشوں کے لئے مبر و شکیب پیدا کیجئے۔ نیاز عشق کے دعوے

کے ساتھ نادر خس کی فکر مٹیاں زیب نہیں دیتیں۔"

جب ڈاکٹر سید محمد میناؤں کو دانہ دکھانے پر بھی اپنی طرف توجہ نہ بنیں کر کے تو مولانا لکھتے ہیں:

"فہرستانِ برا کے دروازہ گویا ہر جاہلی کوں نے ہر طرف سے

اجوم مٹو دے کر دیا ہے۔ میں نے کوں کوں کوں دروازہ گویا ہر جاہلی اس نے

کہا کہ کھی، خفیں چمانوں کی طرح کہیں جاتے دیکھا نہیں بہرہ دانہ پر

پیشہ صلا میں لگا نہیں اور چلے۔

فیضانِ آئے صدا کر چلے"

جب ڈاکٹر سید محمد کو رکتہ رفتہ اپنے مقصد میں کامیابی ہونے لگی اور بجائے میناؤں کے دوسرے پرندے اور جانوروں کی طرف متوجہ ہونے لگے تو مولانا اپنے مخصوص اعزاز میں لکھتے ہیں:

"میں نے شملی کنارے میں نیم کا تھا وہ رخصت ہے اس پر گہری

کے جہنم کو دتے ہیں۔ انہوں نے جو دیکھا کہ

صلائے عام ہے یا راہی نگرہ داں کے لئے

آفرینا بیک اور مرمت عالی زیادہ کہتے ہوئے اس دستِ خراج

پہنٹ پڑیں

یہاں صلائے عام است گری گنہگار سے

پھر فرار گزشتہ اٹھائیں انکو دیا جاتی جاتیں اور سر ہلا کر کچھ اشار

اگست ۱۹۵۵ء

بھی کرتے جاتیں۔ مگر محمد صاحب کو داؤ فیضیت دیتے ہوئے بطریق طلب
بھی بھیجی جاتی ہیں کہ

مگر چہ خوبصورت لڑکین تھیں بہترین!

ڈاکٹر تیر محمد کی سخاوت سے متاثر ہو کر جب قلمرو احمد تحریک کوڑوں کی ویرانوں
شروع ہوئی تو ان سے کہا گیا کہ حضرت اگر ممکن ہو تو فیضی عام کا یہ شکر خانہ کچھ دنوں
کے لئے کھلیں کر دیجئے۔ اس پر مولانا اپنے مخصوص انداز میں لکھتے ہیں:-

ابھی سید محمد صاحب اس درخواست پر خود ہی کر رہے تھے کہ
ایک دوسرا قلمرو میں آگیا۔ ایک دن صبح کی دیکھتے ہیں کہ حضرت
کی خدمت پر دو تہذیبیہ تہذیبیہ تشریف لے آئے ہیں۔

پیری سے گھر میں اک ذرا فم قوی کی صورت مستم
اور گھر کے اٹھائے ملائے سفر کے منتظر ہیں۔

اسے خازن پر انداز میں کہے تو ادھر بھی

چہ جب وہ شکر خانہ بند کر دیا گیا تو اس کے بند ہونے پر مولانا لکھتے ہیں:-

”ان کی تشریف آوری ہمارے لئے تو بڑی ہی بابرکت ثابت ہوئی
یہ کوئی اور حرکت کا۔ ہمارے قدم آیا اور محمد صاحب نے ہمیں کھانے
اپنا سفر خرچ لینا شروع کر دیا۔ ایک لحاظ سے معاملہ پر یوں بھی
نظر ڈالی جاسکتی ہے کہ ان کی آمدی میں اس جنگل ضیافت
کی دہائی پر مشیدہ تھی۔ دیکھئے کیا موقع سے مومن خاں کا قیاس
یا دہ گیا

مگر بھی آپ کے آتے ہی ہوا دیر خراب

مقدد کہہ کا نہ کیجئے گا یہ اس میں قدم

اب تک۔ مولانا کے طنز و مزاح کے جو نونے پیش کئے گئے وہ صرف ان کی کتاب
”قبایر خاطر لکھتے تھے جن میں ان کے اُنٹیس ملائیب مولانا حبیب الرحمن شیریانی کے نام
ہیں۔ ان خطوط کے علاوہ بھی ان کے اخبار ”اہلال“ میں حدیث انارشیر کے عنوان سے
ایک سلسلہ مضامین شائع ہوا تھا جس میں ان لوگوں پر طنز سے جو ایک دن قبل
مکمل ہوئے تھے ان کے متعلق حکومت کی شرائط قبول کیے کے بدترین مخالفت تھے
مگر ان کو نشیونگ گہرے کہہ سہا کھانا کھانے کے بعد انہوں نے اپنی رائے بدل دیں۔
مگر اس طرح کا طنز صرف ان کے دو ہی یقین مضامین میں ملتا ہے۔

”مکتے میں جڑاڑی کہ دہرائے کے ہاں ڈنر ہے۔ ہم نے کہا کہ
انا اللہ ما نالہ بل جوں۔ قوی طاقت کے ہزاروں آہنی حیلے ایک ٹکڑے

کچھ گل دہلی (ادوار نظام نبر)

اور ان تقری چھری کانٹوں کی جھٹکا ایک طرف۔ حریت پسندوں پر چھا
لکھتے اس ناوک کا بھی کوئی جواب آپ کے ترکش میں ہے جواب ملا کہ
نہیں شکست کا اعتراف ہے۔

چشم اگر اشیاء و ابرو این و ناز و نشو این

الفرق اسے ہوش و تقویٰ الوداع عقل و دین

لیکن چہرے نے دل کو تسلی دی۔ طبیعت قدیم و جدید کو اتفاق سے کچھ
لکھتے کے بعد قلم کے جیم سے سرخ خالی ہو جاتا ہے جھٹکا کو نہیں بلکہ صبح سے
اور انگریزی کھانا جو سادہ و سبے آمیز ہونے کے قدرتی طور پر دوہم
ہوتا ہے۔ اب یہی صبح کے غذائے نفیس کی تفتیل ہوگی کہ صبح تک مستم
میں فروکش رہے اور آوازیں نکلیں تو صحن کی جگر مستم سے۔ مگر انوس کہ
دوسرے روز ہمارے طبیعت میں ایک انقلاب طبع واقع ہوا۔ بلکہ انوس
کے آئینہ اجلاس میں ہم اس سٹڈ کو پیش کریں گے۔ ہمیں اب نفیس
ہے کہ غذا جتنی نفیس و لطیف ہوتی ہے اتنی زیادہ تفتیل بھی ہوتی ہے
نیز اگر تفریط بھی نہیں ملیں تو ہم ان سے اس بارے میں ڈیٹے کٹ
تیار ہیں کہ شام کی غذا کم از کم دو سو گھنٹے دن کی دیر تک تو ضرور مستم
میں موجود رہتی ہے۔

دل نازمی، دیہہ از صبح، آسیت از صبح، کن راز صبح

لیکن یہ جو کچھ تھا اس پر بعض ایک سرسری نظر ڈال کر نہیں گزرنا چاہیے
آج کل ہماری نظریں دھرماروہ اور دوہ انیال کے جلی طوائف
کی طرف لگی ہوئی ہیں اور یہی نہیں چاہتا کہ اور کسی طرف دیکھیں۔ تاہم
ہم ناظرین سے کہیں گے وہ ان چند ہلکی لہروں سے بھی غماض نہ کریں جو
۷۶۔ دسمبر کو دگوستی کی ساکن خاموشی سطح میں اٹھی تھیں۔ بجٹ نہیں
کونسی وقت ہی گوستی کی لہریں قلم کے طوائفوں کا کام دیں۔ فی الحقیقت
ان جلیوں میں صاحبان عقل و فکر کے لئے بہت سی برتیں تھیں جن کو
ایک ایک کر کے یاد کرنا چاہیے کہ نہ وہ مسلمانان ہند کے اس بغیر افکار
احمال کی پہلی منزل تھیں جو سے اس تیز کا مستقبل و مستقبل اور
جس کی طرف ہم نے پچھلے دنوں صبح امید کے عنوان سے دو افتتاح
مضمون لکھے کہ تو جہ دلائی تھی اور ہم چاہتے ہیں کہ اسے تفصیل سے لکھیں۔

یہ تھا مولانا ابوالکلام آزاد کا طنز و مزاح اور اعجاز بیان جس پر راہ وادب
کا طوطہ پر غرور کر سکتا ہے۔

گفت و شنید

فروغات آزاد

دنیا میں حق و صداقت کی آواز کبھی بھی تاج و تخت اور بادشاہی محل کے اندر سے نہیں اُٹھتی ہے بلکہ ہمیشہ اس کا جھنڈا پیرایہ جنگوں، پیرنس کے جھوٹے دلوں اور پہاڑوں کے اندر رہتا ہے۔ اور یہی اس شاہد محاسب پسند کا عجیب و غریب کرشمہ ہے کہ ہمیشہ شکست کی اور فتاویٰ کی کو ہویا رکھتا ہے۔ اپنا گھر بھی بناتا ہے تو ٹوٹے ہوئے اور زخمی دھل کو اپنی آواز بھی سناتا ہے تو کانٹے پر ہے ہوش خشک حلقوں سے اپنی نگاہوں کا جلوہ بھی دکھاتا ہے تو گردنوں کی خوں چکانی اور تڑپتی ہوئی لاشوں کے اضطراب میں اور پھر اپنے مس و جلال کا جلوہ گاہ بھی بنائے گا تو تاریک غاروں میں شکستہ دیوہوں اور چٹھی ہوئی چٹائیوں کو پھر اگر وہ نہیں ہے تو کون ہے جس کا اقدار مجسمہ فردوس کی سیکنی سے نکلتا ہے اور بادشاہوں کے تخت و تاج کو اٹھ دیتا ہے یا کسی کی تماشا آرائی ہے کہ چند بے وفا فیروں کو کھڑا کر دیتا ہے اور وہ دنیا کی بڑی بڑی قوتوں کے تسلط سے نکال کر لاکھوں دلوں کو اپنے آگے سر بسجود کرا لیتے ہیں۔

قوی حیات کا عمل اس طرح تعمیر نہیں ہو سکتا کہ پہلے دیوہ کی کھڑی ہو جائیں پھر اس کی عمر میں اور اطراف و جوانب میں لیٹا ہو جائیں گے۔ کشاکش حیات و عمارت اور تساقوت اقدام کی کشاکش میں فرصت و بہت کا سکون نیز خوابِ مانت کے عکس نہیں۔ یہاں تو ہر دم اور ہر لمحہ کام کئے جاتے اور ایک ہی وقت میں اس عمارت کے ہر حصے کی خبر لیجئے۔ یہ نہ ہو کہ وہ اندازہ ہی رہا ہے مگر پشت کی لیٹا رکھ دیا اور یہی گریہ ہیں۔ اس عالم میں جو کھو گیا وہ پھر نہیں ملتا اور جو وقت فحلت میں کٹا پھر اس کی تلافی کی بہت نہیں دی جاتی۔

ہاں رو عیش ست و گشت غلام ہا گشت جرم لایں جا عقوبت بہت و استغفار نیست

اس عالم اثر و تاثر میں ہر چیز کی طرح ہر فعل بھی ایک قدرتی طبیعت اور مزاج رکھتا ہے۔ تخریب کے مزاج میں شورش اور ہونٹ کی ہے اور تعمیر و سراسر سکون اور خاموشی ہے۔ تعمیر و معنم ترتیب اور ایجاب ہے۔ تخریب و تفرقہ و بے بسی، اضطراب اور سلب و فنی ہے۔ جی و ظلم کی حالت ہی سکون ہے۔ اور تفرقہ و بے بسی کی حالت ہی شورش و اضطراب کی حالت ہے۔ دیوار جب بنتی ہے تو کوئی ہونٹ کی محسوس نہیں ہوتی لیکن اس کے گرنے میں دھماکا ہوتا ہے۔ اس لئے قدرتی طور پر تخریب کا عمل تعمیر سے زیادہ نمایاں اور پر شور ہے۔ تخریب کی ہیبت فوراً ڈراؤنی ہے لیکن تعمیر کی دلآویزی آہستہ آہستہ نمایاں ہوتی ہے۔ تخریب کا دھماکا دور سے بھی سن لیا جاسکتا ہے لیکن تعمیر کا خاموش مل دیکھنے کے لئے نزدیک آنے کی ضرورت ہے

دھماکا ایک بیخ اٹھاتا ہے اور زمین کے حوالے کر دیتا ہے۔ اب دیکھو کہ اس ایک بیج کے بار بار رہنے کے لئے قدرت الہی نے کس طرح اپنا کاغذ ہستی بنایا کر دیا ہے۔ سورج منظر ہے کہ اپنی گری اس کے لئے وقف کر دے ابا دل تیار ہیں کہ اپنے ذخیروں کا منہ کھول دیں زمین مستعد ہے کہ اپنی آغوش اس کے لئے ہار کرے۔ لیکن اس تمام کارخانہ بخشش سے وہ بھی فائدہ اٹھا سکتا ہے جبکہ خود اس کے اندر کی استعداد صبح و صارع ہو۔ اگر ایسا نہیں ہے تو پھر تمام کارخانہ بخشش و فوٹال اس کے لئے کار ہو گا۔ سورج اپنا دھماکا توڑ دے گا پھر بھی اُسے گرم نہ کر سکے گا۔ بدل اگر اپنا تمام ذخیرہ آپ ختم کر ڈالے تب بھی اُسے زندگی کی رطوبت کا ایک قطرہ نہیں ملے گا۔

دونوں ہیں تو ہمسائے... مگر ایک دوسرے سے پشتوں دُور !

چند دنوں آدھیں میں ہمسائے ہیں، رہ چکے۔ ایک ساہس، ایک سی پورہ، ہمسائے مگر نہ کچھ نیچے، نہ کچھ اونچے، دونوں ہر پہلو سے ایک سے ہیں۔ بائیں اور آدھیں، انفرادیت ہے، اور کئی بار تو ہمسائیوں کے درمیان بہت دور خالیت ہے، پشتوں کا فاصلہ ہوتا ہے۔

ہمسائی ہمسائی کی پریشانی و تڑپ کا سوا اور نہایت دلچسپ مسئلہ ہے۔ ہندوستان لیور میں ہم نے ایک ایسی ہی سیرج کے گھر میں کچھ دن گزارے، گھر چھتے کے پشتوں کا سوا اور نہایت دلچسپ مسئلہ ہے۔ ان کی مائیں، اُن کی سہیلیاں، اُن کی بہنیں، اُن کی سہیلیاں سب سے دلچسپ ہیں۔ ان سے آپ کے مسئلہ کا زیادہ معلومات حاصل ہوتی ہیں، آپ کی ضرورت سے واقفیت پہنچتی ہے، جس کے مطابق آپ کی پسند کے مشروبات پہنچ سکتے ہیں، آپ کے خالق پر پورے اثر میں ہوتا ہے، آپ کا زندگی میں آسائش، بہت پہنچتی ہے۔

سویکڑوں کا تاشیں۔ ہندوستان لیور کا جواب... اعلیٰ شمار۔ انہیں ایک شکر کے حق کی چھانچیں کے بعد ان کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ۔ ان مرحلوں سے گزر کر ہمسائی آپ کی ضرورتوں کی صحیح تصویر حاصل ہوتی ہے۔

انہوں نے ایک سیرج کے ذریعے آپ اپنے مشوروں سے ہماری رہنمائی کرتے دیکھے ہیں۔ کیونکہ یہ معلومات آپ کو

آپ ہی کے لئے تو تیار کر رہے ہیں۔

ہندوستان لیور کا آرڈر۔ گھر گھر کی خدمت



TEL. 10-200 573

Accession number

82465

Date 10.5.81



جب آپ ریل سے سفر کرتے ہیں !

تو کیا آپ زیورات، قیمتی پتھر، محوڑیاں، قیمتی کپڑے، مثال دو شالے، کشتیرے

ساز موسیقی یا دوسری قیمتی چیزیں اپنے ساتھ لے جاتے ہیں !

اگر ایسا ہے تو آپ کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ جب آپ ایسی چیزیں ریلوے کے سپرد کریں اور ان چیزوں

کے کسی ایک ہیک کی قیمت تین سو روپے سے زائد ہو تو آپ کو یہ کرنا چاہیئے۔

۱۔ بکنگ کرتے وقت ان چیزوں کی قیمت لکھ کر دے دیں۔

۲۔ بھارتی کے علاوہ ان چیزوں کی قیمت کا ایک فیصدی حصہ ادا کریں۔

اگر آپ ایسا نہیں کرتے تو ریلوے ان چیزوں کی گمشدگی، لوٹ پھوٹ، خرابی یا نقصان کی ذمہ دار نہ ہوگی۔

مندرجہ بالا چیزیں اور کئی دوسری چیزوں کے نام آپ کو ریلوے ٹکٹ کے ساتھ دیئے جائیں گے۔

Excerpted Articles

اس سلسلے میں ریلوے کے ضابطہ کے مطابق اس کے تحت سے حاصل کیے گئے ہیں۔
تاریخ 10.5.81



نام کتاب	قیمت	ڈاک خرچ
دیس دیس کی لوک کہانیاں	۴۵ نئے پیسے	۲۵ نئے پیسے
بھارت کی لوک کہانیاں	ایک روپیہ	۲۵ نئے پیسے
کیسٹڈر کی اصلاح	۲۰ نئے پیسے	۱۵ نئے پیسے
خوش حالی کے لئے منصوبہ بندی	۴۵ نئے پیسے	۲۰ نئے پیسے
ہمارے نئے سیکے	۲۵ نئے پیسے	۱۵ نئے پیسے
جواہر لال نہرو کی تقریریں	۱۰ نئے پیسے	۸ نئے پیسے
	(نی پائی)	(نی پائی)

نویسٹ پیشگی اور پوسٹل آرڈر کے
دریے بھیجئے آسانی رہتی ہے



ہمیشہ روپیہ یا اس سے زیادہ کی
نقدوں پر ڈاک خرچ نہیں کیا جائیگا



ہندوستان کے کلچر اور تعمیر و ترقی

کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لئے یہ رسالے پڑھئے



انگریزی رسالے

انڈین انٹارکٹک

(پندرہ روزہ رسالہ)

اس میں اہم سرکاری اطلاعات اور ملک بھر میں پلان کے تحت ہونے والے ترقیاتی کاموں کی خبریں پیش کی جاتی ہیں۔ قیمت فی کاپی ۵۰ سente پیسے۔ سالانہ چندہ چھ روپے

مارچ آف انڈیا

"ہندوستان اور اس کی ترقی کا دلچسپ مطالعہ"

دستے تیرہ روپے

فی کاپی ایک روپیہ سالانہ چندہ دس روپے

کشمیر

کشمیر کی زندگی اور اس کے ماحول سے متعلق انگریزی ماہنامہ جو دلکش، ضامین اور خوبصورت تصاویر سے مزین ہوتا ہے۔ فی کاپی ۵۰ سente پیسے۔ سالانہ چندہ پانچ روپے

بھارتی گھڑ

سینٹرل وارنٹڈ پاورڈ کیشن کا سرکاری ترجمان - اس میں ہندوستان کے آبپاشی اور بجلی کے منصوبوں سے متعلق معلومات شائع کی جاتی ہیں۔

فی کاپی ۲۵ سente پیسے - سالانہ چندہ تین روپے

سوشل ویلفیئر

سینٹرل سوشل ویلفیئر بورڈ کا انگریزی ماہنامہ جس میں ملکی سماجی بہبود سے متعلق مختلف مسائل پر تبصرہ کیا جاتا ہے۔

فی کاپی ۳۵ سente پیسے - سالانہ چندہ چار روپے

انگریزی اور ہندی

میں ایک ساتھ شائع ہونے والے رسالے

کروکشیتر

اس میں معزز ماہنامہ کا مقصد کمیونیٹی ڈویلپمنٹ پر وگرام کی اشاعت ہے۔

فی کاپی ۵۰ سente پیسے سالانہ چندہ چار روپے

گرام سیلوک

یہ رسالہ کمیونیٹی پراجیکٹ ایڈمنسٹریشن کے تحت کام کرنے والے گرام سیکورس کی ہندوئی کے لئے شائع ہوتا ہے۔

فی کاپی ۵۰ سente پیسے

- سالانہ چندہ ایک روپیہ ۲۵ سente پیسے

یوجنا

(پندرہ روزہ)

چیف ایڈیٹر - خوشنونت سنگھ

اس میں پنج سالہ پلان کے بارے میں ضروری معلومات ہم پہنچائی جاتی ہیں اور ملک بھر میں جو مختلف قسم کے ترقیاتی کام ہو رہے ہیں ان کا تعقیب جاری رہے

پیش کیا جاتا ہے۔ فی کاپی ۱۰ سente پیسے

سالانہ چندہ دو روپے چار روپے

ہندی رسالے

بھارتیہ سماچار

(پندرہ روزہ رسالہ)

اس میں اہم سرکاری اطلاعات اور ملک میں پلان کے تحت ہونے والے ترقیاتی کاموں کی خبریں پیش کی جاتی ہیں۔

فی کاپی ۲۵ سente پیسے۔ سالانہ چندہ ۵ روپے

آج کل (ہندی)

یہ ایک ثقافتی رسالہ ہے جس میں ملک کی سماجی ثقافتی مسائل اور زیریں کی سماجی مسائل متعلق مضامین لکھائے جاتے ہیں۔

قیمت فی کاپی ۵۰ سente پیسے

سالانہ چندہ چھ روپے

بال بھارتی

ہندی میں بچوں کا باآئینہ رسالہ۔ دلچسپ کہانیاں، بچوں سے متعلق مضامین اور چٹکے اس میں شامل ہوتے ہیں۔

فی کاپی ۳۵ سente پیسے

سالانہ چندہ چار روپے

سماج کلیان

ہندی میں سنٹرل سوشل ویلفیئر بورڈ کا ترجمان

فی کاپی ۳۵ سente پیسے

سالانہ چندہ چار روپے

ان رسالوں میں اشتہار دے کر اپنی تجارت کو فروغ دیجئے

یہ رسالے مشہور کتب فروشوں اور اخباری ایجنسیوں سے مل سکتے ہیں

یا براہ راست اس پتہ پر لکھئے

پبلیکیشنز ڈویژن، اولڈ سیکرٹریٹ، پوسٹ بکس ۲۰۱۱، دہلی

